بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

کشمیر بنے گا پاکستان

کشمیر بنے گا پاکستان

جملہ حقوق بحق سردار عتیق احمد خان محفوظ ہیں

نام کتاب: کشمیر بنے گا پاکستان
زبان: اُردو
مصنف: سردار محمد عبدالقیوم خان
سرورق: ذوالفقار اکبر چوہدری
خصوصی معاونت: میاں کریم اللہ قریشی کرناہی، ذوالفقار اکبر چوہدری
ایڈیشن: پنجم
پبلشر:
چھاپہ خانہ:
سال اشاعت: اکتوبر 2016
تعداد:
قیمت:
ملنے کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 184 سیٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی
رابطہ نمبر: 051-4852241, 0345-5689198

انتساب

ان شہیدوں اور مجاہدوں کے نام :

''جنھوں نے ریاست جموں وکشمیر میں اسلام اور پاکستان کے نام پر جان و مال کا نذرانہ پیش کر کے تاریخ میں ایک منفرد باب کا اضافہ کیا''

ان نوجوانوں کے نام:

''جو تاریخ کے اس نادر و بے مثال ورثہ کے اصل مالک ہیں''

ان سیاسی رہنماؤں اور ان کے ساتھی عقیدت مند مخلص کارکنوں اور رفیقوں کے نام :

''جن کی کاوشوں اور قربانیوں کا تسلسل اس تحریک کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور بھارت جیسے وسیع وعریض علاقے اور باوسائل ملک کے جارحانہ عزائم کا راستہ روکے ہوئے ہے''

تاریخی فیصلہ

مسٹر کے۔ایچ خورشید کی حکومت میں جناب سردار محمد عبدالقیوم خان کے خلاف قائم کردہ ایبڈ و ٹربیونل کے چیئرمین سید عبداللطیف شاہ نے سردار صاحب پر حکومت آزاد کشمیر کی جانب سے عائد کردہ الزامات کی سماعت کرتے ہوئے سردار صاحب کے حق میں تاریخی فیصلہ دیا۔ جس کا متن اگرچہ بہت طویل ہے لیکن اس میں مندرج تین اشعار اس فیصلے کا خلاصہ اور روح ہیں جو قارئین کی نذر کیے جاتے ہیں۔ (مرتب)

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کوہستانی

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کنداین عاشقان پاک طینت را

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

ترتیب

☆	تعارف مصنف	۱۹
	حصہ اول	
1-	بنیادی باتیں	۲۷
2-	سیاسی تقاضے، سیاست دان اور سرکاری ملازمین	۳۲
	موجودہ صورت حال	۳۳
	ابتدائی رسہ کشی	۳۵
	سرکاری ملازمین اور سیاست	۳۶
	ملازمانہ طرزِ فکر	۳۷
	منافقانہ طرزِ عمل	۳۹
	مشکلات کا علاج	۴۰
3-	''کشمیر'' ...... پاکستانیوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ	۴۲
	وقت کی نزاکت	۴۲
	بنیادی حقائق	۴۲
	ہمارا موقف	۴۴
4-	آزاد کشمیر کی سیاسی صورت حال	۴۷
	جغرافیائی اہمیت	۴۸
	سیاستدانوں کا منفی طرزِ عمل	۴۹
	آزاد کشمیر کی موجودہ حیثیت	۵۱
	جفائے وفا نما	۵۴
	زود پشیمانی	۵۶
	حکومت آزاد کشمیر کا کردار	۵۷

نظریاتی کشمکش ۵۸
محاذ رائے شماری نقطہ نظر ۵۹
خودمختاری کی اصلیت ۶۲
لبریشن فرنٹ ۶۵
ملک دشمنی کے حربے ۶۶
نوکر شاہی کا منفی کردار ۶۷
مسلمانان مقبوضہ کشمیر کا مؤقف ۶۹
لبریشن فرنٹ کا طرز عمل ۷۰
گنگا جہاز کے اغواء کی سازش ۷۱
مقبول بٹ۔ مقدمہ، پھانسی اور اس کا ردِعمل ۷۳
پس پردہ بغض ۷۵
پرتشدد مظاہرے اور اخلاق سوز حرکات ۷۷
طوفان بدتمیزی اور حکومت کا تساہل ۷۸
قوت برداشت اور مزاحمت ۸۲
خودمختاری کے دلکش نعرے اور خوش فہمی ۸۳
نظریہ الحاق پاکستان اور ''بے بس اکثریت'' ۸۴
ہمارا فرض ۸۵
صدر آزاد کشمیر پر مسلم کانفرنس کی حمایت کا الزام اور اس کے اسباب ۸۷
سیاسی چور دروازے ۸۹
فی سبیل اللہ فساد ۹۱
مسلم کانفرنس کی استقامت ۹۲
غیر جانبداری کا مضحکہ خیز تصور ۹۳
مجرمانہ غفلت ۹۴
بلاتنخواہ فوج ۹۵
5- آزاد کشمیر میں سیاسی گروہ بندی اور چھ جماعتی اتحاد ۹۶

چھ جماعتی اتحاد	۹۸
لبریشن لیگ	۱۰۰
خودمختاری اور دشمن نوازی	۱۰۰
منفی نعرے	۱۰۲
تحریک عمل پارٹی اور اس کا نصب العین	۱۰۵
کمیونسٹ اور دہریہ لابی	۱۱۰
اصل خطرات سے چشم پوشی	۱۱۰
احسان فراموشی	۱۱۱
اجارہ داری کے طعنے اور انتقام	۱۱۲
کارناموں کے چرچے	۱۱۴
آزاد جمہوری پارٹی	۱۱۶
جماعت اسلامی	۱۱۷
مسلم کانفرنس کی مخالفت	۱۱۷
مخالفت کا ردعمل	۱۱۸
مشترکہ مقصد کا تقاضہ	۱۱۸
مخالفت کا ذمہ دار کون	۱۲۱
جماعت اسلامی کا طرز عمل	۱۲۱
طلباء کی اصلاح بندی اور اس کے نتائج	۱۲۳
آزاد کشمیر میں جمعیت کا کردار	۱۲۳
مخالف نظریات کا متحدہ محاذ	۱۲۴
مخالف نظریات کے پنپنے کے اسباب	۱۲۶
''کشمیر بنے گا دارالسلام'' کا نعرہ	۱۲۶
اکابرین جماعت سے ایک گزارش	۱۲۸
مقبوضہ کشمیر کی صورت حال	۱۲۹
آزاد کشمیر میں جماعت کا کردار	۱۳۰

محاذ رائے شماری	۱۳۱
تنظیم اور اس کے ارکان	۱۳۱
مقبوضہ کشمیر میں تنظیم کا جواز	۱۳۲
آزاد کشمیر میں قیام محاذ کے نتائج	۱۳۲
محاذ کی قادیانی قیادت	۱۳۴
محاذ کی موجودہ صورت حال	۱۳۵
نئی پود پر محاذ کا اثر	۱۳۶
ایم۔ایس۔ایف کا کردار	۱۳۶
تعلیمی اداروں میں اساتذہ کا کردار	۱۳۸
آزاد مسلم کانفرنس (تعارف)	۱۴۰
جماعت کا دائرہ کار	۱۴۱
بیرون ملک دورے، مصلحتیں اور نقصانات	۱۴۱
سکھ تحریک کے ساتھ تعاون	۱۴۳
بھارت کی متعصب پالیسی اور اس کے نتائج	۱۴۴
جنرل چشتی کی اعزازی رکنیت	۱۴۴
پاکستان پیپلز پارٹی (تعارف اور حیثیت)	۱۴۶
جنرل ٹکا خان ...."ماہر امور کشمیر"	۱۴۷
پارٹی کا منشور	۱۴۹
پارٹی کے کارنامے	۱۵۰
مسلم کانفرنس (تعارف اور تاریخ)	۱۵۲
مذہبی جماعتیں (تعارف)	۱۵۳
علماء اور انتخابی مجبوریاں	۱۵۴
مسلم کانفرنس کے ہاں علماء کا مقام	۱۵۹
دین و سیاست	۱۶۰
اسوۂ حسنہ	۱۶۱

-6	آزاد کشمیر میں جماعت سازی کی عیاشی	۱۶۳
	جماعت سازی کے اسباب	۱۶۳
	سیاسی خلاء	۱۶۴
	آزاد کشمیر کے عوام کی خصوصی حیثیت	۱۶۵
	حالت جنگ کا تقاضا	۱۶۸
	بے جواز جماعت سازی کے نتائج	۱۶۹
	مسلم کانفرنس کا لائحہ عمل	۱۷۳
	قرارداد الحاق پاکستان	۱۷۳
	کشمیر بنے گا پاکستان ....ایک قومی نعرہ	۱۷۴
	سیاسی شخصیات	۱۷۶
	سردار محمد ابراہیم خان	۱۷۶
	خورشید الحسن خورشید	۱۷۶
	وبال جان ذہانت	۱۷۷
	مسلم کانفرنس سے علیحدگی	۱۷۷
	محسن کشی اور نظریہ پاکستان کی مخالفت	۱۷۸
	سیاسی زندگی کا آغاز	۱۸۰
	ایک اہم ''کارنامہ''	۱۸۱
	بیرون ملک دورے اور ان کا اثر	۱۸۲
	''ڈاکو، لٹیرے اور فراڈ'' کے شرمناک خطابات	۱۸۳
	محمد حیات خان	۱۸۵
	طوفان بدتمیزی	۱۸۵
	تعمیراتی ترقی کا ڈھنڈورا	۱۸۶
	بدترین سیاسی انتقام	۱۸۷
	تعمیراتی منصوبوں کی اصلیت	۱۸۹
	انتظامیہ کی زبوں حالی	۱۹۱

-7	مسلم کانفرنس کا دورِ حکومت	۱۹۲
	اصلاح احوال اور سیاسی رواداری	۱۹۲
	نظریہ الحاق پاکستان کا احیاء	۱۹۳
	بنیادی انسانی حقوق	۱۹۴
	تعمیراتی منصوبہ بندی	۱۹۵
-8	حکومت آزاد کشمیر کی اہمیت	۱۹۶
	قانونی حیثیت	۱۹۶
	صورت حال کی نزاکت	۱۹۷
	مرکزی حکومت پر تنقید اور اس کے اثرات	۱۹۸
	تنقید کا نیا طریق کار	۱۹۹
	لنٹ افسر صاحبان کا طرزِ عمل	۲۰۰
	ایک دلچسپ واقعہ	۲۰۱
	کشمیری حکومت کے اقدامات کا سرحد پار اثر	۲۰۲
-9	مسلم کانفرنس کے کارکنوں سے خطاب	۲۰۴
	پختگی شعور کی ضرورت	۲۰۴
	رکن سازی کی مہم اور اسلامی کردار سازی	۲۰۵
-10	سرکاری ملازمین سے خطاب	۲۰۹
	ملازمین کا کردار	۲۰۹
	سرکاری عہدوں کا غلط استعمال	۲۱۰
	باصلاحیت لیکن بے جرأت ملازمین	۲۱۰
	دل برداشتہ اور مایوس ملازمین	۲۱۱
-11	نوجوان طلباء سے خطاب	۲۱۳
	عدم التفات	۲۱۳
	انگریز کی حکمت عملی	۲۱۳

	منحرف یا محروم التفات طلباء کے دو گروہ	۲۱۴
	پریشان کن صورتِ حال	۲۱۴
	مؤثر علاج	۲۱۵
	تعلیمی اداروں کی موجودہ صورت حال	۲۱۶
	مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا نظریاتی رول	۲۱۸
	قیام پاکستان میں تنظیم کا کردار	۲۱۹
	متاع کارواں اور احساس زیاں	۲۲۰
	دانشوروں کا فرض	۲۲۲
-12	عوام ....''ایک بے بس اکثریت''	۲۲۴
	قومی تقاضے	۲۲۴
	صحیح سمت کا تعین	۲۲۵
	انتخابات ....ایک اہم مرحلہ	۲۲۶
	دشمن ملک کی اچھی مثال	۲۲۷
	مشرقی پاکستان کے انتخابات	۲۲۹
	آزاد کشمیر کے انتخابات	۲۲۹
-13	تعمیر و ترقی کے اصول	۲۳۰
	تعمیراتی صورت حال	۲۳۰
	سیاستدانوں میں جامعیت کا فقدان	۲۳۱
	منصوبہ بندی اور عمل درآمد کی ذمہ داری	۲۳۲
	غیرملکی ماہرین کی ''خدمات''	۲۳۲
	ملکی ماہرین کی کیفیت	۲۳۳
	ملازمین کے ہاتھوں منصوبہ بندی	۲۳۴
	غیرملکی ماہرین کی منصوبہ بندی کی حیثیت	۲۳۵
	صحیح اندازِ فکر	۲۳۶
	ضروریات کا تعین و ترجیحات	۲۳۶

غلامی کی لعنتیں اور قومی ضرورتیں	۲۳۹
قومی یک جہتی	۲۴۰
قومی تقاضے اور منصوبہ بندی	۲۴۱
ماہرین اور قومی نقصان	۲۴۳
سرکاری اہل کاروں کی خیانت	۲۴۴
رہائشی سہولتوں میں ناروا تفاوت	۲۴۵
سرکاری افسروں کا احساس کمتری	۲۴۶
رشوت اور دوسری معاشرتی خرابیاں	۲۴۷
نظام احتساب	۲۴۸
ترجیحی بنیادوں پر منصوبہ بندی	۲۴۹
قومی تشخص	۲۵۰
صدرحکومت تک رسائی	۲۵۱
یکساں سہولتیں	۲۵۲

حصہ دوم

14- آزاد کشمیر میں اسلامی قوانین کا نفاذ	۲۵۵
ایک تاریخی اقدام	۲۵۵
غلط فہمیاں	۲۵۵
قدر شناسی	۲۵۶
اسلامی سیاست،علم اور تجربہ	۲۵۶
ناموافق حالات اور انتخابات	۲۵۸
خورشید صاحب کا تاثر	۲۵۸
خان عبدالحمید خان کا دورِصدرات	۲۶۰
سرکاری ملازمین کا احساس محرومی	۲۶۰
بھٹو کا اقتدار	۲۶۲

	انتخابی منشور	۲۶۲
	اسلامی نظام کا تصور	۲۶۴
	تعلیم یافتہ طبقے کے تاثرات	۲۶۶
	الجھنیں	۲۶۶
	عملی نمونے کا فقدان	۲۶۸
15-	نفاذِ شریعت کے لیے ناگزیر امور	۲۶۹
	حالات کا جائزہ	۲۷۰
	حدود اور تعزیرات کا خوف	۲۷۱
	درسِ قرآن	۲۷۲
	نفاذِ شریعت کے لیے مناسب ماحول	۲۷۴
	عوام کی داد رسی	۲۷۶
	اسلامی مساوات اور اس کا اثر	۲۷۹
	تدوین قوانین اور قاضیوں کا تقرر	۲۸۲
	تعزیراتی قوانین کے نفاذ میں عملی مشکلات	۲۸۲
	قوانین کا تدریجی نفاذ	۲۸۹
	انتظامیہ کی اصلاح	۲۹۰
	تعلیمی اداروں کی اصلاح	۲۹۳
	افغان مجاہدین سے خطاب	۲۹۶
	روح جہاد کی بیداری	۲۹۸
	آئمہ مساجد کی تربیت	۲۹۹
	اقامت نماز	۳۰۳
	نظام عشر وزکوٰۃ	۳۰۵
	نفاذ سے پہلے قوانین کا اثر	۳۰۶
	ایک جدید تعلیم یافتہ مجتہد	۳۰۹
	انکارِ سنت	۳۰۹

اجتہاد کی شرط ۳۱۰
گمراہ کُن تفسیر و تاویل ۳۱۰
فتنہ پرداز حاشیہ نشین ۳۱۲
عشر و زکوٰۃ کے نفاذ کا معاملہ ۳۱۳
سود سے چھٹکارا ۳۱۵
مسودہ قانون اسمبلی میں ۳۱۵
مخلص رفقائے کار ۳۱۶
جیل خانوں کی اصلاح کی کوشش ۳۱۵
سعودی عرب میں تعلیم و تربیت کے لیے وظائف ۳۱۸
سعودی عرب میں نظام قصاص ۳۱۹
عربی زبان کی ترویج ۳۲۰
عرب اساتذہ ۳۲۱
مدارس میں عربی زبان کی تعلیم ۳۲۲
عربی تعلیم کی ضرورت ۳۲۳
16- نفاذِ شریعت کا طریق کار ۳۲۶
صدارت سے علیحدگی کے بعد ۳۲۶
فرقہ بندیوں کا تعصب ۳۲۶
نفاذِ شریعت کے لیے طریق کار ۳۲۷
حکومت ...... ایک آزمائش ۳۲۹
لواحقین اور عزیز و اقارب ۳۳۰
معیار تنقید ۳۳۳
سازگار ماحول کی تیاری ۳۳۳
جنگ اور جہاد میں فرق ۳۳۵
اقتدار اور نفاذ اسلام ۳۳۶
احساس جواب دہی ۳۳۷

تزکیہ نفس، اوراد، وظائف ۳۳۹
خواہش حکومت ۳۴۱
اسلام اور مذہبی فرقہ بندیاں ۳۴۳
دینی مدارس کی کیفیت ۳۴۳
مارشل لاء کی افادیت ۳۴۵
خدشات و خطرات ۳۴۶
اسلام آباد میں اسلامی یونیورسٹی ۳۴۷
قرآنی ترجیحات ۳۴۷
مقصود ملت ۳۴۸

حصہ سوم

17- مسلم کانفرنس کی حکومتی خدمات ۳۵۱
مثبت تحریکیں ۳۵۱
قرارداد الحاق پاکستان ۳۵۱
کشمیر بنے گا پاکستان کا قومی نعرہ ۳۵۳
فتنہ قادیانیت کا سدِ باب ۳۵۸
اسلامی نظام زندگی کی بنیاد ۳۶۱
جہادِ کشمیر ۳۶۳
نظریاتی سرحدوں کا تحفظ ۳۶۵
18- حکومت آزاد کشمیر کی آئینی حیثیت اور مرکزی حکومت کے ساتھ تعلقات کی نوعیت ۳۶۷
موجودہ آئینی حکومت ۳۶۷
پاکستان کی ذمہ داری اور کشمیریوں کی مجبوری ۳۶۸
صوبہ بنانے کا منصوبہ ۳۷۲
باہمی مشورے کی ضرورت ۳۷۳
حکومت سازی اور اس کے تقاضے ۳۷۵

تعارف مصنف

متحمل مزاج، انقلابی شخصیت، زبردست تدبر اور فہم و فراست کے مالک تحریک آزادی کشمیر کے مسلمہ قائد اور آزاد کشمیر کی صدارت پر تیسری مرتبہ فائز ہونے والے میدان سیاست کے کہنہ مشق شہسوار، مجاہد اول سردار محمد عبدالقیوم خان ستمبر 1924ء (بروز جمعرات) کو ضلع پونچھ (باغ) کے گاؤں غازی آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے لے کر عہد جوانی تک جب 23 برس کی عمر میں انہوں نے تحریک آزادی کشمیر کے لیے کی جانے والی مسلح جدوجہد کی قیادت سنبھالی اور سیاست میں جیل سے لیکر قصر صدارت تک ان کی زندگی مسلسل کاوش اور کشمکش کی ایک انوکھی اور بے مثال داستان ہے۔ کسے معلوم تھا کہ غازی آباد کے پسماندہ دیہات میں آنکھ کھولنے والا بچہ ایک قوم کی تقدیر بن کر سامنے آئے گا۔

قدرتی طور پر خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس عظیم المرتبت شخص کی تعلیم و تربیت کہاں ہوئی اور کن کن آزمائشوں اور تجربات نے اسے نئی بھٹی سے نکال کر بام عروج تک پہنچایا؟ یہ سوال بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ دنیا کے اندر کوئی ادارہ کسی ایسی عظیم شخصیت کو پیدا کر سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ادارے نہیں ہیں جو شخصیت کو جنم دیں بلکہ یہ عظیم شخصیات ہی ہوتی ہیں جو ادارے تخلیق کرتی ہیں۔ ہمارے خیال میں خداوند قدوس کائنات کے اندر مخصوص کردار ادا کرنے کیلئے موزوں وقت پر منتخب شخصیات کو پیدا فرماتے ہیں، جنھیں خاص طرح کے حالات اور واقعات پیش آتے ہیں اور یہ لوگ جو فطرت کی ودیعت کردہ غیر معمولی صلاحیتوں سے مالا مال ہوتے ہیں تجربات کی بھٹی سے کندن بن کر نکلتے ہیں۔ بالآخر ان کی زندگی میں ایک دور ایسا آتا ہے کہ یہ وقت اور حالات کے تابع نہیں رہتے بلکہ وقت اور حالات ان کے تابع ہو

جاتے ہیں۔ مجاہد اول بھی ایسی ہی تاریخ ساز شخصیت ہیں جنہیں قدرت نے ایک خاص مقصد کی تکمیل کیلئے دنیا میں بھیجا ہے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات اور واقعات کو اسی تناظر میں دیکھا جائے تو بات واضح ہوتی ہے۔ حصول تعلیم کیلئے انھیں متحدہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں جانے کا اتفاق ہوا، وہ ایک غیر معمولی ذہین وفطین طالب علم تھے۔ گھریلو ماحول بھی انتہائی مذہبی تھا اس لیے آپ کی مذہبی تعلیم و تربیت گھر پر ہی ہوئی۔ اس مذہبی ماحول اور تربیت کا اثر ان کی ساری سیاسی جدوجہد میں بہت نمایاں ہے۔ اسلام کے سیاسی فلسفے کو عملی شکل میں نافذ کرنے اور اسلامی معاشرہ کے قیام کیلئے ان کی کوششوں کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ سردار قیوم خان کی شخصیت کا ایک بڑا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ تصوف کے ساتھ غیر معمولی وابستگی رکھتے ہیں۔ تصوف کے ساتھ ان کا لگاؤ بچپن ہی سے قائم رہا ہے۔ اپنے دور کے جلیل القدر اورعظیم المرتبت اولیاء عظام کی صحبت میسر رہی، ملک بھر کے دینی حلقوں میں انھیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ فوج میں بھرتی ہو گئے، جہاں انھوں نے فوجی تربیت حاصل کی۔ اسی دوران آپ کو فوج کی جانب سے فلسطین میں تعینات کیا گیا۔ یہ خطہ اس وقت بڑی اہم تبدیلیوں کی آماجگاہ تھا، مجاہد اول کا اپنی فطری اور طبعی وابستگی کی وجہ سے ان تبدیلیوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ فوج کے ساتھ ان کا قلبی اور فکری رابطہ ہمیشہ قائم رہا ہے۔ آزاد کشمیر میں فوج اور سول عوام کے تعلقات بہتر بنانے کیلئے انھوں نے منفرد جدوجہد کی اور اس کے نتیجے میں فریقین کے مابین آج باہمی اعتماد اور رابطہ کے لحاظ سے قابل رشک خوشگوار تعلقات ہیں۔ سردار قیوم خان نے حالیہ کچھ برسوں میں سینئر فوجی آفیسر ان کی ٹیموں کو مسئلہ کشمیر پر مسلسل بریفینگ دینے کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے۔ ان کی کاوشوں سے ملک کے اس انتہائی اہم اور حساس ادارے کے لوگوں کو مسئلہ کشمیر کی اہمیت اور نوعیت سمجھنے میں مدد ملی

ہے۔ فوج کے ساتھ ان کا یہ تعلق ان کی ابتدائی فوجی تربیت کا قدرتی نتیجہ تھا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت نے اس کام کیلئے جو انھوں نے بعد میں کیا قدم قدم پر ان کی راہنمائی کی۔

کشمیر کے وہ نہتے اور بے بس لوگ جو صدیوں پر محیط غلامی کی کربناک گھٹن میں ڈوگرہ جبر و استداد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور سسک سسک کر اپنی زندگیاں گزارنے پر مجبور تھے، ان کی آزادی اور عزت و وقار کا علمبردار بن کر مجاہد اول نے 23/اگست 1947ء کو نیلہ بٹ کے مقام سے جہاد آزادی کا آغاز کیا۔ پندرہ ماہ تک لڑی جانے والی وہ طویل اور صبر آزما جنگ جو تاریخ عالم میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے اور جس میں نہتے اور بے بس لوگوں نے دشمن کی ایک جدید تربیت یافتہ مسلح فوج کو شکست دے کر 32 ہزار مربع میل علاقہ آزاد کرایا،اس کے ایک بریگیڈ کی کمان کا شرف اسی جری، بہادر اور اولوالعزم شخص کو حاصل ہے جسے دنیا آج صدر آزاد جموں وکشمیر سردار محمد عبدالقیوم خان کے نام سے جانتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ''محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے'' مگر سردار محمد عبدالقیوم خان نے جنگ آزادی کشمیر کے دوران جن اعلیٰ اسلامی اخلاقی اقدار کو قائم رکھا اور جس طرح اس جنگ کو اسلام کی ابدی اور دائمی سچائی پر مبنی اصولوں کے تابع رکھا اس سے نہ صرف ان کی شخصیت کا مہذب پن، شرافت، شائستگی اور انسان دوستی کا منفرد پہلو نمایاں ہو کر سامنے آیا بلکہ آج کی بے رحم جدید دنیا میں یہ مقولہ بھی انھوں نے اپنے طرزِ عمل سے غلط ثابت کر دکھایا۔ جنگ کے دوران ڈوگرہ افواج کے قیدیوں اور غیر مسلم بوڑھے مردوں، عورتوں، اور بچوں کے ساتھ ان کا حسن سلوک اس کا بین ثبوت ہے۔

تاریخ کی یہ ایک عجیب ستم ظریفی ہوتی ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے کسی تحریک کا

آغاز کیا ہو یا تحریک کے بانی ہوں، اس تحریک کی کامیابی کے بعد وہ پس منظر میں چلے جاتے ہیں، اس طرح کچھ اور لوگ منظر پر آ جاتے ہیں جن کا اس تحریک میں کوئی زیادہ نمایاں کردار نہیں ہوتا۔ سردار محمد عبدالقیوم خان دراصل تاریخ کے اس عام اصول کے استثنا ہیں۔ جدید دور کے اندر وہ ایسے مفکر ہیں جنھیں ان کی اپنی چلائی ہوئی تحریک کے نتیجے میں قائم ہونے والی آزاد مملکت کے اندر اپنے فلسفے اور فکر کے مطابق کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ کشمیر کی آزادی کے سلسلے میں بھی قومی اور بین الاقوامی سطح پر انھوں نے دوررس اقدامات کیے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو خطہ کشمیر کے لوگوں کو یقیناً خوش نصیب سمجھا جائے گا کہ انھیں ایسے شخص کی راہنمائی حاصل ہے جس نے ان کی تحریک حریت کی قیادت کی تھی۔

تحریک آزادی کشمیر کے دوران مسلح جدوجہد کے ذریعہ 32 ہزار مربع میل علاقہ آزاد کرانے میں ان کا عظیم کردار ہے۔ اسی طرح سیاست کے پر پیچ، خاردار اور پر خطر راستے میں بھی انھوں نے اپنے اصولوں اور نظریات پر سمجھوتہ کیے بغیر جس عزم صمیم، استقلال اور بے خوفی سے اپنا سفر جاری رکھا وہ تاریخ کا ایک نادر واقعہ ہے۔ سردار محمد عبدالقیوم خان نے بے پناہ مشکلات کے باوجود ریاست جموں وکشمیر کے لوگوں کا اسلامی تشخص قائم رکھنے بلکہ اس کو نمایاں کرنے کیلئے تاریخ ساز جدوجہد کی ہے۔ برصغیر میں آزاد جموں وکشمیر ہی وہ علاقہ ہے جس میں ان کی قیادت میں اسلامی معاشرہ کے قیام کیلئے پہلی مرتبہ 1975-1970ء کے دوران عملی اقدامات کیے گئے۔ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے سے لیکر حال ہی میں آزاد کشمیر میں شریعت ایکٹ کے نفاذ تک (جس کے ذریعہ شریعت کو ملک کا بالا تر قانون قرار دیا گیا ہے) ان کے ایسے غیر معمولی اقدامات تھے جن سے انھوں نے آزاد کشمیر میں اسلامی تشخص کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کو مضبوط کیا۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ سردار محمد عبدالقیوم نے یہ کارنامہ ان حالات میں انجام دیا جب ایک طرف بھارت کشمیری مسلمانوں کے

اسلامی تشخص کو مٹانے کیلئے زبردست سازشیں اور کوششیں کرتا رہا ہے اور دوسری جانب پاکستان اور آزاد کشمیر کے لا دین (سیکولر) عناصر بھی سردار قیوم کی ان کوششوں کو ناکام بنانے کیلئے ان کے خلاف صف آرا رہے ہیں۔ جب ان کی کوششوں کے نتیجے میں آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تاریخی قرارداد منظور کی تو اس کا بڑا شدید ردعمل ہوا۔ اس وقت کی پی پی پی کی مرکزی حکومت نے ان کی منتخب حکومت کو برطرف کرنے اور ان کو گرفتار کرنے کیلئے فوج کو مظفر آباد میں بھیج دیا تھا۔ تاہم پاکستان اور آزاد کشمیر کے مسلمانوں کی حمایت کی وجہ سے یہ اقدام ناکام ہو گیا۔ بایں ہمہ وہ سازشیں جاری رہیں تاوقتیکہ سردار محمد عبدالقیوم خان کو اسی جرم کی پاداش میں 1975ء میں صدارت سے غیر آئینی اور غیر قانونی طریقے سے ایف۔ایس۔ایف کے ذریعے معزول کر کے پلندری جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔

سردار محمد عبدالقیوم خان کو اس ملک کے اندر ''مرد بحران'' کہا جاتا ہے۔ جب کبھی بھی ملک کے اندر افراتفری، انتشار اور ہنگامہ آرائی کی صورت حال پیدا ہوئی ہے سنجیدہ فکر لوگوں کی نظریں سردار قیوم پر مرکوز ہو گئیں کہ وہ باہر نکل کر متحارب قوتوں میں مصالحت کرائیں گے۔ 1977ء میں حکومت کے خلاف قومی اتحاد کی تحریک جب اپنے نقطہ عروج پر تھی اور ملک کے اندر اور باہر ملک کی سلامتی اور بقاء کے بارے میں چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں، یہ سردار قیوم ہی تھے جنھیں ذوالفقار علی بھٹو نے (پندرہ ماہ قبل قید کیا تھا) ہیلی کاپٹر بھیج کر پلندری جیل سے اسلام آباد بلایا اور ان سے درخواست کی کہ وہ قومی مصلحت کیلئے اپنا کردار ادا کریں۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے اس وقت سردار قیوم سے کہا تھا کہ میرا استعفیٰ آپ کے پاس ہے آپ جب چاہیں پریس کانفرنس کر کے اس کا اعلان کر دیں۔ انھوں نے (سردار قیوم نے) جو کردار اس موقع پر ادا کیا وہ ہماری قومی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

سردار محمد عبدالقیوم خان کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تمام تر مشکلات و مصائب کے باوجود پاکستان کے ساتھ اپنی وابستگی کو کمزور نہیں ہونے دیا۔ یہ ایک ایسا نازک مقام ہے جہاں بہت سارے لوگ پھسل گئے لیکن انھوں نے اس پر بے مثال ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کا ثبوت دیا۔ یہ بھی ایک تاریخی ستم ظریفی ہے کہ ایک ایسا شخص جس کی ساری زندگی دوقومی نظریہ کے مطابق کشمیر کی آزادی اور اس کے پاکستان کے ساتھ الحاق اور اسلام کی بالادستی کیلئے جدوجہد کرتے ہوئے گزری ہے، اسے انہی مقاصد کی خاطر جدوجہد کرنے کی پاداش میں جیل بھیجا گیا۔ کشمیر کی تحریک آزادی کو تیزتر کرنے کیلئے سیز فائر لائن کو دوبار عبور کرنے، آزاد کشمیر میں اسلامی قوانین کے نفاذ اور پاکستان اور آزاد کشمیر میں جمہوریت اور انسانی حقوق کی بحال کی جدوجہد کو ان کا جرم سمجھا گیا اور اس کی پاداش میں ان کو متعدد مرتبہ جیل میں پابند سلاسل رہنا پڑا۔ سردار قیوم کو چار مرتبہ جیل بھیجا گیا اور کم و بیش ان کے ایام اسیری چار سال ہیں۔ دنیا کے اندر کہیں بھی ایسا نہیں ہوتا کہ ملک اور قوم کے وسیع تر مفاد کیلئے کام کرنے والوں کو کمزور کیا جائے یا ان کو پابند سلاسل رکھا جائے۔ یہ بات تاریخ کے اندر صرف ہم ہی کر سکتے ہیں اور یہ الٹی گنگا صرف ہمارے ہاں ہی بہتی ہے۔

سردار محمد عبدالقیوم خان ایک طویل عرصہ تک آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے صدر رہے ہیں جو ریاست جموں وکشمیر کے مسلمانوں کی سواد اعظم ہے۔ انھوں نے ریاست جموں و کشمیر کے اندر 1970ء میں برسر اقتدار آ کر پہلی مرتبہ بنیادی انسانی حقوق اور شہری آزادیاں بحال کیں اور ریاست جموں وکشمیر کی حکومت کا درجہ بڑھانے اور اس کو تحریک آزادی کشمیر سے وابستہ کرنے کیلئے غیر معمولی اقدامات کیے۔

جہاں تک آزاد کشمیر میں تعمیر و ترقی کا تعلق ہے یہ بات سب کو معلوم ہے کہ آزادی کے ابتدائی 23 سالوں کے دوران اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ یہ

شعبہ وزارت امور کشمیر کے پاس تھا جنھیں اس کام سے سرے سے ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سردار محمد عبدالقیوم کا آزاد کشمیر کے لوگوں پر ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ انھوں نے 1970ء میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر پہلی مرتبہ آزاد کشمیر میں تعمیر و ترقی کا محکمہ قائم کیا، اس دوران انھیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے راستے میں جو رکاوٹیں کھڑی کی گئیں ان کی ایک اپنی الگ داستان ہے۔ انھوں نے آزاد کشمیر کے اندر علم و تعلیم کیلئے بھی ٹھوس منصوبہ بندی کی جس کے نتیجے میں آج آزاد کشمیر میں شرح خواندگی 45 فیصد سے بھی اوپر ہے۔ اس کے علاوہ صحت عامہ، مواصلات اور لوگوں کو دیگر بنیادی انسانی ضروریات مہیا کرنے کیلئے انھوں نے قابل قدر کام کیا ہے۔

سردار محمد عبدالقیوم خان نے آزاد کشمیر کے اندر اتحاد و اتفاق، بھائی چارے اور یک جہتی کی فضا پیدا کرنے کیلئے بھی مسلسل کوششیں کیں۔ رواداری، محبت اور شرافت کی اعلیٰ اقدار کو فروغ دینے اور نفرت، انتقام، تشدد، اور کینہ سے پاک معاشرے کے قیام کیلئے ان کی کوششیں قابل قدر ہیں۔ حال ہی میں کشمیر کی آزادی کیلئے کشمیر لبریشن الائنس کا قیام ان کی انہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سردار محمد عبدالقیوم خان بلاشبہ ایک غیر معمولی صلاحیت کے مالک انسان ہیں، وہ ہر لمحہ متحرک اور فعال رہتے ہیں، غیر معمولی قوت ارادی اور صبر و تحمل ان کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ ملک کے اندر اور باہر بے شمار لوگوں اور تنظیموں سے ان کے تعلقات ہیں۔ رابطہ عالم اسلامی کی تنظیم کے مستقل ممبر کی حیثیت سے بھی کشمیر کی آزادی اور قومی وقار کیلئے کام کرتے رہے ہیں۔ سردار محمد عبدالقیوم خان اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ سیاست، تاریخ، مذہب اور انسانی نفسیات کے علوم پر انھیں غیر معمولی دسترس حاصل ہے۔ آپ کی تین کتابیں کشمیر بنے گا پاکستان، مذاکرات سے مارشل لاء تک اور مقدمہ کشمیر شائع ہو چکی ہیں، اس کے علاوہ آپ کی بے شمار تقاریر اور مقالے بھی شائع ہو چکے ہیں جب کہ اور بھی کئی کتابوں

کے مسودے زیرِ ترتیب و طباعت ہیں۔ سردار قیوم وہ پہلے عملی سیاستدان ہیں جنھوں نے اسلامی نظام کے نفاذ کے عملی پہلوؤں کے بارے میں لکھا ہے، وہ قومی اور بین الاقوامی امور پر وقتاً فوقتاً مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ فلسفہ سیاست پر ان کی کتاب مذاکرات سے مارشل لاء تک ایک منفرد دستاویز ہے۔ وہ دور جدید میں بلاشبہ علامہ اقبال مرحوم کے اس شعر کے مصداق ہیں۔

ہوا گو تند و تیز ہے لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جسے حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

(سردار فاروق حسین خان)

حصہ اول

بنیادی باتیں

میں نے آزاد کشمیر کی سیاست کے بارے میں عجلت میں جو کچھ لکھا ہے درحقیقت وہ اس سے بہت کم ہے جتنا پوری بات سمجھنے کے لئے ضروری ہے مگر اس مختصر مضمون سے کچھ بنیادی باتیں تو یقیناً سمجھ میں آجائیں گی اور سوالات جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے ہیں یا اعتراض کے طور پر کئے جاتے ہیں ان کا بھی کافی حد تک جواب مہیا ہو جائے گا۔ وہ چند امور جو آزاد کشمیر کی سیاست کو نسبتاً زیادہ مشکل بنا دیتے ہیں اور اس کی الجھنوں میں روز بروز اضافہ کرتے رہتے ہیں ان میں بعض تو بنیادی ہیں۔ مثلاً......:

۱: آزاد کشمیر کا محل وقوع جس کے ساتھ پاکستان کی سلامتی و بقاء وابستہ ہوگئی ہے۔

۲: آزاد کشمیر پر اپنی آزادی کے باعث کشمیر کے باقی حصے کو آزاد کرانے کی ذمہ داری پھر اس میں وہ اندرونی و بیرونی مشکلات بلکہ خطرات جن کو حل کیے بغیر آزادی کی کوئی تحریک نہیں چلائی جاسکتی، جبکہ دوسری طرف تحریک آزادی کے اپنے تقاضے روز بروز بڑھ رہے ہیں جو کسی وقت بھی بے قابو ہو سکتے ہیں جس کا نتیجہ اپنے گھر کو خراب کرنے اور خود کو دشمن کا ترنوالہ بنانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی خاموش رہیں تب بھی مصیبت اور کچھ کریں تب بھی مصیبت۔

۳: آزاد کشمیر کی آئینی حیثیت جس کا ابھی کوئی تعین نہیں ہوا نہ ابھی ہوسکتا ہے، اور نہ اس کا ہونا مفید ہے اس کے لیئے اس کی خود اپنی کچھ وجوہات و مشکلات ہیں۔

۴: وہ خلاء جو ہماری خاموشی یا مجبوری کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے، بھارت اس سے پورا استفادہ کرنا چاہتا ہے اور کر رہا ہے، اس سے بڑھ کر خود ہمارے اپنے اندر ایک لاینحل انتشاری کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔

۵: ایک بڑی مشکل جو محض اس وجہ سے پیدا ہوتی چلی آئی ہے کہ حکومت پاکستان کی اپنی کشمیر پالیسی بھی ایسی لچک دار رہی ہے کہ اس کے جو معنی بھی کوئی نکالنا چاہے وہ نکل سکتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ پالیسی اپنی پسپائی میں ایسی حدود کو پہنچ جاتی ہے کہ کئی محبّ وطن اور ذمہ دار حضرات ہم سے یہ سوال کرنے لگتے ہیں کہ حکومت پاکستان کہیں خدانخواستہ آزاد کشمیر ہی سے دستبردار تو نہیں ہو رہی؟ اسی طرح کبھی کبھی تو جرأتمندانہ اقدامات بھی کیے جاتے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ شاید اب ہم کوئی پیش رفت کر رہے ہیں۔ گو ہم دو انتہاؤں میں پھنسے ہوئے ہیں، کوئی درمیانی راستہ بھی نظر نہیں آتا۔

اس لیے مختصر تحریر کے ذریعے اس پورے میدان سیاست کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے، البتہ میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس سے کئی گوشے سمجھنے میں مدد ضرور مل سکتی ہے۔ اس تحریر میں کچھ اصولی معاملات کا ذکر ہے اور بعض مقامات پر کچھ جزوی اور تھوڑی دیر باقی رہنے والے قلیل البقاء امور کا بھی ذکر ہے۔ ان جزوی امور کا ذکر ناگزیر تھا کیونکہ ہمارے بعض اہم معاملات پر بھی ان جزوی کارروائیوں کا اثر مرتب ہوتا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ بڑے معاملات کو سمجھنے کے لئے یہ جزوی امور دروازے کا کام دیتے ہیں۔ بعینہ جس طرح کسی بڑی شخصیت کی اصلیت کو سمجھنے کے لیئے اس کے علمی کارناموں کے بجائے اس کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھنا ضروری ہوتی ہیں۔ ایک عام مثال ہے کہ ایک صاحب نے جو کسی جستجو میں تھے سنا کہ فلاں جگہ ایک شخص بڑا دیندار، متقی اور پرہیزگار ہے، اس کو دیکھنے چلے گئے۔ اتفاق سے وہ صاحب مسجد سے نکل رہے تھے' اس شخص کی نظر ان پر پڑ گئی تو وہیں سے واپس ہو گیا۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ اتنے شوق سے آنے کے بعد اتنی بے اعتنائی اور جلدی میں واپسی کی کیا وجہ ہے۔ تو دیکھیئے اس شخص نے کیا جواب دیا اس نے کہا:

> ''اس شخص نے مسجد سے نکلنے اور جوتا پہننے کی سنت اور آداب کا خیال نہیں رکھا۔ جس کو یہ بھی معلوم نہیں ہے، وہ دین میں میری کیا رہنمائی کرے گا؟''۔

مطلب یہ تھا کہ اس شخص نے مسجد سے نکلتے وقت نہ تو بایاں پاؤں پہلے نکالا اور نہ جوتا پہنتے وقت دائیں پاؤں کا خیال رکھا۔ میں نے خود کئی بڑے ''دیندار'' لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ کھاتے وقت دائیں بائیں ہاتھ کا کوئی خیال نہیں رکھتے۔ لیکن دوسروں کو بہر حال اسلام کی دعوت بڑے زور وشور سے دیتے ہیں۔ اس طرح نمازوں میں رکوع وسجود اور دوسرے سنت اور مستحب اعمال کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن تبلیغ بہر حال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان صاحبان کا کوئی اثر نہ ان کی اپنی ذات پر مرتب ہوتا ہے نہ دوسروں پر۔

بات دوسری طرف چلی گئی، کہنا یہ تھا کہ بعض جزوی اور چھوٹی باتوں کا مقصد محض یہ ہے کہ یہی وہ باتیں ہیں جو کھڑکیوں کی مانند ہیں جن سے اندر جھانک کر پورے مکان کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ورنہ جنھیں انسانی کردار کے اس پہلو کا علم نہیں ہے یا اس کی اہمیت سے واقف نہیں ہیں تو وہ کہیں گے کہ سردار عبدالقیوم نے یہ کیا چھوٹی چھوٹی باتیں لکھی ہیں جب کہ کئی دوسرے لوگ فلسفہ اور منطق اور نہ جانے کیا کچھ لکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں بھی اسی قسم کی بات کہی گئی ہے کہ کچھ لوگوں نے کہا کہ پروردگار عالم! اتنا عظیم ہونے کے باوجود مچھر کی مثال کیوں دیتا ہے، وہ تو بہر حال خداوند قدوس ایک بات ہے تاہم وہاں بھی مقصد بات سمجھانا ہی ہے۔ حضرت امام بخاریؒ کا وہ واقعہ کس قدر برمحل ہے جو ان کو ایک حدیث شریف کی تلاش میں پیش آیا تھا۔ وہ شخص جو ایک طرف حدیث کا امین خیال کیا جاتا تھا، دوسری طرف خالی جھولی سے گھوڑے کو بلا رہا تھا۔ اس کا اصل کردار اس ادنیٰ سی بات سے ہی واضح ہوسکتا تھا، حدیث مبارک کے بیان سے نہیں۔

بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ ذکر اذکار بھی کرتے ہیں مگر نماز کو بے دلی سے سر سے اتارتے ہیں، کیونکہ فطرت یہی ہے کہ جزئیات کا اگر خیال نہ رکھا جائے تو اصولی معاملات بھی لامحالہ متاثر ہوتے ہیں۔ لوگ فرائض اور واجبات میں بھی رخصت تلاش کرتے کرتے ترک واجبات تک جا پہنچتے ہیں۔ یہ حالت ہم روز مرہ دیکھتے ہیں کہ جزئیات اور آداب کے

ترک کرنے سے خود اصل بھی متاثر ہوتا ہے اور یہ کہ جس کے دل میں اصل کی اہمیت شروع ہی سے نہیں ہے، وہی آداب اور جزئیات کو بھی ترک کر دینے پر کمر بستہ ہوگا۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ وہ ایک جگہ تو جھوٹ بولتا ہے مگر دوسری طرف نہیں بولتا، کبھی کبھار شاید یہ درست ہو مگر عادتاً یہ ناممکن ہے، پھر اسے ہر جگہ ہی، جھوٹ بولنا ہوگا۔

اس موقع پر مجھے وہ باتیں یاد آئیں جو یہاں (مدینہ منورہ) میں مقیم بعض دوستوں نے بتائیں کہ پاکستان سے آئے ہوئے بعض زعماء نے کچھ عرصہ پہلے اسی مبارک شہر (مدینہ منورہ) میں اپنے لوگوں میں بیٹھ کر یہ باتیں کی تھیں، جو کچھ مجھے سنایا گیا وہ اکثر جھوٹ اور من گھڑت تھا۔ واللہ اعلم! لیکن یہ اس لیے قرین امکان ہے کہ وہ لوگ اس طرح کی باتیں کرنے میں شاید کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ میرے بعض ملنے والوں نے تعجب کیا کہ اس مبارک شہر میں بیٹھ کر کس دیدہ دلیری سے یہ لوگ جھوٹ بول لیتے ہیں۔ میں نے یہی جواب دیا کہ اللہ ہم سب کو ہدایت دے مگر جو لوگ کسی ایک جگہ بھی ایسا کرتے ہوں، ان کے لیے کچھ فرق نہیں کہ وہ شہر اور مکان کون سا ہے، انسان کے اندر جو کچھ ہے اس کا اظہار تو بہر حال نہایت چھوٹے چھوٹے امور سے بھی ہوسکتا ہے۔ بڑے معاملات سے ہی نہیں۔ کسی طالب علم کی قابلیت کا اندازہ بڑے سوالات کے جواب سے کم ہوتا ہے، مگر چھوٹے سوالات سے زیادہ، بڑے سوالات کے جوابات تو امتحان کے خیال سے یاد کیئے ہوتے ہیں مگر چھوٹے سوالات تو طالب علم کے علمی ذوق اور دلچسپی کے لئے ہوتے ہیں۔ اس لیئے ایسے طالب علم امتحانوں میں اکثر فیل ہو جاتے ہیں۔

یہ مضمون یا مقالہ میں نے کسی ایک جگہ تنہائی میں بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ مرتب نہیں کیا بلکہ جولائی 1984ء سے شروع ہونے والے دورے کے دوران لکھا ہے۔ کبھی صبح کی نماز کے بعد، کبھی عشاء کی نماز کے بعد، دن کی محفلوں کے دوران اور کبھی کسی جلسے میں تقریر کے لئے اپنی باری کے انتظار کے وقفہ میں۔ اور یہ دورہ بھی کوئی عام نوعیت کا نہیں تھا۔

پہاڑوں، جنگلوں، وادیوں اور میدانوں سے لیکر سعودی عرب تک پھیلا ہوا تھا۔ پھر یہ اتنی تھکا دینے والی مشق تھی جس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جنھوں نے اس دورہ میں افتاں و خیزاں میرے ساتھ تھوڑی دور چلنے کی کوشش کی۔ قیامت کی گرمی میں، شدت کی سردی میں، بارش و برف میں، جیپوں پر اور میلوں پیدل بھی چلنا پڑا۔ یہ مضمون ایسی حالت میں مرتب ہوا۔ اس لیے اگر اس میں شعر و ادب کی چاشنی تلاش نہ کی جائے، بلکہ محض نفس مضمون پر غور کیا جائے تو میرا یقین ہے کہ وہ لوگ جو صاحب جستجو ہیں اور قبولیت کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کے لئے بقول مولانا رومی علیہ الرحمتہ یہ مضمون آب حیات سے بہتر ہوگا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

سیاسی تقاضے، سیاست دان اور سرکاری ملازمین

سیاست کے بارے میں ہمارے ہاں جس قدر گفتگو ہوتی ہے وہ زیادہ تر فلسفہ اور اصول پر مبنیٰ دکھائی دیتی ہے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے بلکہ اسے حادثہ کہہ سکتے ہیں کہ اصولی سیاست اور عملی سیاست کے تقاضے بسا اوقات بے حد مختلف ہو جاتے ہیں یہ اصول محض سیاست تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ زندگی کے کئی دوسرے معاملات میں بھی کارفرما ہے لیکن سیاست میں تو بہر حال ایک عجیب صورت ہوتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہم اہل پاکستان جن سیاسی تقاضوں سے دوچار اور ان سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اس میں غلامی کے دور کی باقیات کا اضافی امر بھی اپنا اثر دکھا رہا ہے۔

ہماری سیاسی کشمکش یا جدوجہد پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سیاستدان یہ فرض کیئے بیٹھے ہیں کہ ہماری سیاست آزاد ہے اور اس کے تقاضے بھی آزاد قوموں کی سیاست کی طرح ہی ہیں۔ بظاہر تو یہی صورت ہے مگر ہماری سیاست کی بعض بنیادیں ابھی تک غلامی و آزادی کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور ہم اولین تقاضوں سے ہی نجات حاصل نہیں کر پائے ہیں۔ اس کی بھی تفصیلات بہت ہیں اور وہ لوگ جو اس پر غور کریں گے خود بخود سمجھ جائیں گے۔ میں چند امور کی نشاندہی کرنے پر ہی اکتفا کروں گا۔

نفس آزادی کا ایک اولین بنیادی تقاضا تو یہ ہے کہ عوام اپنی آزادی اور مرضی سے حکومت قائم کریں۔ دوسرے تمام تقاضے اس کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ یہ تقاضا تو پوری آزادی کا تین چوتھائی ہے۔ چنانچہ اگر یہی ایک تقاضا ساقط ہو جائے تو آزادی کا حقیقی مفہوم ہی گویا ساقط ہو گیا۔ اس مضمون میں مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ہمارا ابھی پہلا دن ہے۔ ہماری سیاست کا سب سے بڑا فساد یہی ہے کہ ہم ابھی تک یہی نہیں طے کر پائے کہ اس ملک میں جو انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا ہے حکومت سازی کا حق کس کا ہے اور اس کو کس

طریقے سے نافذ العمل کیا جاسکتا ہے۔حکومت سازی کے حق کی جب بات کرتے ہیں تو محض اندرون ملک تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ اب تو یہ کسی سے مخفی نہیں ہے کہ بڑی طاقتیں بھی دوسرے ملکوں کی حکومت سازی میں ''حق'' جتا رہی ہیں بلکہ بالواسطہ اور بلاواسطہ اس ''حق'' کا استعمال بھی کر رہی ہیں، وہ تو چلیے مجبوری عمل ہے مگر کسی بھی ملک کے اندر تو اس کا فیصلہ ہونا ضروری ہے کیونکہ وہ لوگ جو آزادی کے صحیح مفہوم سے نا آشنا رہیں، کبھی بھی ایک آزاد قوم کی شکل اختیار نہیں کرسکیں گے بلکہ خواہ مخواہ وہ عملاً اپنے اس بنیادی حق سے ہی دستبردار ہوتے جائیں گے یہاں تک کہ اس پہلی بلاواسطہ غلامی سے بھی بدتر صورت کا شکار ہو کر رہ جائیں گے۔

موجودہ صورت حال:

ہم اس وقت بالکل ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہیں، ہم جو چاہیں دعوے کریں آزادی، جمہوریت اور اسلام اور نہ جانے کیا کیا، مگر حقیقت امر یہی کچھ ہے کہ ہم ابھی تک اپنے گھر میں یہی طے نہیں کر پائے کہ حکومت سازی کا حق کسے ہے؟ غلامی کی لعنتوں میں سے ایک لعنت یہ بھی ہوتی ہے کہ اقتدار، حکومت مرتبہ اور دولتمند بننے کی خواہش یکا یک ہر دل میں ابھر آتی ہے۔ بد تر یہ کہ وہ کسی بھی نظم و ضبط کی پابند نہیں رہتی بلکہ یہ خواہش ایک ایسی ہوس بن جاتی ہے جو مجرمانہ ذہنیت پیدا کر دیتی ہے۔ یہ تو فرد کا حال ہوتا ہے۔ اس کا صحیح تماشا اگر کسی کو دیکھنا ہو تو ہمارے اس ملک سے بہتر کوئی مثال نہیں ملے گی۔ اسی کا دوسرا پہلو اس سے زیادہ خطرناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے، وہ یہ کہ ایسی ہوس انفرادی حیثیت سے بڑھ کر طبقاتی بن جاتی ہے۔ طبقے بھی پھر دو قسم کے ہو جاتے ہیں جو معروف ہیں یعنی امیر اور غریب۔ سرمایہ داروں کی خواہش ہوتی ہے کہ اقتدار ان میں رہے کیونکہ سرمایہ داری کا تقاضا بھی یہی ہے اور سرمایہ داری کی بقاء کا ذریعہ بھی۔

چنانچہ اس کا منظر بھی ہمارے ہاں آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے، اس کے مقابلے میں

موجودہ دور میں بالخصوص عوام الناس کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنی اکثریت کے باعث اس کے مستحق وہی ہیں کیونکہ حکومت اور اقتدار کے مالک بھی وہی ہیں۔ ہماری سیاست میں اس امر کی بھی بہت واضح مثال موجود ہے اور یہ زہر اندر ہی اندر ہمارے وجود میں پوری طرح کارفرما ہے۔ سرمایہ داروں کے لیئے جب یہ ممکن نہ ہو کہ وہ خود حکومت پر براہ راست فائز رہ سکیں تو پھر وہ ایسی حکومت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتے ہیں جس میں ان کے سرمایہ دارانہ مفادات کا تحفظ ہو رہا ہو۔ ہمارے ملک میں ویسے بھی تقسیم کچھ اس طرح ہے کہ پورا نظام زندگی غیر اسلامی اور غیر مساوی تقسیم میں دبا ہوا ہے جاگیردار، کارخانہ دار، ذیلدار اور نمبردار غرض یہ کہ کئی قسم کی جکڑ بندیوں میں اس ملک کے لوگ گرفتار ہیں اور چلے آرہے ہیں۔ اس خلفشار اور کشمکش کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو مجھے بلوچستان کے دورے کے دوران پیش آیا۔ کوئی ہفتہ بھر دورہ کرنے کے بعد اور ایک ہفتہ کی مدت بلوچستان میں کوئی معنی نہیں رکھتی، علاقہ اس قدر وسیع اور آبادی اس قدر منتشر ہے کہ اس کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے کئی ہفتے چاہئیں۔ میں نے ایک پریس کانفرنس کی جس میں بلوچستان کی آبادی کے مسائل پر گفتگو کی جب میں بات ختم کر چکا تو ایک صحافی نے کہا:

> ''سردار صاحب! ہم آپ کو جگہ دے دیں تو کیا آپ یہاں نہیں رہ جاتے؟'' پوچھا: ''کیوں اس کی کیا ضرورت ہے؟''

تو وہ صاحب کہنے لگے: ''پاکستان بننے کے بعد آپ پہلے آدمی ہیں جس نے اس علاقہ کے عوام کے مسائل کا اس طرح مطالعہ کیا اور ان کا اظہار کیا ہے''۔

مجھے تو ان کی بات سمجھ نہ آئی۔ میں نے کہا: ''کیوں' کیا یہاں سیاسی راہنما نہیں ہیں؟''۔

وہ صاحب کہنے لگے: یہی تو وہ بات ہے جو اکثر لوگ نہیں جانتے، یہاں لیڈر نہیں ہیں سردار ہیں، وہ عوام کے مسائل حل کرنے کے بجائے ان کو مزید الجھائے رکھنا چاہتے ہیں

تاکہ ان کی سرداری میں فرق نہ آئے''۔

یہ صورت حال بلوچستان کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ پورے ملک میں یہی صورت حال ہے اور بالکل یہی وجہ ہے کہ جب بھٹو صاحب نے جو خود بھی ایک بڑے جاگیردار تھے، مگر مزاجاً انھوں نے عوام میں اپنے لیے کشش پیدا کرلی تھی۔ اپنی جماعت بنائی تو عوام الناس نے اس کا بے پناہ ساتھ دیا جس کا اثر اتنا کچھ ہونے کے باوجود اب بھی باقی ہے۔ ہوس اقتدار کی ایک کشمکش تو یہ ہے جو آج ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے کسی ایک ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بعض ممالک میں اس کا اثر کم اور بعض میں زیادہ، جس کی اپنی اپنی مخصوص وجوہات ہیں۔

ابتدائی رسہ کشی:

دوسری کشمکش جو ہمارے ہاں ابھی تک جاری ہے، اقتدار کی وہ رسہ کشی ہے جو عوام اور سرکاری ملازمین کے درمیان ہے۔ غلامی سے نجات پانے کا ایک مطلب یہ سمجھا جارہا ہے اور وہ غلط بھی نہیں کہ حکومت سازی کا حق عوام کو ہوگا۔ یعنی حکمرانی عوام کی ہوگی اور سرکاری ملازمین بھی اسی خواہش میں مبتلا تھے کہ آزادی کے بعد وہ بھی غیر ملکی کنٹرول سے آزاد ہوکر پوری طرح کامل حکمران بنیں گے۔ چنانچہ ہمارے ہاں قائدؒ کی آنکھ بند ہوتے ہی یہ کشمکش بھی کھل کر سامنے آ گئی۔ اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو ہماری پوری قومی زندگی کے سب نشیب وفراز زبردست کشمکش کا شاخسانہ ہیں۔ اس کی مثالیں دے کر بات سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے، اس کے لیئے تو ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی لیکن اچھا ہوتا اگر یہ معاملہ طے ہو جاتا مگر وہ نہ ہوا۔ سیاست دان حکومت کا کام چلانے کو اپنا حق سمجھنے میں تو حق بجانب ہیں لیکن اس کشمکش میں جس کا ذکر کیا گیا وہ بتدریج پسپا ہوتے رہے ہیں اور آج ہم اس نقطہ تصادم پر کھڑے ہیں۔ ملازمین کے طبقہ کی حتی الامکان کوشش یہ رہی ہے کہ سیاستدانوں کیلئے یہ دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا جائے اور سیاستدانوں کی یہ خواہش ہے کہ ملازمین اپنا فرض

منصبی انجام دیتے رہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بالادستی ملازمین کو حاصل ہوتی گئی۔

اقتدار حاصل کرنے کی کشمکش کسی جائز طریقے تک محدود نہیں ہے۔ ہر دور کے ملازمین نے سیاستدانوں کی چند روزہ حکومت کو ناکام بنانے کے لئے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور کوئی حربہ نہیں جو انھوں نے استعمال نہ کیا ہو، سیاست دانوں کو جب موقع ملا انھوں نے بھی ملازمین کو اپنے غیض وغضب کا نشانہ بنایا۔ ملازمین سرکار تو ان حکمرانوں کے غیض وغضب کا نشانہ بھی بنے، جو خود ان ہی کی جنس میں سے تھے اور سیاست کی کرسی پر فائز رہے۔ اس اکھاڑ پچھاڑ کا ایک سبب تو یقیناً اپنے منصب کے تحفظ کا احساس ہے، دوسرا اسی بے مہار ہوس کا نتیجہ ہے کہ آزادی کو اب نصف صدی ہونے کو ہے لیکن ہم اپنے لیے کوئی ایک ضابطہ نہ بنا سکے۔ ہوسکتا ہے کوئی اور بھی ہمارے مرض میں مبتلا ہو مگر یہ خود ایک المیہ ہے کہ ہمارا ملک ابھی تک سرزمین بے آئین ہے، کسی کو کچھ پتہ نہیں کہ کل کیا ہو گا جس بے یقینی اور عدم تحفظ کا اس وقت ہم لوگ شکار ہیں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔

ہمارے ہاں آئین سازی کی مشق بھی درحقیقت اسی کشمکش کا شکار ہو کر رہ گئی ہے، ایک آدھ استثناء کے علاوہ جس قدر کوششیں اس ضمن میں ہوئیں وہ سب کی سب بلاشبہ محدود اغراض کے پیشِ نظر تھیں۔ ایک گروہ نے اپنے اغراض کے لیئے کچھ کاروائی کی تو دوسرے نے اپنے اغراض کے لیئے اس کو پامال کر دیا۔ جس کے نتیجے میں آج ہم محض حیرانی کے بے کنار سمندر میں ہچکولے کھا رہے ہیں۔

سرکاری ملازمین اور سیاست:

اقتدار کی کشمکش اتنی گہری ہوتی گئی ہے کہ کچھ عرصہ سے بعض سیاسی جماعتیں سرکاری ملازمین کو اپنا ہم نوا بنانے پر خاصی توجہ دے رہی ہیں، بعض تو اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ طلباء کو اپنی نگرانی میں تعلیم دلوائیں اور پھر ان کو سرکاری ملازمتیں دلوائیں تاکہ آگے چل کر ان ہی لوگوں کے ذریعے اقتدار حاصل کیا جائے۔ اس طرح گویا ہمارے ملازمین کی وفاداریاں بھی

اب خاصی تقسیم ہو رہی ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ جب یہ راہ کھل جائے تو اس میں خارجی اثرات داخل ہوں۔ وہ بدر جہا زیادہ اس کے اہل ہیں۔

ملازمین کو سیاست سے دور رکھنے کی ایک اچھی کوشش ہم نے آزاد کشمیر میں کی تھی اور اس کے نہایت مفید نتائج بھی برآمد ہوئے تھے، مگر ہمارے بعد سب سے پہلا نیکی کا کام یہی کیا گیا کہ ملازمین سے ان کے اپنے منصبی کام چھڑوا کر سیاست کا آلہ کار بنا دیا گیا۔ اس مشق میں دراصل قصور دونوں طرف کا ہوتا ہے۔ سیاست دان حکومت پر فائز تو ہو جاتے ہیں اور سرکاری ملازمین کو بھی چند ایک کے سوا اسی میں مزہ آتا ہے۔ اپنا کام تو شاید ان کو بھی اب زیادہ نہیں آتا، اس لیے کہ وہ دوسرے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اسی طرح اپنی ملازمتوں کا تحفظ حاصل کرنے کے لیئے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی بجائے سیاسی کاموں کا سہارا لیتے ہیں۔ نتیجتاً انتظامیہ کا کام روز بروز زوال پذیر ہے اور بے چارے عوام الناس جو اس نظام کا پورا بوجھ برداشت کرتے ہیں، وہ اس کی خرابیوں کی سزا بھی بھگت رہے ہیں۔

ملازمانہ طرز فکر:

میرا تجربہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر سیاست دانوں کی اپنی سوچ بھی بالکل ملازمانہ ہے۔ یعنی سیاست میں ان کا طرز عمل ایسا ہی ہے جیسا کہ ہمارے ہاں کسی بڑے سرکاری عہدے پر فائز شخص کا ہوتا ہے۔ عوام کسی متبادل کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ منسلک ہو جاتے ہیں، ورنہ شاید ہی کوئی شخص ایسے صاحبان کا ساتھ دے۔ عوام کی تو بات ہی نہیں میں نے دیکھا ہے کہ بعض جماعتوں میں چھوٹے کارکنوں کی بھی رسائی بڑی سطح تک نہیں ہوتی، وہ گویا جیب میں پڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے اگرچہ وہ ساتھ چلنے پر بوجوہ مجبور ہوتے ہیں مگر بقول ٹیگور کے ''دل کی لاٹھی گھماتے رہتے ہیں''۔

سیاست دانوں اور سرکاری کارندوں کے مابین اقتدار کے لیئے کشمکش کوئی نئی بات نہیں ہے پوری تاریخ اس عمل سے بھری پڑی ہے۔ جہاں کسی سیاست دان نے فکر وعمل کی

برتری کا مظاہرہ کیا، وہیں سرکاری کارندوں نے بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا بلکہ حکومت کی تابعداری اور قانون اور ضابطوں کی پابندی کی، لیکن جہاں کسی حکمران نے کمزوری دکھائی وہیں سرکاری کارندے حکمران بننے کی فکر میں لگ گئے بلکہ بغاوت کرنا بھی کچھ بعید نہیں ہوتا۔ سرکاری کارندے حکمران کی ہر کمزوری کا پورا فائدہ اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ ان کا حق بھی ہے مگر اس میں ایک بنیادی قباحت یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ جب کسی سیاسی حکمران کی موجودگی میں انتظامیہ کے لوگ طاقتور ہو جائیں اور حکومت چلانے لگیں تو پھر اس حکومت کا کام ملکی و مجموعی مفادات کی بنیاد پر طے نہیں پاتا بلکہ شخصی اور انفرادی مفادات کی بنیاد پر ترتیب دیا جانے لگتا ہے۔ بسا اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ برتری محض فکری ہی نہیں بلکہ جسمانی بھی ہوتی ہے کیوں کہ حکمران میں جو بھی کمزوری ہو گی اسی قدر ایک نقص واقع ہو گا۔ جس کا استفادہ پھر وہی لوگ کریں گے۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایک عرصہ کے بعد ماہر ہو جاتے ہیں اور حکمران کے اندر پوشیدہ نقائص بھی دریافت کر لیتے ہیں پھر ان کا استحصال کرتے ہیں، منجملہ دوسری کمزوریوں کے ایک کمزوری یہ ہے کہ اگر کسی حکمران میں وہ موجود ہو تو پھر سرکاری کارندوں کی گویا چاندی ہو جاتی ہے۔ حکمران اگر کسی ذاتی غرض کی تکمیل کے لئے حیلے بہانے بنائے اور اپنے ماتحتوں سے کام لے تو پھر ان ماتحتوں کو بھی گویا اجازت ہو جاتی ہے کہ وہ بھی اس کی پیروی کریں اور اپنے مفادات کے لیئے وہی طریقہ اختیار کریں۔ جلد ہی یہ بیماری دور تک پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی پسند اور ناپسند کی بناء پر سرکاری مشینری کو استعمال کیا جائے تو پھر وہ بھی اپنی پسند کو نافذ کرنا درست جانتے ہیں۔ اگر حکمران کی محض ایک پسند پر عمل کیا گیا ہو تو اس کی بناء پر ملازمین کی سینکڑوں کیا ہزاروں اسی قسم کی خواہشات پر عمل ہونا شروع ہوتا ہے۔ حضرت سعدیؒ نے اس بارے میں جو مثال دی وہ آج بھی کتنی صحیح ہے، کسی بادشاہ نے کوئی پھل کھانا چاہا تو اس کی قیمت ادا کی۔ وزیر یا مشیر نے کہا کہ ”تو بادشاہ ہے، اس کی قیمت ادا کرنے کی کیا

ضرورت ہے''۔تو اس نے جواب دیا: ''آج اگر چہ میں صرف ایک ہی پھل مفت کھالوں لیکن میرے باقی سرکاری کارندے باغ کے باغ اجاڑ دیں گے''۔

شخصی برتری کی ایک مثال ہم امریکہ میں بھی دیکھ سکتے ہیں، امریکی معاشرے میں بظاہر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہر کام کمپیوٹر سے ہو رہا ہے، کسی خاص شخصی صلاحیت کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود امریکہ میں کارٹر کی صدارت اور ریگن کی صدارت کا فرق واضح ہے۔بعض کمزوریاں بہت معمولی سمجھی جاتی ہیں اور حکمرانوں کو یہ خیال نہیں رہتا کہ ان کا اثر کتنا گہرا، دوررس اور دیرپا ہوگا۔حکمران کی کمزوری کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے بندوق کی گولی اور نشانہ کا تعلق، اگر بندوق سے نکلتے وقت گولی ایک بال برابر اِدھر یا اُدھر ہو جائے تو جوں جوں وہ آگے بڑھے گی فاصلہ بڑھتا جائے گا۔ وہ ایک بال برابر فاصلہ آگے بڑھ کر میلوں کا ہو جائے گا۔

منافقانہ طرزِ عمل:

میں نے دیکھا، سنا اور تجربہ کیا ہے کہ بعض لوگ اس بات کو نہایت معمولی سمجھتے ہیں کہ کسی سفارش یا سائل کو خوش کرنے کے لیئے اس کی موجودگی میں متعلقہ حکام کو اس کا کام کرنے کا حکم دیتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں۔مگر اس کے چلے جانے پر اس ملازم کو کہہ دیتے ہیں کہ بھائی جیسے تم مناسب سمجھو کرو۔ میں نے اس شخص کی موجودگی کی وجہ سے تاکید کی تھی۔ ایک تو یہ صریحاً منافقت ہے، پھر اس سے وہ ماتحت ملازم نہ صرف خود منافقت شروع کر دے گا بلکہ اس کے دل میں اس وزیر یا صدر یا وزیرِاعظم کی کیا عزت باقی رہے گی۔ بات اس سے آگے بڑھ جاتی ہے وہ ملازم اپنے کسی ماتحت ملازم کو بھی صاحب کی بات سنائے گا اور بات چلتے چلتے اس سائل یا سفارشی تک جا پہنچے گی۔ بسا اوقات وہ پہنچائی جاتی ہے،تو بتایئے پھر باقی کیا رہ جاتا ہے؟ اس قسم کی باتیں آج کل روز مرہ کا معمول ہوتی جا رہی ہیں اور یہ طرزِ عمل ہمارے اخلاقی پیکر کو اندر سے گھن کی طرح کھا گیا ہے ہم محض اپنے پوست پر گزارہ کر رہے

ہیں۔

مشکلات کا علاج:

اب سوال ہو گا کہ آخر اس کا علاج کیا ہے، حل کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ حل تو ہر چیز کا موجود ہے۔ فرمان نبویﷺ ہے: ''لکل داء دواء'' (یعنی ہر بیماری کا علاج ہے) لیکن اگر مریض خود ہی علاج نہ کرانا چاہے تو اس کا کیا علاج ہے اور اس علاج کی اہمیت کیا ہے۔ مثلاً اگر دو بھائی لڑ رہے ہوں تو اس کا علاج کیوں نہیں، علاج تو موجود ہے، تنازعہ کا سبب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ مگر جب وہ علاج ہی نہ چاہتے ہوں تو کوئی لقمان یا افلاطون بھی کیا کر سکتا ہے۔ ورنہ اس کے کئی حل اور علاج ممکن ہیں۔

ایک حل تو وہ ہے جو ہمارے قبضہ قدرت میں نہیں، وہ یہ کہ خدائے پاک کسی ایسے شخص کو ہمارے اندر پیدا کر دے جو اپنی خاص استعداد، صلاحیت، اخلاق اور کردار کے زور سے ان تمام مسائل کو سٹیم رول کر دے اور یہ خواہش کوئی لایعنی خواب نہیں ہے۔ تاریخ انسانی ایسے کئی واقعات کی گواہ ہے، بلکہ یہ تو انسانی تاریخ کا وہ حصہ ہے جس کو اگر نکال دیا جائے تو باقی کچھ رہتا ہی نہیں۔

ایک دوسرا علاج وہ ہے جو امریکہ، برطانیہ اور کئی دوسرے ممالک کے لوگوں نے کر رکھا ہے۔ سب لوگ ایک طے شدہ امر کے پابند ہیں اور اسی پر سختی سے کار بند ہیں اس کے تقدس کے قائل ہیں۔ اس لیے نہیں کہ اس سے زیادہ بہتر اور مقدس کوئی اور شے نہیں ہے، بلکہ محض اس لیے کہ ان سب لوگوں نے اس کو قبول کر لیا ہے اور اس کو قائم کر لیا ہے اور اس کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک حل یہ ہے کہ سیاست دانوں اور سرکاری کارندوں کے مابین فراخدلی سے طرفین کے استحقاق اور دعوے پر سمجھوتہ ہو جائے اور دونوں کے حقوق متعین ہو

جائیں۔ فلسفہ اور منطق کی اساس پر نہیں بلکہ زندگی کے روزمرہ اور عملی تقاضوں کی بنیاد پر۔

ایک تقاضا یہ ہے کہ ہمارے سرکاری کارندے صرف اپنے منصبی فرائض تک اپنے آپ کو محدود کر لیں اور سیاست میں دخل دینے سے انکار کر دیں۔ بات تو یہ بہت اچھی ہے مگر اس کے بعض دوسرے تقاضے ایسے ہیں کہ مجھے تو یہ ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بات صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ معروف سیاست دانوں میں کوئی فکری ہم آہنگی ہو اور وہ ملکی معاملات میں اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں تاکہ سرکاری ملازمین خود بخود دلی طور پر سیاست دانوں کی بالا دستی تسلیم کر سکیں۔ اسی طرح کئی اور طریقے بھی دریافت کیے جا سکتے ہیں، مگر اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا احساس ہے نہ اس پر غور کرنے کی فرصت اور ضرورت۔ اس وقت تو فتح وشکست کا سارا منظر ہے۔ سب لوگوں میں تو مفاہمت ممکن نہیں رہی، کیونکہ کچھ لوگ کسی ایک دوسری وجہ سے اپنی سیاست کو ملک سے باہر تک لے گئے ہیں۔ وہ اس وقت بھی اور وقت گزارنے کے بعد بھی شاید اپنی پالیسی مرتب کرنے میں بالکل آزادانہ رہیں۔ اس کے باوجود بہت لوگ ہیں جن کی سوچ وفکر کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں، ان کے مابین تو یکجہتی اور مفاہمت ممکن ہونی چاہیے۔ اس مفاہمت کی راہ میں میرے خیال میں محض جھوٹی اناء کا مسئلہ حائل رہا ہے۔ اگر یہ لوگ جیسا کہ ان کا فرض ہے اپنی آن کو ملک وقوم کی آن کے تحت کر دیں تو بے شمار مسائل کا حل نکل آتا ہے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق دے۔ آمین!

”کشمیر“............ پاکستانیوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ!

وقت کی نزاکت اور اس کا تقاضہ:

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جس طرح دوسرے کئی اہم مسائل پر گرد وغبار کی تہہ

جمی ہوئی ہے اور ہر کسی کی خواہش یہ ہے کہ اسی طرح جمی رہے تا کہ زندگی کا ایک اور دن آرام سے گزر جائے، ملت اسلامیہ پاکستان کے لیئے زندگی وموت کا درجہ رکھنے والے ''مسئلہ کشمیر'' کا بھی ہو بہو یہی حال ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ دوسرے مسائل کی بنیادی حقیقت شاید تبدیل نہ ہوتی ہو لیکن اس مسئلہ کی تو بعض اہم حقیقتوں کو بھی اس تعطل کا فائدہ اٹھا کر تبدیل کیا جا رہا ہے اور یہی عین وہ مقصد ہے جس کا ہماری دشمن قوتوں کو انتظار ہے۔ خوانخواستہ اگر ہم نے اب بھی اس کا نوٹس نہ لیا تو مشرقی پاکستان کے المیہ کا ہم پہلے ہی تلخ تجربہ کر چکے ہیں۔ لا سمح اللہ۔

بنیادی حقائق:

وہ بنیادی حقیقتیں کیا ہیں جن کی تبدیلی سے یہ تمام معاملات ہی تہہ و بالا ہو سکتے ہیں اور دشمن کو ہم پر آخری وار کرنے کا جواز مہیا ہو سکتا ہے؟ یہ ہے وہ اہم ترین سوال جو مسئلہ کشمیر کے بارے میں آج بہت واضح ہے اور وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ یہ ملت اس پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرے اور اپنے عمل سے اس کا جواز مہیا کرے۔ وہ حقیقتیں تقریباً دو ہیں:

الف: یہ کہ بھارت چونکہ بڑا ملک ہے اور کشمیر کے ایک بڑے حصہ پر عرصہ دراز سے قابض بھی ہے اور ابھی فوری طور پر یا مستقبل قریب میں اس سے کشمیر کو خالی کرانے کا کوئی یقینی ذریعہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے کیا کشمیر پر بھارت کے قبضہ کو تسلیم کر لیا جائے؟ جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے، جس کی دلیل بھی وہ یہی دیتا ہے۔

ب: یہ کہ ریاست جموں وکشمیر کے لوگوں کو سیکورٹی کونسل کی قرارداد کے مطابق جس میں بھارت اور پاکستان دونوں فریق تھے، یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ فیصلہ کریں کہ آیا ریاست کے لوگ پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں یا بھارت کے ساتھ۔ لیکن بھارت کی حکومت نے سیکورٹی کونسل میں کیئے ہوئے اپنے وعدے سے انحراف کی یہ تاویل کی کہ مقبوضہ کشمیر کی اسمبلی نے چونکہ بھارت کے ساتھ الحاق کر لیا ہے اور وہ علاقہ

اکثریتی آبادی کا ہے اس لیے اس قرارداد ہی کو استصواب رائے کا متبادل سمجھا جائے لیکن ہمارے نزدیک بین الاقومی پوزیشن ابھی تک یہ ہے کہ ریاست کے لوگوں نے اپنا حق خود اختیاری استعمال نہیں کیا۔

تاہم اس بھارت کا واضح مطلب یہ ہے کہ ریاست کے لوگوں کو اب یہ حق حاصل نہیں رہا کہ وہ مزید کوئی فیصلہ کریں۔ اس کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ ریاست کے لوگوں کو اس تاریخی فیصلہ سے محروم کر دیا جائے جو 19 جولائی 1947ء کو سرینگر میں ریاست کے مسلمانوں کی ترجمان جماعت ''آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس'' نے الحاق پاکستان کی صورت میں صادر کیا تھا۔

اس تجزیے سے مقصود یہ ہے کہ ریاست کی آزادی کی تحریک درحقیقت الحاق پاکستان کی اسی قرارداد کا نام ہے اور بھارت بھی صرف اسی سے فرار کی راہ تلاش کرتا رہا ہے۔

نیز یہ قرارداد بھی درحقیقت ایک اور حقیقت کا نتیجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ریاست جموں وکشمیر جغرافیائی، معاشی، دفاعی، تاریخی اور اقتصادی طور پر اسی ملک پاکستان کا طبعی حصہ ہے۔ چنانچہ اگر انگریز ایک سوچی سمجھی سازش کے ذریعے پٹھان کوٹ کا علاقہ بھارت کو نہ دیتا تو کشمیر کا کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ گویا یہ مسئلہ دانستہ طور پر سازش کر کے اسی لیے پیدا کیا گیا تھا کہ پاکستان تمام سرحدات میں مکمل نہ ہو سکے اور بالآخر مجبور ہو کر خود ہی پکے ہوئے پھل کی طرح بھارت کی جھولی میں آ گرے۔

اس کا لب لباب یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر میں دوسری حقیقت جس پر یہ مسئلہ کھڑا ہے وہ ہے الحاق پاکستان۔

اس کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ بھارت جو اپنے تمام وعدوں سے انکار کر کے ابھی تک استصواب رائے سے فرار اختیار کر رہا ہے، تو وہ صرف اسی ایک حقیقت کی وجہ سے ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے لوگوں کی غالب اکثریت پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا

چاہتی ہے اور یہ پوری طویل مدت اور اس میں بھارت کا تمام تر دباؤ ریاست کے لوگوں کی رائے کو تبدیل نہیں کر سکا ہے۔

ہمارا موقف:

چنانچہ ان دونوں حقیقتوں کے بارے میں ہمارا قومی موقف یہ ہونا چاہیے:

۱: کہ ہم بھارت کا قبضہ کسی صورت تسلیم نہ کریں بلکہ اس کے خلاف مسلسل جدوجہد کرتے رہیں۔

۲: تحریک الحاق پاکستان کو مضبوط تر کریں۔

یہ دونوں کام اگر چہ مرکزی حکومت اور آزاد حکومت دونوں کی ذمہ داری میں شامل ہیں لیکن حکومتوں کی کمزوریاں بھی ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یہ امر بھی معلوم ہے کہ ہماری حکومتوں کی غفلتوں کا نتیجہ کیا نکلا ہے، اس لیے اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ تحریک الحاق پاکستان یعنی تحریک تکمیل پاکستان کو عوامی اور قومی سطح پر منظّم کیا جائے۔

یہ امر خاص طور پر ملحوظ رکھنے اور توجہ کے لائق ہے کہ اس طویل کشمکش اور تعطل کے نتیجے میں آزاد کشمیر میں بھی عین وہ فضا پیدا کی جا رہی ہے جو مشرقی پاکستان پر بھارت کے حملے سے پہلے کی گئی تھی، وہ مختصراً یہ ہے کہ آزاد کشمیر میں خاص طور اور مقبوضہ کشمیر میں عام طور پر الحاق پاکستان کے مخالف نظریات کو فروغ دیا جائے۔ اس مقصد کے لیئے آج آزاد کشمیر میں ''کشمیر بنے گا پاکستان'' اور ''کشمیر بنے گا دارالسلام'' کے نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ ان نعروں کی پشت پر کئی قوتیں کام کر رہی ہیں اور وہ لوگ دہشت گردی کے بالکل اسی طریقہ کار پر چل رہے ہیں جو مشرقی پاکستان میں اختیار کیا گیا تھا۔ اس ناپاک مقصد کے لیئے دو خطرناک طریقے اختیار کیے گئے ہیں ایک یہ کہ نوجوانوں میں خاص طور پر طلباء میں مایوسی، بددلی، نفرت اور دشمنی کی فضاء پیدا کی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی جاذب خیال نعرے دیئے گئے ہیں جن کو بڑی

شد و مد کے ساتھ پھیلایا جا رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس تخریب کاری کی حمایت سیاست دان بھی کر رہے ہیں۔ بعض جماعتیں اصلاً ان ہی تخریبی نظریات کی حامل ہیں اور جو باقی ہیں وہ بھی بدقسمتی سے محض غیر نظریاتی اور غیر وابستہ ہیں۔ ان کے لیے جہاں سے فائدہ ہو وہ ٹھیک ہے۔ بلکہ مسلم کانفرنس کی مخالفت کی قدر مشترک کی وجہ سے وہ بھی ان تخریبی نظریات والوں کے ساتھ شریک ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح ان تخریبی نظریات کی حمایت اور اعانت سرکاری سطح پر بھی کسی نہ کسی درجے میں ہوتی رہی ہے، جو مؤثر بھی ہے اور اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس مختصر سے تجزیئے کے نتیجے میں اب یہی ایک واحد راستہ رہ جاتا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں خط متارکہ جنگ کی دونوں طرف اس تحریک کو ایسی تقویت پہنچائی جائے جس سے دوسری تمام مخالف تحریکیں غیر مؤثر ہو جائیں۔ اس مقصد کیلئے پھر صرف ایک طریقہ رہ جاتا ہے کہ سب سے پہلے ملک بھر کی سطح پر اس تحریک کو منظّم کیا جائے۔ اس مشق کا مقصد یہ ہوگا کہ خود پاکستان کے اندر فکری یکجہتی پیدا کی جائے جو بدقسمتی سے اس وقت کمزور ہے، بلکہ منتشر ہے، حتیٰ کہ دکھائی بھی نہیں دیتی۔ پاکستان میں بھی الحاق پاکستان کی مخالف تحریکوں کا اثر ونفوذ ہے، خواہ عوامی سطح پر اس کے محرکات اور اسباب کتنے ہی اخلاص مندی پر مبنی کیوں نہ ہوں۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ آزاد کشمیر میں الحاق پاکستان کی مقدس تحریک کو صرف اسی طریقہ سے تقویت پہنچائی جا سکتی ہے جو اشد ضروری ہے کیونکہ اس وقت سب سے زیادہ دباؤ اسی جگہ ہے اور یہی خطہ اس پوری مشق کا پہلا اور آخری ہدف ہے۔ تیسرا مقصد یہ کہ مقبوضہ کشمیر میں جو لوگ ابھی تک الحاق پاکستان کے ساتھ وابستہ ہیں ان کو مایوسی، وقت کے بے رحم ہاتھوں اور سیاسی سازشوں سے بچانے کا مؤثر ترین طریقہ بھی یہی ہے۔ یہ امر اطمینان بخش ہے اور اللہ تعالیٰ کا بے پناہ کرم ہے کہ مقبوضہ کشمیر کا مسلمان ابھی تک بدستور اپنے عقیدے پر قائم ہے۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے ایسی باقاعدہ اور ملک گیر تنظیم قائم کرنا ضروری ہے جو

اس ذمہ داری کو کماحقہ، پورا کر سکے، اس تنظیم میں ملک کے ہر طبقہ خیال کو شریک کرنا ضروری ہے بلکہ وہ لوگ جو گھر میں دوسرے معاملات پر ایک دوسرے سے کچھ اختلاف بھی رکھتے ہیں، لیکن اس معاملے پر متفق ہوں، ان سب کو شرکت کی دعوت دی جائے۔ ادیب، شاعر، سیاست دان، طالب علم، نوجوان، تاجر، فنی ماہرین، علما اور سماجی کارکن، غرض ہر مکتب فکر کے لوگ مل کر ہی اس ذمہ داری کو کماحقہ پورا کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ''تحریک الحاق پاکستان'' کے نام سے یہ تنظیم قائم کی جا رہی ہے۔

والحمد اللہ رب العالمین۔

آزاد کشمیر کی سیاسی صورت حال

آزاد کشمیر کی سیاسی صورت حال بوجوہ ویسے بھی بے حد پیچیدہ ہے مگر میرے خیال میں اس وقت تو اس قدر الجھی ہوئی ہے کہ جب تک اس پر خصوصی توجہ نہ دی جائے اس کو سمجھنا ناممکن ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ امر ہے کہ جس قدر یہ مسئلہ ہماری ملی زندگی کے لیے اہم اور پیچیدہ ہے، ہمارے ارباب بست وکشاد کے ہاں اسی قدر آسان اور عام نوعیت رکھتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسئلہ کے تقاضوں کا رخ ایک جانب ہے تو ہمارا اس کے برعکس۔ کسی ایک بیان یا

پریس کانفرنس کے ذریعہ اس کا صحیح احاطہ ممکن نہیں، اس لیے اس پر اسی طرح کچھ لکھنے کی نوبت آئی۔

ہم لوگ ویسے بھی پیدائشی مسلمانوں کی طرح بعض امور کو فرض کر لینے پر ہی گزارہ کرتے ہیں اور خرابیوں کا علم اس وقت ہوتا ہے جب وہ لاعلاج ہو چکی ہوتی ہیں۔ ہماری بد نصیبی یہ ہے کہ جن حضرات کی اصلاً اور طبعاً یہ ذمہ داری ہونی چاہیے وہ بھی عوام الناس ہی کی طرح اس سے غافل ہیں بلکہ ان کے عمل نے عوام الناس کو دوسرے فروعی امور میں اتنا زیادہ الجھا دیا ہے کہ ان کی توجہ سرے سے ایسے معاملات کی جانب رہی ہی نہیں۔

اس کیفیت سے جو خلاء پیدا ہوا اس کا ایک فطری ردعمل تو وہی ہے جو اس موذی مرض سرطان کا ہوتا ہے جس کو وقت پر دریافت نہ کیا گیا ہو دوسرا یہ کہ اس ملک اور قوم کے ازلی دشمنوں نے اس خلاء سے بھرپور استفادہ کیا جس کی ایک المناک تاریخی مثال مشرقی پاکستان کی علیحدگی ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ میں نے 1958ء کا مارشل لاء لگنے کے فوراً بعد فیلڈ مارشل ایوب مرحوم کو ایک تفصیلی خط لکھا تھا، جس میں مشرقی پاکستان کے حالات کا تجزیہ کیا گیا تھا اور بتایا تھا کہ ابھی وقت ہے کہ علیحدگی کی تحریک کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بارے میں ٹھیک دس سال بعد یعنی 1968ء کے آخر میں ان کے ایک وزیر نے ان کو پیغام دیا کہ فیلڈ مارشل اس ضمن میں دریافت کر رہے ہیں کہ ''کیا ہو سکتا ہے؟'' مجھے چاروناچار وہ بدنصیب کلمات کہنا پڑے کہ ''بے سود ہے، اب تو محض وقت اور طریقہ کار کی بات رہ گئی ہے''۔

جغرافیائی اہمیت:

آزاد کشمیر کا علاقہ اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں سیاست کا دباؤ اتنا ہے جتنا کسی بڑے ملک میں ہو سکتا ہے۔ اس کا ایک سبب تو مسئلہ کشمیر ہے اور دوسرا آزاد کشمیر کا اپنا محل وقوع۔ پہلے تو آزاد کشمیر کی یہی حیثیت پوری طرح سمجھ میں آنا چاہیے، ورنہ ہم کسی بھی صحیح نتیجہ

پہ نہیں پہنچ سکتے۔ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے اب ایک طرف واخان میں روس ہے، دوسری طرف ایک وسیع علاقہ چین کی سرحد سے ملتا ہے۔ تیسری جانب کشمیر کے وسیع حصہ پر فوجی قبضہ کے باعث سوکلومیٹر کا علاقہ مقبوضہ کشمیر کے ذریعہ بھارت سے ملتا ہے، اور چوتھی جانب پاکستانی پنجاب اور سرحد کے علاقہ جات ہیں۔ اس خصوصی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے آزاد کشمیر کی اہمیت بعض اپنی ذاتی خصوصیات کی حامل ہوگئی ہے۔ منجملہ ان کے یہ علاقہ پاکستان کے دفاع میں ایک خاص کردار ادا کر رہا ہے۔

پاکستان اور بھارت کے مابین متنازعہ ہونے کے باعث خطرہ کا محل بھی یہی ہے بلکہ مجھے تو وہ خطرہ اب تمام اطراف سے سمٹ کر آزاد کشمیر کی سرحد پر ہی منڈلاتا دکھائی دیتا ہے، اس کی کئی معقول اور قابل فہم وجوہ ہیں۔ ان سب کا تذکرہ اس وقت ضروری نہیں، تا ہم یہ بات اس ملک میں ہر کس و ناکس، خاص کر محبّ وطن عناصر کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ پاکستان کے وجوہ کے خلاف بھارت کے مذموم منصوبوں اور سازشوں کا آخری ہدف آزاد کشمیر کا خطہ ہی ہو سکتا ہے۔ خطرات اگرچہ اس وقت کئی اطراف میں موجود ہیں اور وہ بظاہر زیادہ قریب اور زیادہ موثر دکھائی دے رہے ہیں لیکن میرے خیال میں آزاد کشمیر کی سرحد سے آنے والا خطرہ ہماری فوری توجہ کا تقاضا کرتا ہے، یہ محض حسن اتفاق ہے کہ اگر ہم اب بھی پوری صورت حال کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اپنا کردار اس کے مطابق ادا کریں تو بہت تھوڑے وقت میں اور تھوڑے وسائل کے ساتھ نہ صرف اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں بلکہ اس کا منہ توڑ جواب دینے کی پوزیشن میں ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر بھارت اس علاقہ کو میدان جنگ بنانا چاہتا ہے تو ہماری پسند کا میدان بھی یہی ہونا چاہیے۔

(تصویر: سردار محمد عبدالقیوم خان)

سیاست دانوں کا منفی طرز عمل:

اس میں خطرہ جس وجہ سے ہو رہا ہے وہ بھارت کی فوجی تیاریاں ہی نہیں ہیں بلکہ

اس سے بڑھ کر ہماری اپنی حکومتوں کی مجرمانہ غفلت اور ہمارے سیاسی حضرات کا غلط اور منفی رد عمل ہے۔ حکومت کا طرزِ عمل خطرہ کے وقت آنکھیں بند کر لینے والے کبوتر کی طرح ہے۔ بعض حالتوں میں تو یہ دونوں عوامل بجائے خود منفی اور تخریبی رجحانات کی حوصلہ افزائی اور محبّ وطن عناصر کی حوصلہ شکنی کا موجب بنتے ہیں۔ ان حالات میں ہم لوگ آزاد کشمیر میں انتخابات کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ اس سیاسی دباؤ کی ایک وجہ تو محل وقوع ہے اور ایک مسئلہ کشمیر۔ اسی لیے اس سیاسی دباؤ کے باعث آزاد کشمیر میں سیاسی بیداری غالباً ہمارے ملک کے کسی بھی دوسرے حصہ سے زیادہ ہے۔

مسئلہ کشمیر میں بھی آزاد کشمیر کا ایک اہم کردار ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مسئلہ کشمیر اب کھڑا ہی صرف دو عوامل پر ہے، ایک آزاد کشمیر کا وجود، تو دوسرا مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کا بھارت کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کرنے سے کھلا اور ناقابل تردید انکار۔ اگر خدانخواستہ ان میں سے کسی ایک بنیاد کو بھی گرا دیا جائے تو مسئلہ کشمیر کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ پھر تو بنگلہ دیش کی طرح بھارت کے ساتھ مفاہمت کیے بغیر کوئی راستہ نہیں۔ اتفاق یہ ہے کہ اگر آزاد کشمیر کو کسی وجہ سے موجودہ حالت میں نہ رہنے دیا جائے تو پھر بھارت کے ساتھ مفاہمت کی ضرورت پاکستان کی ہوگی اور وہ شرائط بھی شریفانہ ہوں گی نہ منصفانہ بلکہ ایک بزدل دشمن کی فاتحانہ نخوت کی غمازی کریں گی جس کے لیے سفاکی سے کم درجے کا کوئی لفظ لغت میں نہیں ہے۔

اگر خدانخواستہ ایسا ہو جائے تو پھر بھارت کے توسیع پسندانہ عزائم اور پاکستان کی تخریب کے منصوبوں میں سوائے امریکہ کے کوئی مقامی رکاوٹ نہیں رہ جاتی، لیکن امریکہ نہ تو ہم سے پوچھ کر اپنی پالیسی مرتب کرتا ہے نہ ہمارے مفادات کے پیش نظر۔ اس کا اپنا مفاد جیسا ہوگا ویسا ہی وہ کرے گا اور اس میں کوئی گلہ نہیں، ہر ایک کا حق یہی ہے۔

آزاد کشمیر کی سیاست کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ جہاں پاکستان کی سیاست کا اثر

آزاد کشمیر پر پڑنا لازمی امر ہے وہاں آزاد کشمیر کی سیاست کا اثر بھی پاکستان کی سیاست پر پڑتا ہے۔ اسی طرح فرداً فرداً بھی اور مل کر بھی پاکستان اور آزاد کشمیر کی سیاست کی دفاعی سرحد آزاد کشمیر بھی مضبوط ہو گی اور نہ صرف کشمیر کا مسلمان سکھ کا سانس لیتا ہے اور عزت نفس کو قائم رکھ سکتا ہے بلکہ خود بھارت کے اندر مسلمان پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے جیسا کہ ہم نے 1965ء کی جنگ کے بعد دیکھا تھا۔ البتہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس کا احساس اور شعور دونوں کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چند سالوں میں پاکستان سے بعض جماعتوں نے اپنا دائرہ کار آزاد کشمیر تک بڑھا دیا جس کی مجبوری کے باعث آزاد کشمیر سے بھی ہم لوگوں نے پاکستان کی سیاست میں ایک حد تک دخل دیا۔ البتہ ہم نے اس دخل کو محض اصولی معاملات تک رکھا اور عملی سیاست سے باہر رہے۔ پاکستان کی سیاسی جماعتوں کا دائرہ کار آزاد کشمیر تک بڑھانے کے کیا ممکنہ محرکات ہیں وہ اپنی جگہ، لیکن اگر وہ آزاد کشمیر کی آزادی اور پاکستان کے ساتھ اس کے الحاق کی خاطر ہوتا تو شاید اس کے بہتر نتائج برآمد ہوتے مگر جو ہوا وہ ظاہر ہے۔ جن دو جماعتوں نے اپنا دائرہ کار آزاد کشمیر تک بڑھایا ان کے مقاصد اور طریقہ کار کا ذکر ان کے ضمن میں ہی کروں گا۔

آزاد کشمیر کی موجودہ حیثیت:

ایک اور امر جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ آزاد کشمیر کی موجودہ حیثیت بوجوہ عجیب سی ہے۔ نہ تو یہ پاکستان کا آئینی حصہ ہے، کیونکہ اس کا الحاق ابھی تک نہیں ہوا اور نہ ہی یہ کوئی علیحدہ خود مختار تسلیم شدہ مملکت ہے۔ قومی سیاسی وجوہ کی بناء پر اس کی حالت ان دونوں صورتوں کے درمیان رکھی گئی ہے۔ غالباً کسی نے سوچ کر ایسا نہیں کیا بلکہ حالات کے تقاضوں کے باعث یہ ناگزیر تھا ورنہ ان دو مذکورہ صورتوں میں سے کوئی ایک بھی ہو جاتی جو اس وقت ناممکن نہیں تھی تو آج کشمیر کا کوئی مسئلہ ہوتا نہ پاکستان کی سرحدات محفوظ ہوتیں۔ اس خصوصی صورت حال کو سمجھنے کے لیے بھی سیاسی علم وفکر کے علاوہ قومی اور ملی مقاصد کے واضح تعین کی ضرورت

ہے۔ محض اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے اور خواب دیکھنے سے یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ جب تک کوئی شخص پوری سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور نہیں کرے گا اور ملی مفادات اور مستقبل بعید کا نقشہ سامنے نہ ہوگا، پوری بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ مجھے کئی مواقع پر بڑی قابل احترام شخصیات کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ اس لیے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ کچھ معاملات کا ذکر تھوڑا آگے چل کر مناسب مقام پر ان شاء اللہ کروں گا۔

یہ امر بھی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ اس مسئلے میں جس کے بارے میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا ''کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے'' پاکستان میں ہنوز نصف صدی ہونے کو ہے سرکاری سطح پر کوئی متفقہ تو کیا جیسا تیسا بھی طے شدہ قومی موقف سرے سے موجود ہی نہیں۔ حکومتیں تو مسلسل بے یقینی اور پسپائی کا شکار رہی ہیں، سرکاری ملازمین کی بالکل اپنی سوچ رہی ہے اور سیاسی جماعتوں اور راہنماؤں کے ہاں بھی اس پر کوئی خاص فکری ہم آہنگی دکھائی نہیں دی۔ اسی طرح قومی اخبارات کا طرز عمل بھی کبھی متزلزل ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ جیسا کہ وقت کی طبیعت ہے، پاکستان میں بسنے والے کشمیریوں میں اور خاص کر آزاد کشمیر میں بھی فکری انحطاط ہونا فطری امر ہے آج کوئی نصف درجن کے قریب مختلف سیاسی آراء ہیں جن پر کام ہو رہا ہے۔

آزاد کشمیر کے سیاستدان دان غالباً یہ سوچتے ہیں کہ پاکستان کی مرکزی حکومت ان کی راہنمائی کرے گی کیونکہ ایک تو وہ بہتر پوزیشن میں ہے، دوسرے یہ کہ پاکستان بھی ہماری ہی طرح اس معاملہ میں ایک اہم فریق ہے لیکن پاکستان کی حکومت اپنی کمزوریوں کو کشمیری سیاست دانوں کے کھاتے میں ڈالتی رہی ہے کہ وہ متفق و متحد نہیں ہوتے اور کچھ نہیں کرتے۔ ان حکومتوں کا طرز عمل بسا اوقات ایسا ہوتا ہے گویا یہ خواہش کر رہے ہیں کہ مقبوضہ کشمیر کا مسلمان اکیلا لڑ کر بھارت کو وہاں سے بھگا دے اور کشمیر کو تھالی میں رکھ کر ہماری حکومت کے

ان سورماؤں کے قدموں میں لا کر پیش کر دے، بلکہ واقعات یہ شہادت بھی فراہم کرتے ہیں کہ بعض مرکزی حکومتوں نے کشمیریوں کی قیادت کی بعض نے فطری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان کی صفوں میں مزید انتشار پیدا کیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ بھارتی حکومت کا مفاد تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن دوسری طرف اس کے نقصانات ہی مرتب ہوئے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ پاکستان میں سرکاری سطح پر قومی وملی پالیسی مرتب نہ ہوسکی جس پر کوئی مفید اور نتیجہ خیز کارروائی کی جائے۔ ان امور کے پس منظر اور اس کی تاریخ میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے البتہ جو ہوا وہ یہی کچھ ہے گویا اس حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔ شاید ہی کسی کے جسم پر کوئی تار باقی رہ گیا ہو۔

مایوسی کی ایک تاریک فضا میں امید کی ایک کرن خود کشمیری عوام کی پاکستان کے ساتھ ناقابل شکست وابستگی اور پاکستانی عوام کا ان کے ساتھ جذباتی لگاؤ ہے اور شاید یہی وہ مؤثر عنصر ہے جو کسی وقت اس مسئلہ کے منطقی نتائج برآمد کرے گا۔ خط فائر بندی کے دونوں طرف کے کشمیری عوام اپنی اپنی جگہ بہت نا مساعد حالات کے باوجود حق خود ارادیت کے اصول پر قائم اور اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے خواہشمند ہیں، خصوصیت کے ساتھ اس امر میں کسی تردید کا خوف نہیں ہے کہ کشمیری عوام بالعموم اور مسلمان بالخصوص جو بھاری اکثریت میں ہیں بدستور پاکستان کے ساتھ ذہنی وابستگی پر قائم ہیں اور بحمد اللہ تعالیٰ وقت کا کوئی بھی بے رحم ہاتھ اس مقدس رشتہ کو کاٹ سکا ہے نہ کمزور کر سکا ہے، بلکہ پنڈت جواہر لال نہرو کے اس خیال کے برعکس کہ ''وقت خود بخود ان زخموں کو مندمل کر دے گا'' یہ رشتہ اور قومی ہوتا گیا۔ اس رشتہ میں شگاف ڈالنے کی بے شمار اور سرتوڑ کوششیں ہو رہی ہیں لیکن ابھی تک اس میں قابل ذکر کامیابی نہیں ہوئی۔ حال ہی میں شیخ فاروق عبداللہ کیساتھ اندرا گاندھی نے جو کچھ کیا اور پھر فاروق عبداللہ کا ردعمل اس کی بڑی واضح دلیل ہے۔

یہ اس صورت حال کا اجمالی تجزیہ ہے۔ اب آزاد کشمیر کے اندر بھی ذرا غور کریں کہ

کیا صورت حال ہے؟ وہاں اس وقت چیلنج کیا ہے، کون کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟ اور اس کا علاج کیا ہے؟ اس کا بیان کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ملک کے تمام ذمہ دار افراد اور عناصر کو صورت حال کا صحیح علم ہو جائے تا کہ لوگ اپنے اپنے کردار کا تعین کر سکیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ کشمیر کی سیاست کے بارے میں بالعموم اور آزاد کشمیر کے بارے میں بالخصوص ملکی سطح پر معلومات ہی بہت کم ہیں۔ یہ بات کسی پر کوئی تنقید یا تنقیص نہیں، کشمیر کے بارے میں ہم قومی سطح پر کئی مرتبہ اپنی کم علمی اور بے خبری کا ناقابل تردید مظاہرہ کر چکے ہیں بلکہ اپنا مذاق اڑا چکے ہیں۔

آزاد کشمیر کی اندرونی سیاسی صورت حال کو اچھی طرح سمجھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ حالات کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ قدرت کاملہ ہمیں کوئی ایسا موقع عطا کر ہی دے جس سے تحریک پاکستان اور تحریک آزادی کشمیر کی تکمیل ہو سکے۔ چاہے اگر کسی وقت ایسا ہو تو ہم اپنی ہی کسی غفلت، لاعلمی یا بے خبری کے باعث اس کا استفادہ کرنے سے محروم نہ رہیں جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا، بلکہ ایک قدم اور آگے دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ آزاد کشمیر کے حالات کو کماحقہ سمجھے بغیر نہ تو کشمیر کی آزادی کی تحریک کے بارے میں کچھ سمجھ میں آ سکتا ہے نہ اس مقدس مشن الحاق پاکستان کا مفہوم ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہمارے جس قدر کام خراب ہوئے ہیں وہ دشمنوں کے کسی کمال کے باعث کم اور ہماری اپنی کوتاہیوں کے باعث زیادہ ہوئے ہیں نیز اگر اس ضمن میں پاکستان میں مقیم کشمیری مہاجرین، آزاد کشمیر (بشمول شمالی علاقہ جات) کے لوگوں اور مقبوضہ کشمیر کے عوام، ان تینوں میں ربط نہیں ہوگا تو کوئی تحریک کسی درجے میں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔

جفائے وفانما:

آزاد کشمیر کے اندر کی موجودہ صورت حال گنجلک ہوگئی ہے اور جب تک پوری توجہ کے ساتھ اس پر غور نہ کیا جائے اس کے اصل خدوخال سمجھنا آسان نہیں ہوگا۔

یوں تو کشمیر کی مجموعی صورتحال ہو یا آزاد کشمیر کے سیاسی حالات ہوں، سب ہی الجھے ہوئے ہیں مگر گزشتہ دس سالہ دور میں یعنی 1975ء سے ان الجھنوں میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ماضی قریب کا دورِ حکومت تو اس میں منفرد حیثیت رکھتا ہے جس کی متنازعہ آئینی حیثیت کے بارے میں عدالت عالیہ میں ایک علیحدہ رٹ زیرِ سماعت ہے مگر یہ عجیب اور ناقابلِ فہم امر ہے کہ اس دور میں ایک طرف تو نظریہ الحاق کو زبردست دھچکا لگا اور دوسری جانب اس کے مخالف نظریات کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس کی تفصیلات میں جانا اس وقت ممکن نہیں تاہم اتنا کہنا بے محل نہ ہو گا کہ وہ نظریات جو آزاد کشمیر میں انتشار کا باعث بن کر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتے ہیں ان کے لیے یہ دورِ حکومت ایک نعمت ثابت ہوا جیسا کہ بعض واقعات نے اس کی بخوبی تصدیق کی ہے۔

لیکن جب ہماری طرف سے یہ بات کہی جاتی ہے تو سوال یہ ہوتا ہے کہ آخر ایک شخص جو فوج کا بڑا افسر ہے پھر اسے حکومت دی گئی، وہ پنشن بھی لے گا اور اس کے تمام تر مفادات اس ملک کی سلامتی کیساتھ وابستہ ہیں، تو کیسے ممکن ہے کہ اس نے الحاق پاکستان کے مقصد کو کمزور کیا ہو، اور ملک کی سلامتی کے مخالف نظریات کی حوصلہ افزائی کی ہو، اس کا کوئی تسلی بخش منطقی اور حتمی جواز مہیا کرنا ممکن نہیں کیونکہ ضروری نہیں ہے کہ ہر عمل کا کوئی ظاہری سبب ہی آخری ہو۔ اس قسم کے واقعات کے پیچھے بالعموم وہ اندھی خود غرضی ہوتی ہے جس کی وجہ سے کوئی آدمی کسی عقیدہ پر ہی قائم نہیں رہتا، جس کی کئی مثالیں خود ہماری سیاست میں موجود ہیں۔ میں کوئی پیشین گوئی نہیں کرتا لیکن ایسے لوگوں کے بارے میں مجھے اس خطرے کا احساس رہتا ہے کہ وہ اسی طرح لیلائے اقتدار کی بے مہار ہوس میں مبتلا رہے تو کچھ عجب نہیں کہ وہ کل خود تخریب کاروں کی قیادت سنبھال لیں۔ یہ ان کی نیت پر کوئی شبہ نہیں لیکن ان کی کوششوں کا منطقی نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ خدا نہ کرے اگر حلال و حرام میں تمیز نہ کی جائے تو پھر لقمان سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ وہ لوگ بالآخر حرام کی ہی نذر کیوں ہو

جاتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

جس طرح زندگی کے دوسرے معاملات کھانے پینے وغیرہ میں حلال وحرام ہے، اسی طرح سیاست میں بھی حلال وحرام ہے اور جو لوگ اس میں تمیز نہیں کرتے وہ بالآخر سیاست میں حرام کو ہی عین جائز اور ضروری سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں، دوسرے معاملات کے مقابلے میں سیاسی معاملات میں حلال وحرام کا اثر بدر جہا زیادہ ہوتا ہے، جہاں تک دونوں حالتوں کے دائرہ اثر کا تناسب ہے۔ تاہم واقعات بتاتے ہیں کہ جہاں بھی تخریب ہوئی اس میں مایوسی اور محرومی کے مارے ہوئے افراد کے علاوہ زیادہ تر وہی لوگ ملوث تھے جو زیادہ مراعات یافتہ بھی تھے اور جن کے بارے میں بالعموم یہی تعجب ہوتا ہے کہ آخر یہ لوگ کیوں اور کس طرح اپنے شخصی وملی مفادات کی اس طرح تکذیب کر سکتے ہیں لیکن روز مرہ زندگی میں ہم ایسے واقعات سے دو چار ہوتے ہیں۔ یہی وہ ناشکرا طبقہ ہے جس کی نشاندہی اللہ تعالیٰ کے واضح فرمان، ''لئن شکرتم لا زیدنکم و لئنکفرتم ان عذابی لشدید'' ترجمہ''اگر تم نے شکر کیا تو میں تمہیں یقیناً اور زیادہ دوں گا اور اگر تم نے میری نعمتوں کی ناشکری کی تو میرا عذاب بہت سخت ہے'' سے ہوتی ہے۔

یہ وہ طبقہ ہے جو ضرورت اور استحقاق سے زیادہ کچھ مل جانے کی وجہ سے غیر ضروری امیدوں اور تمناؤں کا شکار ہو جاتا ہے اور اس طرح تخریب اور منفی رجحانات کے دام فریب میں پھنسا رہتا ہے اور خدا کے عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔

زود پشیمانی:

کافی دیر سے ان عناصر اور ان کے حامیوں کی طرف سے جواب اور برات کے طور پر کہا جا رہا ہے کہ مسلم کانفرنس ان پر غلط الزامات لگا رہی ہے، تاہم واقعاتی طور پر اس حقیقت کو صرف نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو آج پورے آزاد کشمیر میں سنائی دے رہی ہے۔ اس قسم کی صورت حال اس سے قبل کبھی نہ تھی۔ ہمارے معاشرے میں یہ بھی ایک خرابی ہوگئی ہے کہ ہم

نے انصاف کے اپنے پیمانے بنا لیے ہیں ہر بات کو پرکھنے کا طریقہ یہ ہو گیا ہے کہ اگر کہنے والے سے اختلاف ہے تو اس کی ہر بات کو بغیر غور کیے مسترد کیا جاتا ہے، یہ محض اختلافات کی وجہ سے ہے اور جب صحیح بات سمجھ میں آتی ہے تو پھر خالی پچھتاوے سے کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ فیلڈ مارشل مرحوم کے دور حکومت میں جب آزاد کشمیر کو خود مختار اور آزاد مملکت کی حیثیت سے تسلیم کروانے کی تجویز چلائی گئی اور پھر اس پر ایک جماعت لبریشن لیگ بنائی گئی تو رئیس الاحرار چوہدری غلام عباس مرحوم نے دلائل و براہین سے حکومت کو سمجھانے کی بہت کوشش کی، مگر حکومت چونکہ چوہدری صاحب مرحوم کو اپنا مخالف سمجھتی تھی اس لیے بجائے بات سمجھنے کے غلطی پر ہی ان کا اصرار بڑھتا گیا حتیٰ کہ انتخابات کا گلہ گھونٹ کر خورشید صاحب کو منتخب قرار دیا گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جب شیخ محمد عبداللہ مرحوم کی آمد کا مرحلہ آیا اور کئی پوشیدہ حقیقتیں واضح ہونے لگیں تو انھیں فیلڈ مارشل مرحوم نے خورشید صاحب کو جس طرح بنایا تھا اسی طرح اتارا ہی نہیں بلکہ قید بھی کیا۔ خان حبیب اللہ خان نے جو اس وقت وزیر امور کشمیر تھے، مجھے خاص طور پر مل کر کہا:

> ’’جو بات آپ لوگوں نے چار سال پہلے سمجھ لی تھی وہ ہمیں چار سال بعد سمجھ میں آئی‘‘

لیکن یہ تو وہی زود پشیمانی والی بات تھی کیونکہ اس غلطی نے ایک مستقل فتنہ تو پیدا کر دیا تھا جس کا علاج اب ان کے پاس نہیں رہا تھا۔ اگر حسن اتفاق سے درمیان میں مسلم کانفرنس کی حکومت نہ آتی تو خدا جانے وہ فتنہ کن حدود کو پہنچتا۔

اسی طرح ترقی معکوس کے اس دور میں، میں نے چند مواقع پر صدر مملکت اور ان کے دائیں بائیں لوگوں کو توجہ دلوائی کہ ملی مفادات کو کس طرح سبوتاژ کیا جا رہا ہے جس کی تلافی مشکل ہو گی، تو ان سے لوگوں نے یقیناً یہی سمجھا کہ میں محض مخالفت کی وجہ سے ایسا کہہ رہا ہوں۔ جب جانبداری اس درجہ کی ہو کہ کسی پر اندھا یقین ہو تو ہر بری بات بھی اچھی دکھائی

دیتی ہے۔ اس دور میں منفی اور تخریبی رجحانات کو کس قدر تقویت دی گئی، اس کا ذکر بھی تھوڑا آگے چل کر کروں گا۔ آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں میرا ضمیر مطمئن ہے کہ اس میں کسی کی مخالفت یا حمایت کا شائبہ بھی نہیں بلکہ یہ ایک قومی و ملی ذمہ داری ہے جس کو دیانت داری کے ساتھ ادا کرنے کا ہم پر حق ہے، کسی سے کچھ خوف ہے نہ کوئی لالچ۔ آزاد کشمیر کا اقتدار تو ہمارے لیے کانٹوں کی مالا ہے، وہ ہمارا کوئی مقصود وحید بھی تو نہیں ہے البتہ اقتدار کا اپنا ایک مقام ہے جو کام حکومت کو کرنا ہوتے ہیں وہ باہر سے کسی صورت نہیں ہو سکتے۔ مزید یہ کہ آزاد کشمیر کی حکومت اور سیاست میں کوئی درمیانی لکیر بھی نہیں کھنچی جا سکتی کیونکہ آزاد حکومت ہماری سیاسی جدوجہد اور سیاسی امنگوں کی آئینہ دار ہونی چاہیے۔ یہ بات قومی مفادات میں نہیں کہ حکومت کا رخ ایک طرف ہو اور سیاست کا دوسری جانب جیسا کہ ماضی میں اکثر ہوتا رہا ہے۔

حکومت آزاد کشمیر کا کردار:

ضمناً یہ بھی کہنا ہے کہ آزاد کشمیر کی حکومت کا بھی اس تمام قضیئے میں اپنا ایک مقام ہے۔تحریک آزادی کشمیر ہو۔تحریک الحاق پاکستان ہو، پاکستان کے ساتھ کشمیریوں کی یکجہتی ہو یا مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کی اخلاقی امداد، ان تمام امور میں آزاد کشمیر کی حکومت کا طرز عمل اور کردار بہرصورت اپنا خاص اثر اور مقام رکھتا ہے۔

اس لیے بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ جی یہ لوگ تو بس اقتدار چاہتے ہیں (یعنی یہ کوئی بری بات ہے) اور یہ کہ حکومت اپنا کام کرے اور سیاسی جماعتیں اپنا کام کریں، تجاہل عارفانہ ہے اور محض جہالت۔ اس قسم کی مضحکہ خیز تجاویز بھی کئی مرتبہ زیر بحث رہی ہیں، بلکہ ایک بوالعجبی یہ ہے کہ خود بریگیڈئیر محمد حیات خان جب صدر تھے تو سیاست دانوں پر ایک بڑا الزام یہی ہوتا تھا کہ یہ سب لوگ اقتدار چاہتے ہیں۔ لیکن اب وہ خود بے چارے روز شب اسی لیلیٰ کے فراق میں مارے مارے پھرتے ہیں اور آئے دن لوگوں سے وعدہ کرتے ہیں کہ اگر وہ اقتدار میں آئیں گے تو دودھ اور شہد کی نہریں بہادیں گے۔ یہ لطیفہ بھی ہم نے سنا ہے

کہ حال ہی میں وہ کھوئی رٹہ سے چڑہوئی جانے لگے تو کیچڑ کے باعث پیدل چلنا پڑا۔ ظاہر ہے کہ کیچڑ کی گستاخی کا بھی کچھ اثر ہوا تو سنا ہے کے حیرت سے پوچھنے لگے کہ یہ سڑک ابھی تک پختہ کیوں نہیں ہوئی، گویا یہ بھی مسلم کانفرنس کا ہی قصور تھا۔

آزاد کشمیر کی حکومت بھی تحریک آزادی اور الحاق پاکستان کی واضح طور پر آئینہ دار بلکہ اولین اور موثر ترین علمبردار ہونی چاہیے کیونکہ اسی تحریک کے نتیجہ میں وہ معرض وجود میں آئی ورنہ اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اسی وجہ سے آزاد کشمیر میں ایک پوری حکومت قائم ہے ورنہ اس مختصر سے علاقہ کو تو ایک ایڈمنسٹریٹر بھی اچھی طرح سنبھال سکتا تھا۔ آزاد کشمیر میں اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہو یا بدتر یہ کہ اس کے برعکس ہو تو یہ ان غازیوں اور شہیدوں کی قربانیوں سے کھلی بے وفائی اور ان کی نفی ہو گی جن کے باعث آزاد کشمیر وجود میں آیا اور ایک حکومت قائم ہوئی بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر اس نظریئے اور عقیدے کی مخالف حکومت کسی حادثے سے بن جائے تو ہم لوگوں کے لیے اس کے خلاف جہاد کرنا عین فرض ہے ورنہ ہری سنگھ کے خلاف جہاد، جہاد نہیں رہتا۔

نظریاتی کشمکش:

اس وقت آزاد کشمیر کی سیاست میں جو نظریاتی کشمکش موجود ہے اسے تقریباً دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف نظریہ الحاق پاکستان ہے اور اس کے ماننے والے، تو دوسری جانب الحاق پاکستان کی مخالف تحریکیں ہیں اور ان کے ماننے والے ہیں۔ سیاست میں ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو اگرچہ ہے تو دائیں طرف اور اس کے الحاق کا مخالف نہیں کہا جا سکتا، مگر ہماری مخالفت میں وہ الحاق کے مخالفین کے ساتھ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ یہ گروہ درحقیقت ان حضرات پر مشتمل ہے جو محض اقتدار کے خواہشمند ہیں، وہ بھی جہاں سے اور جس طرح ملے۔ ان کی سیاست گویا وقتی مفادات اور ان کی اپنی ذات کے گرد گھومتی ہے یہ دوسری یعنی الحاق کی مخالف تحریک دو تین ناموں سے چلائی جا رہی ہے۔ کچھ تو کہتے ہیں کہ وہ بھی اگرچہ

بالآخر الحاق کے ہی قائل ہیں مگر درمیانی عرصہ کے لیے ''خودمختار'' ریاست کے نام سے تحریک چلانا زیادہ مفید سمجھتے ہیں۔ کچھ دوسرے ہیں جو ریاست کو بہرصورت ایک خودمختار علاقہ بنانے کے خواہشمند ہیں۔ تمام نظریاتی سیاسی جماعتوں یا گروہوں کا انہی دوحصوں کے ساتھ تعلق ہے، بالواسطہ یا بلاواسطہ۔

جہاں تک اس ''خودمختاری'' کے اصول کا تعلق ہے اس میں محاذ رائے شماری اور ''لبریشن فرنٹ'' تو بلاواسطہ بات کرتے ہیں، لیکن لبریشن لیگ اور اب جماعت اسلامی بھی بالواسطہ اسی مکتبہ فکر کی حمایت کر رہی ہے، بلکہ میرے خیال میں مؤخر الذکر زیادہ خرابی کا باعث ہوسکتی ہیں۔ تاہم ان میں سے ہر ایک کا اپنا ایک انداز ہے، دلائل اور منطق بھی۔ مگر نتائج کے اعتبار سے منزل مقصود تمام حسابی اور سیاسی اندازے سے ایک ہی بنتی ہے۔ ان نظریات اور ان کے علمبرداروں کے بارے میں اختصار کے ساتھ امور گزارش کرتا ہوں تاکہ بنیادی باتیں سمجھ میں آجائیں۔

دراصل اس ضمن میں ایک تفصیلی مقالے کی ضرورت ہے ہماری طرف سے یہ بڑی کوتاہی ہے کہ ہم اس کو ابھی تک تحریر میں نہیں لا سکے، جبکہ دوسری جانب سے بہت کچھ اس پر لکھا گیا ہے اور بڑے پرکشش اور منظم طریقے سے ان گمراہ کن نظریات کی ترویج اور اشاعت کی جا رہی ہے۔

محاذ رائے شماری کا نقطہ نظر:

سب سے پہلے ''محاذ رائے شماری'' اور ''لبریشن فرنٹ'' کی خودمختاری کی بات کرتے ہیں۔ ان دونوں تنظیموں کا ذکر ایک جگہ بھی ہوسکتا ہے۔ مگر دونوں کے طریقہ کار میں کچھ فرق ہے، اس وجہ سے علیحدہ ذکر کرنا ہی درست ہوگا۔ اس نظریئے کی تاریخ اور اس کا پس منظر بیان کرنا تفصیل طلب ہے پھر کسی وقت موقع ملا تو ان شاء اللہ کریں گے۔ سردست چند فوری نوعیت کی باتوں پر ہی اکتفا کرنا ہوگا۔ جہاں تک محاذ رائے شماری کا تعلق ہے اس میں کچھ

افراد ایسے ہیں جن کا ذاتی شخصی رویہ زیادہ اشتعال انگیز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سابقہ حکومت نے عوام اور خواص سب ہی کا عرصہ حیات تنگ کر دیا تو محاذ رائے شماری کے ساتھ نظریاتی اختلاف کی شدت کے باوجود ہمیں بعض امور پر مل کر سوچنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ بات نہ کہنا بے انصافی ہو گی کہ اس تمام عرصہ میں جب ہم چار جماعتی اتحاد کی شکل میں ایک ساتھ کام کرتے رہے، محاذ رائے شماری کے ساتھ کوئی خاص شکایت پیدا نہ ہوئی۔ شاید دونوں طرف کی یہ خواہش ہنوز تشنہ تکمیل ہے کہ ہم ان نظریات کے بارے میں کھلے دل و دماغ کے ساتھ باہمی گفت وشنید کرتے۔ میں تو یہ بات بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس اتحاد سے قبل اگرچہ محاذ رائے شماری کے ہاں میرے خلاف بہت شدت تھی جو عداوت کی حد تک پہنچ گئی تھی، مگر محاذ کی ان مذکورہ شخصیات کی ذات کے بارے میں دل میں ہمیشہ کافی نرمی موجود رہی۔ اگرچہ جواباً ہم نے بھی خود مختاری کے اس گمراہ کن نظریئے کے خلاف کچھ کہنے میں کمی نہیں کی تاہم یہ صورت حال اسی طرح رہی۔ باصلاحیت لوگ ہی خرابی بھی کر سکتے ہیں اور اچھائی بھی۔ حضور پاک ﷺ کے فرمان، ”خیارکم فی الجاھلیة خیارکم فی الاسلام“ ترجمہ ”دور جاہلیت میں جو لوگ تم میں اچھے تھے وہی اسلام میں بھی اچھے ہیں“ کا مفہوم بھی غالباً اسی قسم کا ہے۔ محاذ کے ساتھ تلخی کی ایک دوسری وجہ ان نوجوانوں کا طرز عمل بھی تھا جو محاذ کے ساتھ منسوب تھے اور بالخصوص میری ذات کے بارے میں ہر قسم کی نازیبا زبان استعمال کرنا ہی گویا اپنا مقصد حیات سمجھتے تھے۔

پھر معاملہ افتاں وخیزاں چلتا رہا تاوقتیکہ کشمیر میں بحالی جمہوریت کے لئے محاذ کے ساتھ محدود اور مشروط اتحاد یا اتفاق رائے ہو گیا۔ اس تفاق رائے پر اس وقت کی حکومت نے یعنی محمد حیات خان نے ہمیں بھی ان ہی نظریات کا پیرو کار ظاہر کر کے مرکزی سرکار کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی اور یہ باور کرایا کہ محاذ رائے شماری کو ایک محدود حلقہ سے نکال کر کھلے میدان میں لانے والے ہم لوگ ہیں، جس سے ان کے نظریات کو عوام میں

پھیلنے کا موقع ملا ہے اور ظاہر ہے کہ اس وقت کی حکومت کی بات زیادہ قابل اعتبار سمجھی گئی ہو گی، کیونکہ وہ اپنے ہم جنسوں سے بات کر رہے تھے اور غیر جنسوں کی مخالفت کی قدر مشترک بھی ان کی مددگار تھی۔ اس سے اس حکومت کو دوہرا فائدہ ہوا۔ ایک تو مسلم کانفرنس کے بارے میں ارباب اقتدار کی رائے خراب کرنے میں مدد ملی، دوسرے اپنی غلط کاریوں پر پردہ ڈالنے میں کامیابی ہوئی۔ اگر بفرض محال ہماری وجہ سے کوئی نقصان ہوا ہے تو ہم اس کی تلافی کرنے کی بفضل تعالیٰ صلاحیت رکھتے ہیں، بلکہ رابطہ عوام کی ہماری حالیہ مہم اس امر کی ناقابل تردید دلیل ہے، لیکن صدر کی حیثیت سے بریگیڈئر محمد حیات خان نے جو بڑا ملی اور نظریاتی نقصان کیا ہے اس کی تلافی آسان نہیں۔ وہ بھی شاید ہمیں ہی کرنا پڑے گی، بلکہ ہم ہی کر رہے ہیں۔ جیسا کہ فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں پیدا ہونے والے فتنے ''آزاد کشمیر کو تسلیم کرانے'' کا مقابلہ بھی مسلم کانفرنس ہی کرتی رہی ہے ورنہ وہ فتنہ بھی کوئی کم درجے کا نہیں تھا۔

یہ بھی یاد رہے کہ اسی فوجی حکومت کے دوران محاذ رائے شماری کو پہلی بار صدر پاکستان سے ملوایا گیا اور ایک موقع پر پروٹوکول میں صدر آزاد کشمیر کے بعد ان کے عہدہ دار کا نمبر رکھا گیا' لیکن ستم دیکھئے کہ وہ حکومت بدستور معصوم کی معصوم ہی رہی اور گنہگار ہم ہو گئے۔ بالآخر خود ہی ''خودمختاری'' کی ایک تحریک یعنی ''تسلیم کروانے والوں'' کے ساتھ نہ صرف مل گئے بلکہ خورشید صاحب کی قیادت میں کام کرنا پسند کر لیا۔

سیاست کا بالعموم اور جب یہ بے چاری بالخصوص غیر سیاسی حضرات کے ہتھے چڑھ جائے تو اس کا کچھ عجب حال ہوتا ہے۔ محمد حیات خان آج بھی فرماتے ہیں کہ سیاستدانوں نے بدعنوانیاں اور خرابیاں کیں جب کہ عین اسی وقت وہ خود انہیں سیاست دانوں میں سے ایک کی قیادت میں کام کر رہے ہیں اور پھر یہ سب وہی سیاست دان ہیں جن کو ان کی فوجی حکومت نے عدالتوں کے کٹہرے میں کئی سال کھڑا کیے رکھا اور ان ہی عدالتوں نے بالآخر چند ایک کے سوا سب کی بریت کر دی۔ بات دوسری طرف چلی گئی۔

خودمختاری کی اصلیت:

محاذ رائے شماری والے حضرات ریاست جموں وکشمیر کو ایک علیحدہ خود مختار مملکت بنانے کے خواہشمند ہیں۔ ان کے نزدیک اس وقت پاکستان اور بھارت دونوں ہی غاصب ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک طریقہ تو یہی ہے کہ کشمیری ان دنوں غاصب قوتوں کو طاقت سے نکال باہر کریں۔ دوسرا یہ ہے کہ استصواب رائے کی صورت میں صرف پاکستان اور بھارت کے نام پر فیصلہ نہ لیا جائے بلکہ تیسری صورت کی بھی اجازت لی جائے یعنی یہ کہ ریاست جموں وکشمیر ان دونوں ملکوں کے ساتھ الحاق کرنے کے بجائے خود مختار رہے۔ اگر ایسی اجازت ہو تو اس صورت میں محاذ رائے شماری والے لوگ ریاست کو خود مختار رکھنا چاہیں گے۔

مختصراً یہ بھی ذکر کروں کہ تقسیم ہند کے وقت ریاستوں کو یہ حق بھی دیا گیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو خود مختار رہیں لیکن بعد میں بوجوہ اسے ترک کر دیا گیا تھا۔ جب کشمیر کا مسئلہ بھارت کی طرف سے اقوام متحدہ میں پیش ہوا تو پہلی قرارداد جو دسمبر 1948ء میں پاس ہوئی اس میں یہی کہا گیا تھا کہ ریاست جموں وکشمیر کے لوگوں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنی مرضی سے چاہیں تو پاکستان اور بھارت میں سے کسی کے ساتھ الحاق کریں یا خود مختار رہیں۔ لیکن وہ دوسری قرارداد جو سلامتی کونسل نے جنوری 1949ء میں پاس کی تھی جس کو پاکستان، بھارت اور کشمیریوں سب نے منظور کیا اس میں تجویز کیا گیا کہ ریاست کے لوگ صرف یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آیا وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہتے ہیں یا بھارت کے ساتھ۔

چنانچہ اسی کے نتیجہ میں شیخ محمد عبداللہ صاحب نے کشمیر اسمبلی کے ذریعے بھارت کے ساتھ الحاق کی قرارداد پاس کروائی۔ اس پر پنڈت جواہر لال نہرو نے انگریزی لغات میں دیئے ہوئے استصواب کے وسیع معنی کا سہارا لیکر کر یہ کہہ دیا کہ بس استصواب ہو گیا ہے اور کشمیر بھارت کا حصہ بن گیا ہے۔

اسی طرح اگر محاذ رائے شماری والی بات پر زور دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ

ہم اپنے طے شدہ 37 سالہ بین الاقوامی موقف سے نہ صرف دستبردار ہو جائیں بلکہ ایک نئے موقف کے لیے جدوجہد کریں۔ لیکن اگر اس بات کا کوئی امکان ہو کہ ایسا ہونا ممکن ہے تو پھر معاہد تاشقند اور شملہ تو اس نئے موقف سے زیادہ معتبر ہیں۔ ان سے نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ اگر ہم ایک بار اپنے موقف سے انحراف کا راستہ نکال لیں تو بھارت جو ایک طاقت ور فریق ہے وہ تو پہلے ہی یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ہم لوگ دراصل تھے ہی غلط اور جھوٹا دعویٰ کو کمزور کریں گے، دوسرے ہم بھارت کے دعوے کی بالادستی کو تسلیم کریں گے، ریاست خودمختار ہو گی کہ نہیں اور کب ہو گی، لیکن یہ تباہی تو پہلے ہی ہو جائے گی۔ تاہم اگر ان کی بات تسلیم کر لی جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ پہلے کشمیر کو بھارت کے تسلط سے آزاد کرایا جائے پھر اس کے مستقبل کا فیصلہ اس طرح ہو جیسا وہ کہتے ہیں۔ گویا کشمیر کی آزادی کی منزل تک تو بہر حال ہم لوگ ایک ساتھ رہ سکتے ہیں، لیکن ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کے بعد بھی خود مختاری کے نعروں کی دلفریبی کے باوجود اس پار کے کشمیریوں کا فیصلہ کیا ہو گا۔ اس میں بال برابر بھی شبہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ لوگ تو گرم سرد چکھ چکے ہیں، رہے ہم لوگ تو شمشیر کی نوک سے اور اپنے خون سے وہ فیصلہ پہلے ہی صادر کر چکے ہیں۔ اس لیے محاذ کے بارے میں میرا طرزِ عمل ایسا رہا ہے کہ وہ اپنی بات بے شک کریں اور ہم بھی اپنی بات کریں، اس میں ہمیں اپنے بارے میں کسی قسم کے شک کا کوئی احساس نہیں ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ عملاً یہی کچھ ہوا۔ کئی لوگ جو اس نعرے سے بوجوہ متاثر تھے وہ ہماری بات سننے کے بعد بالکل درست ہو گئے۔

یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ پاکستان کی وزارت خارجہ کے ساتھ بھی یہ معرکہ پیش آیا۔ بھٹو صاحب کے دور میں مجھے اپنی صدارت کی وجہ سے معلوم ہوا بلکہ اس کی تصدیق بھی ہو گئی کہ ہماری وزارت خارجہ بھی ''خودمختار کشمیر'' کی حمایت کر رہی ہے۔ میرے کہنے پر بھٹو صاحب نے ایک مشترکہ میٹنگ کا حکم دیا۔ بڑی طویل نشست ہوئی اور بالآخر

وزارت خارجہ کے مسئولین نے اس کا اعتراف کیا کہ اس نعرے کے فوائد نہ صرف کم ہیں بلکہ وہ صرف خیالی ہیں، جب کہ اس کے نقصانات واضح، نا قابل تلافی اور فوری ہیں۔ چنانچہ اسی بات کا فوری اثر تھا کہ بھٹو صاحب نے خود اس معروف میٹنگ کے دوران جس میں کشمیری قیادت اور حکومت کے مرکزی زعماء شامل تھے، برہم ہو کر خورشید صاحب سے کہا کہ:

''خورشید آپ آگ سے کھیل رہے ہیں''

محاذ رائے شماری کے خود مختاری کے نعرہ کے بارے میں، ہم نے بوجوہ ہمیشہ محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔ باوجود اس کے کہ اس نعرے کے پس منظر میں قادیانی حضرات ایک بنیادی کردار ہیں، جس کا مجھے براہِ راست اور بلاواسطہ علم ہے، وہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے، کبھی موقع ملا تو عرض کروں گا کہ اس ضمن میں مجھ پر اور اس ملت پر کیا گزری؟ تاہم محاذ کی خود مختاری کے موقف کو دراصل کشمیر کے دونوں حصوں میں یعنی فائر بندی کے دونوں طرف کوئی قابل ذکر پذیرائی حاصل نہیں ہوئی بلکہ اس نظریئے کا دارومدار محض ہماری کوتاہیوں اور غفلتوں پر ہے، اس میں خود کوئی کشش اور صلاحیت نہیں ہے۔ اگر کچھ تھی بھی تو وہ اب تحلیل ہو رہی ہے۔ سرحد کے اس پار تو اس نعرے سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا جا رہا ہے جبکہ ہمارے ہاں آزادی کی نعمت کی ناشکری کرنے والے چند غیر ذمہ دار نوجوانوں کی توجہ کسی نہ کسی وجہ سے اس طرف ضرور مائل ہوتی ہے، کئی نوجوان تو محض اخلاص مندی اور سادگی سے سمجھنا شروع کرتے ہیں کہ اس طرح شاید کشمیر کی آزادی کی منزل قریب آجائے لیکن وہ اس تحریک کے اصل مقصد سے بے خبر رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس نعرے کی جو بھی پذیرائی ہوتی ہے اس کی کچھ وجوہات ہیں جن کا اجمالی ذکر مناسب مقام پر ان شاء اللہ آئے گا۔

(تصویر: سردار محمد عبدالقیوم خان جہاد کشمیر کے دوران نماز کی امامت کر رہے ہیں)

لبریشن فرنٹ:

’’لبریشن فرنٹ‘‘ کو محاذ رائے شماری کا بازوئے شمشیر زن کہا جاتا ہے جبکہ محاذ رائے شماری اس تحریک کا سیاسی محاذ ہے۔ واللہ اعلم۔ کچھ باتوں کا علم تو ہے مگر شاید اس تعلق کے بارے میں پوری بات کا علم نہ ہو۔ لبریشن فرنٹ جن اجزاء پر مشتمل ہے، ان میں سے ایک تو کچھ طالب علم ہیں، ان کے علاوہ چند دیگر نوجوان ہیں، کچھ اور لوگ بھی یقیناً پس پردہ کام کر رہے ہیں، جیسا کہ ایسی تنظیموں کا خاصا ہے کہ ان کو فی الحال پردہ میں ہی رہنے دیا جائے۔ طالب علموں میں ایک تو ’’ایم ایس ایف‘‘ ایک ’’کے ایس او‘‘ ایک ’’کے ایس ایف ایم‘‘ اور ایک ’’کے این ایس او‘‘ شاید کئی اور بھی ہوں کیونکہ فطرت انسانی نئی نئی باتوں کا تقاضا کرتی ہے اس لیے ایک ہی مقصد کے لئے اور خاص کر جب اصل مقصد کو پوشیدہ رکھنا ہو تو پھر کئی تنظیموں کی ضرورت پڑتی ہے۔ پاکستان میں بھی کشمیر طلبہ کی ایک دو تنظیمیں مختلف ناموں سے کام کر رہی ہیں بہر حال اس تحریک کا رخ زیادہ تر طالب علموں کی طرف ہے۔ کہیں ’’کشمیر ویلفیئر آرگنائزیشن‘‘ اور کہیں طلبہ کی نت نئی تنظیموں کے نام پر۔ مگر یہ سب ایک ہی نقطہ پر جمع ہو جاتی ہیں یہ لوگ بالعموم کہتے کیا ہیں اور کرتے کیا ہیں؟ اس پر ہی ایک نظر ڈالنے سے اس پوری تحریک کی کافی وضاحت ہو جانی چاہیے خودمختاری کی اس تحریک کے جواز میں اندرونی طور پر تو جو ہوگا سو ہوگا لیکن عام طور پر جو باتیں کی جا رہی ہیں یعنی عوام الناس کے لئے کی جا رہی ہیں وہ تقریباً یہ ہیں:

الف: کشمیری علیحدہ قوم ہیں اس لیے ان کو علیحدہ مملکت کا حق ہے۔

ب: پاکستان کے نام پر غیر ملکی امداد نہیں مل سکتی کیونکہ الحاق کی بات آسانی سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی جبکہ خودمختاری وغیرہ کی بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔

ج: آخر پاکستان اور بھارت کی غلامی کیوں اختیار کی جائے۔

د: ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ خودمختاری کی تحریک سے بھارت کو پریشان کیا جا سکتا ہے۔

ز: سرکاری حلقے جو اس تحریک کی حمایت کرتے ہیں، قطع نظر قادیانی حضرات کے جو بہر صورت اس تحریک کے حامی، بانی یا موجد ہیں، وہ یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ موجودہ صورت میں جو بھی تبدیلی ہو گی وہ بہر حال ہمارے حق میں اور بھارت کے خلاف ہو گی۔

و: ایک اور دلیل جو عام طور پر پیش کی جاتی ہے اور جس سے پاکستان کے اندر بھی بعض حضرات متاثر ہو جاتے ہیں، یہ ہے کہ مرکزی حکومت آزاد کشمیر میں جو بے جا مداخلت کرتی ہے اس کی روک تھام کے لئے ضروری ہے کہ ہم لوگ الحاق پاکستان کو چھوڑ کر خود مختاری کی بات کریں تا کہ حکومت پر ایک دباؤ قائم رہے اور وہ آزاد کشمیر کے ساتھ بہتر سلوک کرے اور مراعات میں اضافہ ہو۔

ہ: کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ الحاق پاکستان کے نعرے پر چلتے ہوئے 37 سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد ہوا نہ کہیں قریب دکھائی دیتا ہے۔

ملک دشمنی کے حربے:

ایک نقطہ نظر ایسا بھی ہے کہ خود کشمیریوں کو کسی ایک عقیدے پر اکٹھا کرنا چونکہ ضروری ہے اور اس میں بھارت اور پاکستان کے ساتھ الحاق کے نام پر بڑی گہری رسہ کشی اور اختلاف ہے اس لیے مناسب یہی ہے کہ کسی تیسری بات پر اتفاق رائے حاصل کیا جائے اور وہ تیسری بات ظاہر ہے کہ خودمختاری ہی ہوسکتی ہے۔ اگر کسی کو اپنے ملک کی تاریخ اور جغرافیہ اچھی طرح معلوم ہو تو ان باتوں کا شافی جواب اور ان کا رد ظاہر و باہر ہے۔ اس کو بھی کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھیں۔ ان سب کو مجموعی طور پر دیکھئے یہ بالکل وہی حربے ہیں جنہیں مشرقی پاکستان میں آزمایا جا چکا ہے۔ وہاں بھی یہی کہا جاتا تھا کہ مغربی پاکستان سے اپنا حصہ وصول کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مخالف دباؤ قائم کیا جائے، اس خیال کو بغیر سوچے سمجھے وہاں بے حد

پذیرائی ملی خصوصیت کے ساتھ نوجوان طبقے میں۔ پھر وہاں بنگالی وغیرہ بنگالی سرکاری ملازمین نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ ہوگیا جو ہوگیا۔ یہاں بھی عین اسی قسم کی باتیں اور بالکل وہی نعرے لگائے جا رہے ہیں۔

آزادکشمیر میں 1961ء کے صدارتی انتخابات میں حکومت نے کھلی دھاندلی کی اور اپنی مرضی کے امیدوار مسٹر کے۔ایچ خورشید کو ووٹوں کی آخری گنتی کے بغیر ہی صدر بنا دیا۔ اس طرح نظریہ الحاق پاکستان پر یقین رکھنے والے لاکھوں افراد کے دلوں پر کاری ضرب لگی۔ دوسری بار جب مسٹر کے۔ایچ خورشید کو پھر مناسب طریقے سے برطرف کیا گیا تو دوسرا طبقہ بھی ناراض ہوا۔ ایسی ہی کئی باتیں ہوئیں جن سے مایوسی اور بددلی پھیلتی رہی اور منفی وتخریبی افکار نہ صرف جنم لیتے رہے بلکہ یہ فضا ان افکار کے لیے زرخیزی مہیا کرتی رہی، پھر جب میری منتخب حکومت کو غیر قانونی اور جبری طور پر ایف ایس ایف کے ذریعہ توڑا گیا تو اس واقعہ کی جذباتی کیفیت کو بھی علیحدگی پسند عناصر نے خوب درخوب استعمال کیا اور مایوسی فضا کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ پھر یہ بات یہاں تک پھیل گئی کہ اگر کسی کو نوکری نہ ملے تو وہ علیحدگی کی بات کرتا ہے، کہ یہ سب کچھ نظریہ الحاق پاکستان کا قصور ہے ورنہ دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہوتیں اور ہر آدمی شاید سرخاب کے پر لگا کر ہوا میں سیر کر رہا ہوتا جیسے آج بنگلہ دیش ہے۔ افسوس ہے کہ ہم نے اس تاریخی المیہ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ارباب اقتدار نے نہ باقیوں نے۔

جب فیلڈ مارشل مرحوم کے دور میں خورشید صاحب کے ''علیحدگی'' کے اس نعرے کو سرکاری پذیرائی ملی تو اس وقت مسلم کانفرنس نے قائد ملت چوہدری غلام عباس مرحوم کی قیادت میں ضرورت محسوس کی کہ (گورنمنٹ) حکومت اور (سٹیٹ) ریاست کے مابین فرق کو لوگوں اور کارکنوں پر واضح کیا جائے ورنہ حکومت کے گناہوں کی سزا اس پوری ملت کو مل سکتی ہے۔ چنانچہ تب سے ہی مسلم کانفرنس کے کارکنوں کو اسی طریعہ پر تربیت دی جا رہی ہے کہ حکومت کی غلطیوں کی سزا حکومت کو ملنا چاہیے نہ کہ ملک و ملت کو اور خود، جیسا کہ مشرقی حصہ میں ہو چکا

ہے۔

نوکر شاہی کا منفی کردار:

اگر ہماری نوکر شاہی کو ذرا بھی خوف خدا ہوتا اور احساس ہوتا کہ ان کی خودغرضی نے ملک میں کس طرح احساس محرومی پیدا کر دیا ہے تو نظریات کبھی اس طرح متاثر نہ ہوتے۔ ایسی بے شمار باتیں نوکر شاہی سے روز مرہ سرزد ہو رہی ہیں جو ان منفی رجحانات کی تقریب کا باعث بنتی ہیں اور یہ بات صرف کشمیر اور آزاد کشمیر کے ضمن ہی میں نہیں بلکہ یہ احساس محرومی پاکستان کے تمام چھوٹے صوبوں کو ہوتا رہا ہے اور اب اپنی انتہا کو پہنچ رہا ہے، ایک عجیب سی مایوسی پیدا ہو رہی ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے اس کی ایک مثال یہ دیکھئے کہ آزاد کشمیر کے لیے میں نے اپنے زمانہ صدارت میں مرکز میں ملازمتوں کا ایک کوٹہ مقرر کروایا تھا جس پر ایک آدھ مرتبہ انہی ایام میں عمل بھی ہوا مگر بعد میں اس کو عجیب طریقہ سے عملاً روک دیا گیا۔ دیکھا گیا ہے کہ اگر ایک سو یا پچاس ملازمتیں خالی ہوں تو ان کو اس طرح مشتہر کیا جاتا ہے کہ ان کا آزاد کشمیر کے ضمن میں کوئی تناسب نہ بن سکے، یعنی پچاس یا سو نوکریوں کو بیک وقت مشتہر کرنے کے بجائے بیس بیس کر کے مشتہر کرتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ان میں تو آزاد کشمیر کی ایک سیٹ بھی نہیں بنتی اس لیے کیا کیا جائے۔ یہی حال چھوٹے صوبوں کا ہے، مرکز میں بیٹھے ہوئے ملازمین کو اپنے عزیز و اقارب ہی کو بھرتی کرنے سے فرصت نہیں ملتی کہ وہ کسی دوسرے کو وہاں داخل ہونے دیں۔ اگرچہ اس نوعیت کے طریقہ کار سے ملک بھر میں مایوسی پھیلتی ہے لیکن ان کو اس کا احساس ہے نہ شعور، آج جس کی کوئی طاقت اور سفارش نہیں ہے اس کا علم وفضل بے کار محض ہے۔ ظاہر ہے کہ منفی رجحانات پیدا کرنے والے عناصر ان ہی باتوں سے تباہی اور بربادی پھیلاتے ہیں۔

بہرحال یہ دلیل کہ حکومت کو منوانے کے لیے منفی نعرے لگائے جائیں بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی عورت خاوند سے کوئی بات منوانے کے لئے خاوند کے دشمن سے دوستی کرنے کی

دھمکی دینا شروع کرے۔ لیکن جن خواتین کو اپنی عزت وحرمت کا احساس ہوتا ہے وہ جانتی ہیں کہ ایسا کرنے میں خاوند سے زیادہ خود ان کی اپنی بے عزتی اور بدنامی ہوتی ہے۔ اپنوں کے ساتھ لڑائی کے طریقے اس سے یقیناً مختلف ہونے چاہئیں جو دشمن کے ساتھ اختیار کیے جاتے ہیں۔ تمام تاریخی تجربات شاہد ہیں کہ جس کسی نے بھی عقائد اور نظریات کے معاملہ میں اس قسم کے تجربات کیے اور ان کو حکمت عملی کی تبدیلی کا نام دیا وہ بالآخر خود اپنے عقائد اور نظریات ہی تبدیل کرنے پر مجبور ہو گیا، پھر کوئی واپسی ہے نہ علاج۔ عقیدہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو مگر اس کے حامل کی اہمیت محض اس عقیدے کے تقدس اور عظمت سے ہوتی ہے جس کا وہ شخص عملی مظاہرہ کرتا ہے اور جب اس میں رخنہ آجائے تو بات ختم ہو جاتی ہے کیونکہ عقیدے اور نظریے کوئی فنی چیز نہیں ہیں کہ جس کا جب جی چاہے اختیار کر لے۔ کسی بھی عقیدے کو حکمت عملی کے طور پر اختیار کرنا ہی پرلے درجے کی منافقت ہے۔ اسی طرز عمل کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا کہ ”واذالقوالذین آمنو قالو آمنا و اذ خلوا الیشیطینھم قالو انا معکم انما نحن مستھزئون“ ترجمہ ”جب مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیاطین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ مسلمان سے تو تمسخر کرتے تھے“۔

اور یہ بھی ضروری نہیں کہ انسان دانستہ منافقت کی راہ اختیار کرتا ہے بلکہ بسا اوقات نفس انسانی میں پوشیدہ منفی افکار اس کا سبب بنتے ہیں۔ کسی بھی عقیدے اور نظریئے کے معاملے میں ایسا طریقہ اختیار کرنا کہ دونوں متضاد سمتوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی قدر مشترک قائم ہو، اپنے آپ کو نہ صرف سنگین آزمائش میں ڈالنا ہے بلکہ خود کو دھوکہ دینا اور ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی داستان اس حقیقت کی بہت واضح دلیل ہے، ایسا وقت آیا تھا کہ وہ واپس آنا چاہتا تھا مگر واپسی کا کوئی راستہ باقی نہ رہا تھا کیونکہ یہ بات اتنی آسان نہیں ہے کہ اس کو محض حکمت عملی کے کھیل تماشے کے طور پر آزمایا جائے۔

مسلمانانِ مقبوضہ کشمیر کا موقف:

پھر ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ جب مقبوضہ کشمیر کا مسلمان جو ایک حد تک خود مختاری کی تحریک کو دباؤ کی حکمت عملی کے طور پر اختیار کر سکتا تھا اور جس کو اس سے کچھ فائدہ بھی ہو سکتا ہے وہ تو اس کا نام نہیں لیتا بلکہ اس کے برعکس وہ سیدھا پاکستان کی بات کرتا ہے، پھر ہمیں کس باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ ہم اس مسلمان کی اخلاقی حمایت کے بجائے ان کو بددل مایوس اور گمراہ کریں۔ کیونکہ یہاں سے خود مختاری کا نعرے لگانے کا فوری مطلب وہاں یہی لیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ جو آزاد ہیں اور پاکستان کے ساتھ ہیں وہ پاکستان سے مایوس ہو گئے ہیں یا پاکستان والے خود ہی چاہتے ہیں کہ کشمیر کا الحاق پاکستان کے ساتھ نہ ہو، یہ بھی ریکارڈ پر ہے کہ ایک عرصہ تک خودمختاری کی اس تحریک کے حامی مقبوضہ کشمیر میں خاص طور پر اور یہاں بھی یہی تاثر دیتے رہے کہ حکومت پاکستان چاہتی ہے کہ یہ تحریک چلائی جائے یہ محض افسانہ بھی نہ تھا کئی شواہد بھی اس کی تائید کرتے ہیں جن کا ذکر آگے چل کر کروں گا۔

خودمختاری والے بعض لوگ تو اس مایوسی کا ذکر بھی کھلم کھلا کرتے ہیں، اندازہ کیجئے کہ اس احساس کا وہاں مقبوضہ کشمیر میں کیسا قیامت خیز اثر ہوتا ہوگا۔ نظریہ الحاق پاکستان کے بارے میں کسی کا یہ کہنا کہ یہ ''کشمیر کی آزادی کے لئے حکمت عملی کے طور پر اختیار کیا گیا ہے'' کشمیریوں کی پوری تاریخ، تحریک اور ان کی قربانی سے مکمل بے خبری اور ان کی قربانیوں کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ الحاق کا جواز ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' سے لیا جاتا ہے۔ حکمت عملی کا جہاں تک تعلق ہے، اس میں دوسری کئی باتیں تو شامل ہو سکتی ہیں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ الحاق پاکستان کو ہم عقیدے اور ایمان کے دائرے سے نکال کر محض حکمت عملی کے ضمن میں لے آئیں۔ ہم لوگ تو اس عقیدے کے مالک ہیں کہ اگر اس امر کا یقین بھی ہو جائے کہ یہ مقصد تبدیل کرنے سے کشمیر کا وہ حصہ جو بھارت کی غلامی میں ہے آزاد ہو جائے

گا، تب بھی ہم آزادی پر الحاق پاکستان کو ترجیح دیں گے چہ جائیکہ ایسی تبدیلی کافر کی ابدی غلامی ہی کی دلیل اور علامت ہو۔

لبریشن فرنٹ کا طرزعمل:

یہ تو اصولی بات تھی۔ آیئے اب ہم ذرا طرزعمل پر بھی نگاہ ڈالیں جو ''لبریشن فرنٹ'' نے یہاں اختیار کر رکھا ہے اور جس کو سمجھنے کے لیے کسی افلاطون کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ طرزعمل کو سمجھنا بھی اس لیے ضروری ہے کہ یہ کسی دعوے کی سب سے بڑی دلیل اور ثبوت ہے، بلکہ آسان یہی ہے کہ عمل کے ذریعہ ہی دعویٰ کرنیوالوں کی نیتوں اور مقاصد کا صحیح ادراک کیا جائے کہ دعویٰ کیا ہے اور عمل کیا ہے۔

دعویٰ اور عمل میں کتنی مطابقت یا مخالفت ہے، وہ کیوں ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوسکتا ہے۔

لبریشن فرنٹ کے بارے میں شیخ محمد فاروق عبداللہ نے کچھ عرصہ پہلے کشمیر اسمبلی میں اپنی ایک تقریر کے دوران کہا تھا کہ یہ تنظیم اس لیے قائم کی گئی ہے کہ آزاد کشمیر کو پاکستان سے نجات دلائی جائے، چنانچہ جو اہم کام اس تنظیم سے آج تک سرزد ہوئے ہیں ان کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ اس تجزیئے کے منطقی نتیجے کے بارے میں، میں کوئی رائے زنی نہیں کرتا، قارئین خود ہی تکلیف کریں۔ میں محض ان واقعات کی نشاندہی پر ہی اکتفا کروں گا۔ یہ بھی یاد رہے کہ لبریشن فرنٹ والے لوگ شیخ محمد فاروق عبداللہ کیساتھ اپنا تعلق بھی بناتے رہے ہیں تا کہ آنکہ فاروق صاحب نے یہ بیان دیا۔

گنگا جہاز کے اغوا کی سازش:

پہلی بات تو یہ ہے اور اس کو دریافت کیا جا سکتا ہے کہ جب سے اس تنظیم نے کام

شروع کیا، اس نے مسلم کانفرنس کو اپنا نمبر ایک دشمن قرار دیا ہے اور اس میں بھی میری ذات سرفہرست رہی ہے۔ دوسرا معروف کام جو انھوں نے کیا گنگا جہاز کا اغوا تھا، اس کے بارے میں بھی آج کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی، وہ راز بھی اب سب پر آشکار ہے۔ بھارت کی ان دستاویزات کا ذکر بھی میں نہیں کرتا جن کے اقتباسات اسلام آباد سے چھپنے والے ایک ہفت روزہ ''مسلمان'' میں شائع ہوئے اور جن کو ہمارے ایک محبّ وطن اور جرأت مند صحافی سعود ساحر نے مہیا کیا اور ترتیب دیا تھا۔ اس واقعہ میں جو خاص بات ہے، اس میں ذرا غور کیجئے۔ جب یہ جہاز آیا تو مجھے اگرچہ اس کی اصلیت کے بارے میں کوئی شک نہیں تھا مگر میں دانستہ خاموش رہا، کیونکہ پوری قوم اس وقت جذباتی رو میں بہہ نکلی تھی اور بھارتی طیارے ''گنگا'' کی طرف آنکھیں لگائے بیٹھی تھی کہ کب اس کی دم سے کشمیر نکلتا ہے۔ لیکن خاموشی کے باوجود پہلی پریس کانفرنس جو ان کے لیڈر نے کی تو بقول مجیب الرحمٰن شامی ''آزاد حکومت کے خلاف ان کے الفاظ سنبھالے نہ جاتے تھے''۔ بھلا یہ بتایئے کہ میں نے یا آزاد حکومت نے کیا قصور کیا تھا؟۔

اگر ان نوجوانوں نے واقعی بہادری کا کوئی کارنامہ کیا تھا تو اچھی بات تھی لیکن میرے خلاف بات کرنے کا کیا محل تھا سوائے اس کے کہ اس کارنامے میں وہ دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ مشرقی پاکستان تو گیا مگر قدرے سخت جان ثابت ہوا، تب میں نے زبان کھولی۔ یہ چور اور چترائی کا کام برداشت کرنا تو بڑی بزدلی تھی اور اپنی ملی ذمہ داری سے فرار اختیار کرنے کے مترادف تھا۔ ہم نے بھی بہادری کے کارنامے کیے ہیں اور دیکھے بھی، لیکن وہ نادر کام نہیں دیکھا کہ کوئی شخص بہادری کر کے آئے تو گاؤں والوں کا قتل عام شروع کر دے، محض اس لیے کہ اس نے بہادری کی ہے مگر یہ محض اتنا معصومانہ فعل نہیں تھا بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبہ کا حصہ تھا جو خدا کے فضل سے اس حد تک تو ناکام ہو گیا، ورنہ مشرقی پاکستان کے ساتھ

آزاد کشمیر کا بھی نمبر آجاتا جو خدا نہ کرے اس ملک کی سلامتی پر آخری اور فیصلہ کن وار ثابت ہوتا۔

اس کے بعد یہ بات افتاں و خیزاں چلتی رہی اور میری صدارت کے دور میں باوجود اس ہنگامے کے، اس طبقہ کو کوئی نمایاں مقام جو وہ چاہتے تھے حاصل نہ ہوا۔ جلد ہی وہ وقت آیا کہ جب میں نے پنجاب یونیورسٹی کے طلباء کو خطاب کیا تو سٹیج سیکرٹری کو پھر یہ کہتے سنا کہ ''ہم سردار عبدالقیوم کو آج یہاں خوش آمدید کہتے ہیں اور فخر محسوس کرتے ہیں کہ جس اسٹیج کو ''گنگا'' والوں نے ناپاک کر دیا تھا سردار قیوم آج اسے پاک کر رہے ہیں''۔

تاہم میں ان لوگوں کے غیظ وغضب کا نشانہ بنا رہا ان کے پاکستانی ہم نوا خاص کر ہم خیال ملازمین نے بھی میرے خلاف سازش سے گریز نہ کیا مگر خدا کا شکر ہے کہ میں اپنا کام بدستور کر رہا ہوں اور خدا توفیق دے کہ تاحیات کرتا رہوں۔

اس واقعہ نے اس پوری قوم کو پاگل بنا دیا تھا، بعض مقامات پر میری اپنی جماعت کے لوگوں نے بھی میرے خلاف جلوس نکالے اور لاہور کے منچلے تو نعرے لگاتے رہے کہ ''سردار قیوم کا سر چاہیے''میں اپنے لوگوں کی نیت پر تو شک نہیں کرتا مگر اس سادگی پر بھی کیا کہیئے؟ ہاں میں اس کی توجیہ بھی کروں گا کہ اس پس منظر میں اہل پاکستان کا وہ والہانہ اور جذباتی لگاؤ تھا جو انھیں کشمیر اور کشمیری قوم کے ساتھ شروع ہی سے رہا ہے۔ اس وقت تو معاملہ بہر حال اس حد تک آکر رک گیا اور اس طبقہ نے بوجوہ اپنی سرگرمیاں زیر زمین کر دیں۔ میں نے گنگا جہاز کے اغوا کی مخالفت اس بناء پر نہیں کی تھی کہ اس میں میرے علم کے مطابق بھارت کا ہاتھ تھا۔ بلکہ اس کی اور بھی نہایت ہی اہم وجوہ تھی جن کا تذکرہ اس وقت ضروری نہیں ہے، تاہم اتنا کہنا بے محل نہ ہوگا کہ اگر اس طیارہ کے اغوا کے پیچھے کوئی سازش نہ بھی ہوتی اور اس کے محرکات بالکل مخلصانہ اور مجاہدانہ ہوتے تب بھی میرے نزدیک یہ فعل ناقابل معافی جرم

تھا اس کی حوصلہ افزائی تو درکنار اس کی اجازت بھی نہیں دینا چاہیے قومی مفادات کی قیمت پر طالع آزمائی کی اجازت کوئی بھی ہوش مند قوم نہیں دے سکتی جب کہ یہ طالع آزمائی تو پورے ملک کی سلامتی کی قیمت پر کی جا رہی تھی۔

مقبول بٹ۔ مقدمہ، پھانسی اور اس کا ردعمل:

پھر تیسرا مرحلہ حال ہی میں آیا جب اس تحریک کے لیڈر مقبول بٹ کو دہلی میں پھانسی دی گئی۔ ان مرحلوں کے درمیان جو عرصہ گزرا ہے وہ تقریباً سارا ہی زیر زمین کارروائیوں کا دور تھا، البتہ جیسا کہ میں کہہ آیا ہوں، محمد حیات خان کے دور صدارت میں ان نوجوانوں کو قدرے کھل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ محمد حیات خان خود، ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ہم سے دشمنی کے باعث یا ان لوگوں کے ساتھ دوستی کے باعث بریگیڈئر محمد حیات خان اس حد تک چلے گئے کہ اس گروہ کے چند لڑکوں کو جب نامناسب حرکات پر ضلع پونچھ میں گرفتار کیا گیا تو انھوں نے محض اس پر اکتفا نہیں کیا کہ ان کی رہائی کا حکم دیں بلکہ بنفس نفیس ''پلندری'' جہاں وہ لڑکے نظر بند تھے، تشریف لے گئے۔ پھر یہ بات بھی معلوم ہے کہ ان کے ساتھ باقاعدہ مذاکرات ہوئے اور ان کی برآمدات کا سرکاری پریس نوٹ جاری کیا گیا۔ اس کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ طلباء نے اپنے نظریات پر کار بند رہنے کے اعلان کے ساتھ ساتھ بریگیڈئر صاحب کی طرف سے سیاست دانوں کے خلاف کی جانے والی کارروائی کی بھی حمایت کا اعلان کیا جو ایک مشترکہ اعلامیہ کی شکل میں کیا گیا۔ اس پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ دوسرے دن ان کو پلندری سے راولاکوٹ اس طرح لایا گیا کہ بریگیڈئر صاحب کی گاڑی کے پیچھے دو گاڑیاں رکھیں اور ''کشمیر بنے گا خودمختار'' کے نعرے لگاتے ہوئے راولاکوٹ تک گئے۔ ہم نے تو یہ بھی سنا کہ صدر صاحب کی سٹیٹ کار پر بھی چاک سے یہی نعرہ لکھا ہوا تھا۔ اس دن کے بعد سے انتظامیہ اس قدر خوفزدہ ہے کہ ان لوگوں سے خود اپنی جان بچانے کی فکر میں

ہے، اس سے ان کو جو کھلی چھٹی ملی ہے اس کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

مقبول بٹ کی قید کے دوران بہت دوڑ دھوپ ہوتی رہی کہ اسے رہا کروایا جائے۔ حکومت پاکستان نے بھی غالبًا بھارت سے درخواست کی اور اگر اس کارروائی کے پیچھے اخلاص کے علاوہ کچھ اور سمجھا جائے، ایسی کارروائیوں میں کوئی بات ناممکن نہیں ہوتی، تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تیاری اس وقت کے لیے ہورہی تھی جب اسے پھانسی دی جائے گی، واللہ اعلم۔

میں اس پر کوئی رائے زنی نہیں کرتا مگر ان معاملات میں کوئی بات بعید از امکان نہیں ہوتی، چنانچہ پھانسی کے وقت کے قریب آنے تک ایک جذباتی فضا بہر حال پیدا کر دی گئی تھی۔ اب ذرا غور اور انصاف سے ملاحظہ کیجیئے کہ دہلی میں اندرا گاندھی کے حکم سے مقبول بٹ کو پھانسی دے دی گئی تو آزاد کشمیر اور پاکستان میں کیا ردعمل ہوا؟ اور کیا ہونا چاہیے تھا؟ یعنی قرین عقل تو یہ ہے کہ اگر مقبول بٹ نے واقعی آزادی کے لیے جان دی تھی تو ہمارے ہاں بھارت کے خلاف غم وغصہ کا اظہار ہوتا۔لیکن یہ تو کسی عقل وفکر اور دانش کی رو سے روا نہیں کہ پاکستان، الحاق پاکستان، پاکستانی پرچم، قائداعظم کی تصویر اور مسلم کانفرنسیوں کے خلاف مظاہرہ کیا جاتا جب کہ ان میں سے کوئی بھی پھانسی کا کسی درجہ میں بھی ذمہ دار تو کیا حامی بھی نہیں تھا۔لیکن دیدہ عبرت نگاہ ہو تو دیکھیے عملاً کیا ہوا۔ میرا یقین ہے کہ پوری قوم تو کیا ایک ادنیٰ حصے کو بھی اس ڈرامے کی خبر نہیں ہے۔

جیسا کہ ہماری عادت ہے کہ ہم اپنے مخالف کی کسی بھی کارروائی پر ہمیشہ چشم پوشی کر کے خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ سب اچھا ہے۔ اب تو وقت یہ آگیا ہے کہ اگر کوئی خطرہ کی نشاندہی کرے تو بجائے خطرہ تلاش کرنے کے نشاندہی کرنیوالے کو ہی برا بھلا کہا جاتا ہے۔ مقبول بٹ کی پھانسی سے قبل لندن میں بھارتی سفارت کار کا قتل بھی ابھی وضاحت طلب ہے کہ آیا اس کا کوئی تعلق مقبول بٹ کی پھانسی کے ساتھ تھا یا نہیں۔ ایسے کئی سوال جواب طلب

ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ محاذ رائے شماری نے خود اس امر کی تحقیق کے لیے کہ آیا یہ قتل مقبول بٹ کے خلاف کوئی سازش تو نہیں تھی، لندن میں ایک کمیٹی قائم کر دی ہے اور ہمارے ایک نہایت ہی معتبر ہفت روزہ ''کشمیر'' کے مطابق مقبول بٹ کے بیٹے نے لبریشن فرنٹ کی چندہ کی نئی اپیل سے لاتعلقی کا اعلان کیا ہے۔ اس سفارت کار ملہوترا کے قتل کی ذمہ داری بھی لبریشن فرنٹ نے خود ہی لے لی تھی۔ اس کا ایک واضح مطلب سمجھ میں آ سکتا ہے کہ یہ کارروائی مقبول بٹ کی پھانسی کو حتمی اور قطعی بنانے کے لئے کی گئی ہو۔

پس پردہ بغض:

تاہم جب مظفرآباد میں ماتمی جلوس نکالا گیا تو تمام سیاسی عناصر ایک ساتھ تھے، لیکن جب ہجوم زیادہ ہو گیا تو اس ماتم کے لیڈر جلد ہی اپنے اصل رنگ میں آ گئے۔ ذرا سنیئے تو اس گروہ نے نعرے کیا لگائے؟ ''پاکستان کا جو یار ہے کشمیر کا غدار ہے، سن لو الحاقیو! ہم تمہاری موت ہیں، جبری ناطے توڑ دو کشمیر ہمارا چھوڑ دو''۔ کئی نعرے تو محض گالی گلوچ پر مشتمل تھے جو یہ لوگ اب بھی لگاتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتے۔

اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ پاکستان کا مقدس ہلالی پرچم ایک ہوٹل کے اوپر سے اتار کر نذر آتش کر دیا گیا، قائداعظم کی تصویر کی بے حرمتی کی گئی اور مسلم کانفرنسیوں کی دکانوں اور مکانوں پر حملے کیے گئے۔ خدارا انصاف کیجئے! یہ سب کچھ کس بات کی غمازی کرتا ہے؟ کیا اس کا کوئی تعلق مقبول بٹ کی پھانسی پر ماتم کرنے سے ہے؟ اس کو پاکستان میں بھی پھانسی دی گئی ہوتی تب بھی اس قسم کے واقعات کا جواز کہاں تھا (چہ جائیکہ اس دن بے چارہ پاکستان تو ہمہ تن ماتم بنا ہوا تھا)۔ قومی اخبارات نے تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے بھی اس پھانسی کو اونچا کرنے کی دوڑ لگا رکھی تھی۔ کشمیر کے بارے میں یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے کہ ہمارے اخبارات نے ایسا کیا ہو، تقسیم ہند سے قبل بھی اس طرح کی ایک صورت حال کا ذکر

چوہدری غلام عباس صاحب مرحوم نے اپنی سرگزشت میں بڑے درد مندانہ انداز میں کیا ہے وہ بھی سبق آموز ہے۔

یہ بھی ملاحظہ ہو کہ اس وقت کے صحافی کون لوگ تھے مولانا ظفر علی خان، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت اور حمید نظامی جیسے نابغہ روز گار لوگ۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس وقت بھی اصلاح احوال کی ذمہ داری مسلم کانفرنس کی تھی اور بفضل تعالیٰ اب بھی ہے۔ضمناً یہ بھی گزارش کروں کہ دوسرے ترقی پذیر ملکوں میں بھی ایسا ہوتا ہوگا مگر ہمارے ہاں کچھ زیادہ ہی ہے، اس کی مجھے جو بنیادی وجہ دکھائی دیتی ہے وہ اس کے علاوہ جو میں نے اس پھانسی کے ضمن میں بتائی ہے، یہ ہے کہ بعض مغربی ممالک میں تو بڑے اخبارات کے ہاں اکثر و بیشتر مسائل پر ایک پورا اور گہرا مطالعہ موجود ہوتا ہے جس کا اہتمام وہ لوگ لگاتار کرتے ہیں لیکن ہمارے ہاں شاید اس کا کوئی اہتمام ہے نہ اس کی اہمیت کا احساس۔ ورنہ کئی دفعہ جو خلاف واقعہ امور کو اتنا بڑھا چڑھا دیا جاتا ہے تو یقیناً وہ نہ ہوتا، یہ کمی محض اخبارات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہماری سیاسی جماعتوں میں بھی بالعموم یہی دیکھا گیا ہے کہ معلومات بہت سطحی نوعیت کی ہوتی ہیں۔خصوصاً مسئلہ کشمیر کے بارے میں تو بالکل یہی کیفیت ہے، اسی کے لگ بھگ حالت ہماری حکومتوں کی بھی ہے وہ بھی آخر ہماری ہی جنس جو ہوئے۔

اب تو یہ خرابی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ اگر یہ کوشش بھی کی جائے کہ کسی اہم قومی مسئلہ پر جیسا کہ کشمیر ہے، صحیح حالات اور واقعات دریافت کیے جائیں تو وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ممکن بھی ہو گا کہ نہیں۔علم کا معیار یوں بھی گر گیا ہے، پھر کردار کا معیار اس سے نیچے ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایسا ذمہ دار شخص دریافت کرنا جو پیشہ وارانہ دیانت و امانت کا امین ہو جس کا مطمع نظر سوائے اس مطلوبہ مقصد کے کوئی اور نہ ہو اور وہ اپنے کام میں ذاتی مفاد اور

پسند و ناپسند کو دخل نہ دینے والا ہو، اگر امر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے اور جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اس لیے بھی کسی مسئلہ پر صحیح رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ خدا کرے کہ ذمہ دار حضرات اس طرف توجہ دیں تا کہ کم از کم کشمیر کے اس اہم قومی مسئلہ پر ہم اس قوم کا رخ کسی ایک طرف موڑ سکیں اور وہ رخ یقیناً ایسا ہونا چاہیئے جو تاریخ، واقعات اور ہمارے قومی مفادات کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ کشمیر ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر محض اپنی طبع آزمائی یا طالع آزمائی کی مشق کرتے رہیں۔ اسے کسی نہ کسی وقت طے ہونا ہے اور خدا نے چاہا تو ضرور ہونا ہے۔

آزاد کشمیر حکومت نے بھی بلا جواز تین دن تک دفاتر بند کر دیئے۔ صدر پاکستان بھی ما شاء اللہ کیوں پیچھے رہتے؟ انہوں نے بھی حق ادا کیا۔ مسلم کانفرنس بھی پہلے مرحلے میں ماتمی جلوس میں شریک تھی اور مجھ غریب سے بھی ابھی کوئی بے ادبی سرزد نہیں ہوئی تھی۔ یہ بھی یاد آیا کہ اس دن کوئی چھ میل دور سے چندلڑکے جو اسی فرنٹ سے متعلق تھے، خاص طور گاڑیوں میں بیٹھ کر میرے گھر کے قریب آئے اور خود مختاری کے نعرے لگا کر واپس چلے گئے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ میرے گھر پر حملہ کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ یہ سب کچھ ہوتا رہا؟۔

پرتشدد مظاہرے اور اخلاق سوز حرکات:

ضلع کوٹلی میں تو لاکھوں روپے کی سرکاری املاک کو نذر آتش کر دیا گیا۔ ایک اور جگہ ہجیرہ میں بعض نوجوانوں نے یہ نعرے لگائے ''اسلام کی گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دو''۔ آخر کس جرم کی سزا میں یہ قیامت برپا ہوئی۔ میں اپنی قوم کی اس جنونی کیفیت پر شاید چپ ہی رہتا مگر جب یہ یقین ہو گیا کہ مقبول بٹ کی پھانسی کا انتقام مجھ سے، مسلم کانفرنس سے اور پاکستان اور اسلام سے لیا جا رہا ہے۔ تب میں نے زبان کھولی اور اپنے نوجوانوں سے کہا کہ ہم اپنے آپ کو ان تخریب پسندوں اور غنڈہ گردی کرنے والوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے،

ہمیں اپنے جان و مال اور عقیدہ کی حفاظت کا خود ہی بندوبست کرنا ہوگا۔

مقبول بٹ کے بارے میں پھر بھی میں نے کوئی گستاخی نہیں کی، البتہ اپنی معلومات کے لیے دریافت کیا کہ وہ کارنامہ کون سا ہے جس پر یہاں اس قدر ہنگامہ ہو رہا ہے؟

آزاد کشمیر حکومت نے پوچھا تو انھوں نے بھی کہا کچھ معلوم نہیں؟ مرکز میں سرکاری لوگوں سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں، کسی نے بہت تیر مارا تو کہا کہ بس دلی میں اسے پھانسی جو ہوئی ہے وہ کافی ہے۔ مقبول بٹ کے حامیوں سے دریافت کیا کہ بھائی تم ہی بتا دو کہ وہ کارنامہ کیا تھا جسے آزادی کے ساتھ منسوب کیا جائے اور مقبول بٹ کو ہیرو مانا جائے۔ ایک تحریک تو ہم لوگ بھی چلا چکے ہیں جس نتیجے میں یہ خطہ آزاد ہوا جسے آزاد کشمیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس لیے یہ سوال کرنا پڑا کیونکہ جو کچھ اس ملک میں مقبول بٹ کے بارے میں معلوم ہوا ہے اس کا کوئی تعلق کسی اعتبار سے بھی آزادی یا خودمختاری وغیرہ سے نہیں بنتا۔ ایک معصوم ہندو دکاندار اور ایک بے گناہ مسلمان بینک منیجر کو قتل کرنا انسانی تاریخ میں نہ تو بہادری کا کوئی کارنامہ ہے نہ اس قسم کی کارروائی کا تعلق آزادی کی کسی تحریک کیساتھ اس سے پہلے سنا ہے۔ چونکہ مقبوضہ کشمیر کے مسلمان اصل صورت حال سے باخبر تھے اس لیے وہاں اس پھانسی کا کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ اس تمام تخریبی کارروائی کو دیکھنے اور سننے کے باوجود ہمارے سیاست کار بھی یہ کہنے میں کوئی حیا محسوس نہیں کرتے کہ سردار قیوم ان لوگوں پر یوں ہی الزام لگا رہا ہے۔ ورنہ یہ سب لوگ پاکستان کی سلامتی چاہتے ہیں۔ اچھا ہوتا اگر سلامتی کے یہ نئے معانی ہمیں سمجھا دیئے جاتے، کیونکہ آج تک کی لغت میں تو یہ معانی موجود نہیں ہیں۔

طوفان بدتمیزی اور حکومت کا تساہل:

ہمارے ارباب بست وکشاد کی عبرت کے لیے اور ہمارے کچھ ''ساون کے اندھوں'' کے لیے ذرا اس واقعہ پر بھی غور کیجیے کہ جب آزاد کشمیر کی سابق فوجی حکومت میں یہ تاثر عام ہو گیا کہ مسلم کانفرنس اور الحاق پاکستان پر یقین رکھنے والے لوگ دب چکے ہیں یا بددل اور مایوس ہو گئے ہیں، تو لبریشن فرنٹ والوں نے مظفرآباد چوک میں ایک جلسہ عام منعقد کیا۔ اس میں اسٹیج سیکرٹری نے ایک دوسرے نوجوان کو تقریر کی دعوت دی۔ جن لوگوں میں ادنیٰ سی قومی غیرت اور احساس باقی ہے، وہ ذرا یہ الفاظ سنیں کہ اس نے اس مقرر کے بارے میں کیا کہا؟ اس نے کہا ''اب آپ کے سامنے فرزند کشمیر اور پاکستان کا سب سے بڑا دشمن ہاشم قریشی تقریر کرے گا''۔

اس وقت مقامی انتظامیہ کے لوگ جو اسی ملک کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں وہ بھی موجود تھے مگر کسی کی رگ حمیت نہ پھڑکی، ہاں صرف ایم ایس ایف کے چند نوجوان اس بے غیرتی کو برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے اسٹیج پر ہلہ بول دیا اور وہ جلسہ درہم برہم ہو گیا۔ ایم ایس ایف کے ان نوجوانوں کو داد ملی کہ ان کے خلاف مقدمے دائر کر دیئے گئے۔ کیا یہ کچھ بعید ہے کہ اگر ایم ایس ایف کے یہ نوجوان جو حکومت کے غیظ وغضب کا بھی نشانہ بنے ہوئے تھے، اس وقت خاموش رہتے تو بعد میں پورا آزاد کشمیر اس غنڈہ گردی اور تخریب کاری کی لپیٹ میں ہوتا۔ اگر کوئی فرضی سیاست دان ان لڑکوں کی حمایت کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ لوگ تو محبّ وطن ہیں مگر سردار عبدالقیوم یوں ہی ان پر الزام لگاتا ہے تو بتایئے کہ ہم کیا کہیں، خدا ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔ ان سیاستدانوں کی سیاست اور حب الوطنی دونوں ہی سمجھ سے باہر ہیں۔

دوسری طرف انتظامی مشینری کی حالت دیکھیے کہ ان لوگوں نے بدنیتی سے یا اپنی جان بچانے کے لیے ان سب واقعات کو غلط قرار دیا۔ ان کی رپورٹ یہ ہے کہ وہ پرچم پاکستان کا نہیں تھا بلکہ مسلم کانفرنس کا تھا اور قائداعظم کی تصویر کی بے حرمتی بھی نہیں ہوئی، نہ

جلسہ میں کسی نے پاکستان دشمنی کی بات کی ہے۔ دیکھئیے کس طرح ان عناصر کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی ہوتی ہے بلکہ اس جلسہ کے بارے میں سرکاری ملازمین نے حکومت کو یہ رپورٹ دی کہ مسلم کانفرنس والے ہی غنڈہ گردی کرتے ہیں جس سے پاکستان اور نظریہ الحاق پاکستان بدنام ہو رہا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے ہمارے بعض ملازمین کی حب الوطنی اور اہلیت۔ آزادی کی وہ تحریک جو ہم نے چلائی تھی وہ تو ایک مقدس جہاد تھا ہم نے کسی غیر مسلم کو بھی بے گناہ قتل تو درکنار کوئی ادنیٰ اذیت بھی نہیں پہنچائی۔ چند بے گناہوں کے قتل کو بہادری اور آزادی کی تحریک کا نام دینا بھی پوری انسانیت کے ساتھ ظلم ہے۔

بہر حال وہ تو ایک علیحدہ داستان ہے لیکن ہمارے سوال کا جواب دینے یا سمجھانے کے بجائے ان لوگوں نے ہم سب کو غدار کہنا شروع کر دیا اور مغلظات پر اتر آئے۔ بتائیے کہ ان حالات میں کیا ہم اپنی مدافعت بھی نہ کریں؟ اور اس علاقہ میں جو ہماری بے مثال قربانیوں سے آزاد ہوا، ہمیں عزت کے ساتھ رہنے کا حق بھی نہیں ہے۔ کیا ہم اس سرزمین پر ایسے نظریات کو پھلنے پھولنے کا موقع دیں جن سے ہم اور ہماری آئندہ نسلیں اپنے قومی اور اسلامی تشخص اور پورے تاریخی ورثے سے محروم ہو کر غیر مسلموں کی ابدی غلامی میں چلے جائیں؟

ان نوجوانوں کے پاس ہماری اطلاعات کے مطابق اور وہ اطلاعات کوئی فرضی قصے نہیں ہیں، حکومت کے بھی علم میں ہیں، غیر ملکی اسلحہ موجود ہے روپیہ کی کوئی کمی نہیں ہے، لٹریچر باہر سے چھپ کر آتا ہے، پھر بھنگ، چرس اور ہیروئن سے ان کے تھیلے بھرے ہوتے ہیں غرضیکہ وہ تمام اسباب جن سے قوموں کے اخلاق اور آزادی کے جذبہ کو تہہ و بالا اور تباہ کیا جاتا ہے، ان کے پاس وافر مقدار میں موجود ہیں مگر شاید حکومت اس بات پر خوش ہے کہ سردست اس بات کا رخ صرف سردار عبدالقیوم اور مسلم کانفرنس کے خلاف ہے، حکومت کے

خلاف نہیں ہے۔ طرفہ تماشا یہ بھی دیکھیئے کہ پاکستان میں مسلم کانفرنس کے دفاتر تو بند ہیں مگر لبریشن فرنٹ کے دفاتر کھلے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔

اس تمام خرابی میں ایک اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ ایک طرف بھارتی حکومت ہمارے خلاف حیلے بہانے تلاش کر کے انھیں الزام کی شکل میں پیش کرنا چاہتی ہے تو دوسری طرف کیا یہ کارروائی بھارت کو ایک عملی جواز مہیا نہیں کرتی؟ اگر ہماری حکومت کی منشاء سے ایسا ہو رہا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے ذریعے دو شکار کرے، ایک تو ہمیں اس راستے سے ہٹا دے کہ الحاق پاکستان کے لئے کام کرنے والی کوئی مؤثر تنظیم باقی نہ رہے اور دوسرے بھارت کو کشمیر سے نکال دے۔ کتنا خوبصورت خواب ہے، اگر ایسا ہے تو اس کا پریشان ہونا کچھ دور نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر حکومت پاکستان کی منشاء کے خلاف ایسا ہو رہا ہے جو پاکستان کو بلاوجہ خطرات میں ڈالنے کی کوشش ہے تو پھر حکومت پاکستان کا تغافل ناقابل فہم ہے۔ خط متارکہ جنگ کی اس قسم کی تحریک کی اجازت دینا ہی گویا مقبوضہ کشمیر کے اس مسلمان کے منہ پر چپت ہے جس کا نعرہ اب بھی یہ ہے ''ہم کو نہیں چاہیے انڈی پنڈی ہم کو چاہیے راولپنڈی''۔ انڈی پنڈی سے مراد انڈی پنڈنسی یعنی خودمختاری ہے، یہ تو ان کو آخری مایوسی سے ہم کنار کرنا ہے۔ اس کے نتائج بھی پھر سامنے ہونے چاہئیں۔

سرکاری اور غیر سرکاری عمارتوں پر، آزاد کشمیر کے مختلف اضلاع میں سڑکوں کے کنارے، دکانوں، مکانوں اور درودیوار پر کیا نعرے لکھے ہوئے ہیں؟ کیا آزاد کشمیر میں ان نعروں کی گنجائش ہے؟ کیا کوئی باغیرت قوم اس کی اجازت دے سکتی ہے۔ اس کے باوجود کچھ سیاستدان بدنیتی یا نیک نیتی سے محض ان عناصر کی حوصلہ افزائی اور حمایت حاصل کرنے کے لئے اب بھی فرما رہے ہیں کہ سردار قیوم ان عناصر پر غلط الزام لگاتا ہے۔ بلکہ دھمکیاں دے رہے ہیں کہ اگر سردار قیوم نے ان عناصر پر یہ الزام بازی بند نہ کی تو ہم یعنی یہ (سیاستدان)

کھل کر ان عناصر کی حمایت کریں گے۔ ''انا للہ و انا الیہ راجعون''

یہ ہے وہ قومی سیاست جس کا مظاہرہ ہمارے بعض سیاست دان کر رہے ہیں۔ بہر صورت خودمختار کشمیر کا نعرہ مفید ہے یا غیر مفید یا قابل عمل ہے کہ نہیں، یہ بحث طلب امور ہیں اور تفصیلی گفتگو چاہتے ہیں۔ لیکن خودمختاری اور کشمیر کی آزادی کے نام پر یہ عناصر عملاً کیا کر رہے ہیں، اس کا کافی اندازہ ان واقعات سے ہو جانا چاہیئے۔ یہ واقعات بھی کوئی ماضی بعید کے قصے نہیں ہیں بلکہ بہت قریب اور حال کے ایسے ناقابل تردید واقعات ہیں جن سے قوم کے اکثر باشعور لوگ باخبر ہیں۔ ان واقعات کی بنا پر اگر ان عناصر کے مقاصد کو پرکھا جائے تو اس کے نتیجے میں دورائیں نہیں ہوسکتیں۔ جہاں تک بعض مرتبہ ان لوگوں کے بیانات کا تعلق ہے کہ یہ لوگ دراصل پاکستان کے مخالف نہیں ہیں۔ اگر ان بیانات کو ایک طرف سچا مان لیا جائے تو دوسری طرف ان حضرات کے عمل کی پھر کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آسکتی، پاکستان کی حمایت میں بھی سب لوگ بیان نہیں دیتے، محض کچھ لوگ ہیں جن کو غالباً دانستہ کسی مصلحت کے لیے کام پر مامور کیا گیا ہے تاکہ اصل مقاصد پر پردہ پڑا رہے۔ یہ بھی ایک قسم کا چھپاؤ (کیمو فلاج) ہے۔

قوت برداشت اور مزاحمت:

اس پر بھی غور کیجیے کہ خودمختاری کا نعرہ جب تک محض اصول کی حد تک رہا تو اگرچہ ہمارے لیے وہ قابل قبول رہا لیکن ہم نے اس بارے میں کبھی شدید موقف اختیار نہیں کیا، ان کی گالی گلوچ بھی خندہ پیشانی سے برداشت کی اور ان کو شک کا فائدہ دینے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ لیکن جب ان دلفریب اور جاذب خیال الفاظ اور محاوروں کی آڑ میں کوئی ایسا ڈرامہ ہونے لگا جس سے ہماری جان، مال، عزت، آبرو، مذہب اور آزادی سب کو خطرہ لاحق ہو گیا، تو پھر ہمارے لیے کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا، ہم یا تو اپنے آپ کو اس غنڈہ گردی کے

سپرد کر دیتے، ان کا ساتھ دیتے، اپنے نظریات، آزادی، اپنی جان و مال، غیرت وحمیت اور عزت و آبرو سے دستبردار ہو جاتے یا ان کا مقابلہ کرتے۔ ساتھ رہنے کا مطلب تو یہ ہوگا جو حضورﷺ نے قیامت کی علامات میں سے بتایا ہے۔ یکرم الرجل مخافة شرہ۔ ترجمہ: ''لوگ بروں کی عزت ان کے شر سے بچنے کی وجہ سے کریں گے'' اور حکم فرمایا کہ برائی کو ہاتھ سے دفع کرو، وہ نہ کرسکو تو زبان سے کرو اور وہ بھی نہ کرسکو تو دل سے ہی اسے برا مانو اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

ارادہ تو یہی ہے کہ اگر خدا توفیق دے تو اس برائی کا مقابلہ ہاتھ اور زبان دونوں سے کیا جائے، نتیجہ خدا کے سپرد ہے۔ نظریات اور جان و مال، عزت و آبرو سے دستبرداری تو بدترین موت ہے۔ زندگی میں خدا کی راہ میں اتنا کچھ کر گزرنے کے بعد اب ذلت کی موت مرنا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ یوں بھی جن لوگوں نے اس علاقہ کو آزاد کرایا ہے، اس کی آزادی کو برقرار رکھنا بھی زیادہ تر ان ہی کی ذمہ داری ہے اور وہ لوگ ظاہر ہے ہم ہی ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے ہم کوئی نااہل اور بزدل بھی نہیں ہیں۔ پروردگار کی مشیت کا تو کسی کو علم نہیں، مگر یہ سب لوگ مل کر بھی ہمیں صراط مستقیم سے نہیں ہٹا سکتے، تاہم ہم فتنے کو معمولی بھی نہیں سمجھتے، خدا سے توفیق کی امید رکھتے ہیں کہ وہ ہماری امداد فرمائے گا۔ آمین۔

نیتوں کا اندازہ لگانا اگرچہ مشکل ہے مگر لوگوں کے اعمال کو بھی نیتوں کا بیرومیٹر بنایا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ کشمیر کو آزاد کرانا چاہتا ہے، خواہ وہ خودمختاری یا کچھ اور تو عقل و دانش کے کسی بھی قرینے سے اسے مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کی ہمدردی بلکہ معاونت چاہئے اور پھر اہل پاکستان کی دلی ہمدردی تو ایک ناگزیر امر ہے، بلکہ یہ مسئلہ ایسا ہے جس پر دوسرے ممالک کے لوگوں کی ہمدردیاں بھی ضروری ہیں، لیکن یہ کون سی آزادی اور خود مختاری ہے کہ جس کے لیے آزاد کشمیر میں لڑائی کی جائے، مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کی خواہشات کی بھی

مخالفت کی جائے اور خود پاکستان اور اہل پاکستان کی نہ صرف مخالفت بلکہ ان کے مفادات کو بھی نقصان پہنچایا جائے۔ کیا اس طریقہ واردات سے کوئی بھی بامقصد اور مثبت تحریک چل سکتی ہے؟ چلنا تو درکنار وہ اس قسم کے خیالات لیکر معرض وجود میں ہی نہیں آسکتی۔ بشرطیکہ مقصد کشمیر کی آزادی ہو اور اگر مقصد کشمیر کو بدستور کافر کا غلام رکھنا ہو یا بھارت کو آزاد کشمیر پر حملہ کی دعوت دینا ہو تو پھر یہ سب کارروائی جائز درست اور بالکل صحیح رخ پر ہے۔ اللہ ملک و ملت کو اس فساد سے محفوظ رکھے اور محبّ وطن عناصر کو توفیق دے کہ وہ اس برائی کا مقابلہ کرسکیں۔ آمین ''اللھم انصر الاسلام و المسلمین''

خودمختاری کے دلکش نعرے اور خوش فہمی:

بعض لوگ جو نیک نیتی سے ان منفی نعروں کو محض حکمت عملی کی تبدیلی کا نام دے کر خوش فہمی کا شکار ہونا چاہتے ہیں، ان کی خدمت میں اتنی گزارش کرتا ہوں کہ کشتی کے فن میں ایک معروف داؤ ہے جس سے اس داؤ کے لگانیوالے کی اپنی پشت خود بخود لگ جاتی ہے، مخالف کو تکلیف نہیں کرنا پڑتی اگر اس تمام کارروائی کو آنکھیں بند کر کے اور واقعات کے خلاف نیک نیتی پر ہی محمول کیا جائے اور حکمت عملی کی تبدیلی کا نام دیا جائے تب بھی اس سیاسی کشتی میں بھارت کے مقابلے میں یہ نعرے بالکل اسی داؤ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہمارے کچھ افلاطون ان نعروں سے بھارت کو پریشان کرنے کے خیال میں اپنے زمانے کے شیخ چلی ہیں، اللہ ان حضرات کو حالات کی صحیح سمجھ عطاء فرمائے۔ میرے علم کی حد تک ایسا مشورہ دینے والے زیادہ تر سرکاری ملازمین ہیں اور ان ملازمین میں بھی بدقسمتی سے کچھ ایسے لوگ ہیں جو نظریئے کی پختگی اور بصیرت سے محروم ہیں، کچھ وہ ہیں جو بھارت سے خوفزدہ ہیں، ہر مادہ پرست کا یہی حال ہوتا ہے۔ ان کا یقین خدا کے اس ارشاد پر نہیں ہوتا کہ اونتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔

کچھ وہ ہیں جو کشمیر کے بارے میں ایک دیرینہ آرزو اور ایک خاص منصوبہ رکھتے ہیں لیکن بھارت کے ماہرین نے وہی بساط انھی پر الٹ دی ہے، اس کا مداوا بھی تو تلاش کریں وہ بے چارے کیا کریں گے؟ یہ تو گھر کے اصل مالکوں کی ذمہ داری ہے۔ مجھے امید ہے کہ مسلم کانفرنس کے کارکن خدا کے فضل و کرم سے اس ذمہ داری سے بھی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوں گے۔

نظریہ الحاق پاکستان اور ''بے بس اکثریت'':

الحاق پاکستان کو ماننے والے ہمارے علاوہ یقیناً اور لوگ بھی ہیں مگر بعض لوگ یہ بہانہ بناتے ہیں کہ یہ نعرہ چونکہ مسلم کانفرنس کا ہے اس لیے لازمی ہے کہ وہ نعرہ ایجاد کریں۔ یہ رجحان بھی ایک طرح سے ایک منفی مرض ہے، پھر یہ کہ بعض عناصر یقیناً اس نعرے کو پسند تو کرتے ہوں گے مگر وہ اس کی اشاعت کے لیے اور اس کے مخالفوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں گویا ان کے نزدیک اگر کشمیر پاکستان بن جائے تو وارے نیارے، نہ بنے تو وہ بے چارے۔ غالباً یہی لوگ نکس کی ''بے بس اکثریت'' کا حصہ ہیں۔ ہم لوگ تو بہر حال نہ اس پر کوئی سودے بازی کر سکتے ہیں، نہ اپنی زندگی میں اس کے خلاف کسی نعرے پر خاموشی اختیار کر سکتے ہیں۔

ہمارا فرض:

جو قربانیاں الحاق پاکستان کے نعرے پر دی گئی تھیں ان کی مثال لانا ناممکن نہ سہی، اس کے قریب ضرور ہے۔ پھر یہ کیا منطق ہے کہ یہ نعرہ صرف مسلم کانفرنس کا ہے۔ جب یہ نعرہ لگایا گیا تھا یعنی 19 جولائی 1947ء کو تو اس وقت صرف دو ہی مکتب فکر تھے ایک شیخ محمد عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کا کہ کشمیر کا الحاق بھارت سے ہونا چاہیئے تو دوسرا رئیس الاحرار چوہدری

غلام عباس کی مسلم کانفرنس کا کہ ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہونا چاہیئے اور یہی وہ موقف ہے جس پر پوری ملت کا اتفاق رہا ہے، اسی کو قائداعظم نے اپنایا اور پوری قوم آج تک اصولاً اسی موقف پر قائم ہے۔ سلامتی کونسل میں بھی ہمارا مقدمہ اسی موقف پر مبنی ہے۔ اسے تبدیل کرنے یا اس سے لاتعلق ہونے یا اسے کمزور کرنے کا نتیجہ کیا ہوسکتا ہے وہ کسی بھی ایسے شخص سے پوشیدہ نہ ہوگا جسے ملی و سیاسی شعور ہے اور ملک و ملت کے سیاسی معاملات کو سمجھتا ہے۔ اس نعرے کے دوسرے نفع و نقصان تو اس کے علاوہ ہیں نفع تو ابھی تک میرے علم میں نہیں آیا ورنہ میں اس کا ذکر بھی کر دیتا۔ وسط دریا میں گھوڑے بدلنے والے ڈوبتے ہی دیکھے گئے ہیں۔ ہاں اگر ارادہ ہی ڈوبنے کا ہو تو کیا علاج؟ آخر خودکشی بھی تو لوگ ہی کرتے ہیں۔

اس مختصر مگر واقعاتی اور تقابلی تجزیئے سے یہ بات واضح ہو جانی چاہیئے کہ پاکستان کی دفاعی سرحد خطہ آزاد کشمیر کس قسم کے سنگین خطرات میں گھری ہوئی ہے اور اس پر حکومت کی چشم پوشی یا خاموشی ہی سہی وہ کتنی پریشان کن اور ڈراوٴنی ہے۔ پاکستان میں بیٹھے ہوئے بعض نیک اور سادہ لوگ جو کشمیر کے ساتھ محض ہمدردی رکھنے کی وجہ سے ایسے خطرناک فتنے کی حمایت کر رہے ہیں یا خاموش ہیں ان کے لئے بھی یہ لمحہ فکریہ ہے اور اس صورتحال کو مزید سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس تجزیئے سے ان تمام تحریکوں کی اصل اور ان کا نفع و نقصان اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیئے۔ جو الحاق پاکستان کے علاوہ نئے نئے اور جاذب خیال نعروں کی صورت میں آئے دن پیدا کی جا رہی ہیں اور ہماری غفلتوں کی گود میں پرورش پا کر ہماری ہی گردن کے درپے آزاد ہیں۔

یہ تاریخی حقیقت تبدیل نہیں ہوئی۔ یہ جو تاریخ میں بعض واقعات سے دکھائی دیتا ہے کہ پسپائی کو بطور حکمت عملی اختیار کیا گیا تو وہ صرف اس لیے حکمت عملی کہلائی کہ اس کے نتیجے میں کامیابی ہوئی، ورنہ وہ بھی بزدلی اور شکست میں ہی شمار ہوتی۔ آج ہم لوگ اور مشرقی

پاکستان کے محبّ وطن افراد جو مرضی ہے توجیہ کریں، لیکن وہ سانحہ تاریخ میں ہماری نالائقی، بزدلی اور شکست ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ خواہ ہم بھٹو صاحب کو مورد الزام ٹھہرائیں یا بنگلہ دیش میں پاکستان کی ہاکی ٹیم سے گلے لگیں، حقیقت، حقیقت ہی رہے گی۔

اب میں دوسری سیاسی جماعتوں اور عناصر کا ذکر بھی کرتا ہوں تا کہ اس صورت حال کا وہ پہلو تو عام وخواص کو معلوم ہو جائے جو میری معلومات تک محدود ہے۔ کوشش تو میری یہی ہے کہ سیاست کے اندرونی اور بیرونی خدوخال سب واضح کر دیئے جائیں تا کہ موجودہ صورت کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ اس میں کسی پر کوئی تنقید یا کسی کی تنقیص مقصود نہیں ہے، نہ کسی کی نیت زیر بحث ہے بلکہ محض ایک نقطہ نظر اور ایک صورت حال واضح کرنا ہے۔ اس ضمن میں ایک اور گزارش باقی ہے، جیسا کہ میں نے کہا کہ مسلم کانفرنس کے علاوہ دوسری جماعتیں افراد اور عناصر بھی یقیناً ایسے ہیں جو ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ چاہتے ہیں، مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اس میں مسلم کانفرنس کا ایک امتیاز تو یہ ہے کہ ہم الحاق کے انتظار میں نہیں بیٹھے ہوئے ہیں بلکہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عملی اقدامات پر یقین رکھتے ہیں۔ ان عملی اقدامات کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس نقطہ نظر پر دل و جان سے قائم ہیں اور اس میں کسی قسم کی لغزش کو راہ نہیں ہے۔ اسی طرح ہم اس کے فوائد سے بھی عام و خاص کو آگاہ کرتے ہیں بلکہ اس نظریئے کی ایک طرح کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ اس مقدس نصب العین اور نظریئے کے خلاف جو اندرونی اور بیرونی تحریکیں وقت کے ساتھ ساتھ اٹھ رہی ہیں یا جو سازش کے ذریعے اٹھائی جا رہی ہیں، ان کا بھی مقابلہ ہمیں ہی کرنا ہے۔ یہ اپنے حق میں کوئی تعلّی ہے، نہ دوسرے پر الزام، لیکن دوسری کسی جماعت کے کردار میں یہ خصوصیت ابھی تک دکھائی نہیں دیتی۔

مسلم کانفرنس کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ الحاق پاکستان کے تمام مخالف صرف مسلم

کانفرنس ہی کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ ان کا تمام تر غصہ اور ناراضگی صرف ہم پر ہے، کسی دوسرے شخص کو وہ ایک لفظ بھی نہیں کہتے جب کہ میری ذات کو، میرے جماعتی ساتھیوں کو اور پوری مسلم کانفرنس کو بدترین دشمن قرار دیتے ہیں اور کوئی ایسا غلیظ لفظ نہیں جو ہمارے خلاف استعمال نہ کرتے ہوں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے، ہم نے تو ان میں سے کسی ایک فرد کا بھی کوئی نقصان نہیں کیا، نہ ہم نے ان سے کوئی دشمنی کی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس پورے ملک میں صرف ہم ہیں کہ ان کی نظر میں قابل نفرت ہیں اور ہر قسم کی گالی گلوچ کے مستحق ہیں۔

میں تو جلسوں میں بھی کہتا رہتا ہوں کہ اگر الحاق کے مخالف، جن کا قبلہ بالکل دوسری سمت ہے، وہ ہمیں اس طرح دشمن نہ سمجھتے تو مجھے بھی اپنے کردار میں شک ہوتا۔ گویا ان لوگوں کا یہ طرزِ عمل ہمارے لیے صحیح راستہ پر ہونے کی ایک واضح سند کی حیثیت رکھتا ہے اور اس پر ہمیں فخر ہے۔ حق و باطل کی آویزش کا نکھار بھی اسی راستے سے ہوتا رہا ہے حتیٰ کہ انبیائے علیہم السلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اس میں استقامت عطا فرمائے اور لغزشوں سے محفوظ رکھے۔ آمین!

صدر آزاد کشمیر پر مسلم کانفرنس کی حمایت کا الزام اور اس کے اسباب:

اس سے قبل کہ میں دوسرے سیاسی عناصر کے بارے میں کچھ کہوں، ایک اور پہلو کا ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آج بعض لوگوں کی طرف سے الزام لگایا جاتا ہے کہ ریٹائرڈ جنرل عبدالرحمٰن کی حکومت مسلم کانفرنس کی مدد کر رہی ہے اور اس لیے وہ جانبدار ہے۔ اس کا ذکر اس لیے نہیں کر رہا کہ مجھے اس غلط الزام کی تردید کرنا ہے بلکہ اس میں ایک بنیادی اصولی امر ہے جس کے بارے میں گفتگو کرنا ضروری ہے۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ جنرل صاحب کو جب صدر بنایا گیا تو ہم چار جماعتی اتحاد والے لوگ بالعموم اور مسلم کانفرنس کے لوگ بالخصوص قید میں تھے۔ ہم میں سے کسی کے ساتھ کوئی مشورہ نہیں ہوا۔ تاہم نہ صرف

ہم لوگوں نے بلکہ سب ہی سیاسی عناصر نے ان کی تقرری کی تائید وحمایت کی، البتہ محمد حیات خان چونکہ سب سے زیادہ ہمارے مخالف تھے، جیسا کہ ابھی تک ہیں اور ان کو ہماری تحریک کی وجہ سے ہی نکلنا پڑا تھا اس لیے اس تبدیلی کا اچھا اثر بھی قدرتاً ہمارے ہی حق میں زیادہ ہوسکتا ہے۔ لیکن عملاً جو صورت ہے، وہ کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے اور اس پر بحث کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

موجودہ صدر صاحب نے تو ہر سیاسی شخصیت کے ساتھ ہمدردانہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے اور کوشش یہی کی ہے کہ کسی کو ناراض نہ کیا جائے۔ ہمارا ان کے ساتھ دو طرح سے تعلق نسبتاً زیادہ ہو گیا بلکہ تین طرح سے، ایک تو یہ کہ وہ کھل کر نظریہ الحاق پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مسلم کانفرنس کے سابقہ ادوار میں سب سے بڑھ کر زیادتی ہوئی تھی اور ہمارے ساتھ ہمدردی رکھنے والوں کے مسائل بھی سب سے زیادہ تھے۔ چنانچہ ہمیں صدر صاحب اور حکومت کے دوسرے اہلکاروں کیساتھ قریبی رابطہ رکھنا پڑا۔ لیکن حکومت نے کہیں بھی ہمارے ساتھ ترجیحی بنیادوں پر ایسا سلوک نہیں کیا جس کی شکایت ہو۔ جس نے بھی کوئی جائز بات حکومت کو بتائی انھوں نے کرنا چاہی ہوگی۔ تیسرے یہ کہ اسی دور میں جو بلدیاتی انتخاب ہوا اس میں مسلم کانفرنسیوں کی بھاری تعداد منتخب ہوگئی۔ تین ضلعی چیئر مین تو جماعت سے تعلق رکھنے والے حضرات منتخب ہو گئے جب کہ چوتھے بھی جماعت کی حمایت سے منتخب ہوئے وہاں بھی اکثریت جماعت کی ہے لیکن اس میں حکومت کا کوئی ادنیٰ سا تعلق بھی نہیں تھا بلکہ حکومت کی اطلاعات تو اس نتیجہ کے برعکس تھیں۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس الزام تراشی کی اصل وجہ کیا ہے؟ میں بعض دفعہ اپنے تجاہل سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہوں، جب حکومت کے ساتھ اختلاف ہوتے ہیں تو ہمارے مخالف سیاسی کارکن ہمارے بہت قریب ہوتے ہیں بلکہ اگر کبھی میں نے مرکزی حکومت کے خلاف کوئی سخت بیان دیا یا تقریر کی تو ہماری مخالف جماعتوں کے معروف کارکن دوڑ کر میرے پاس آئے اور میرے بیان کی بے حد تعریف کی، اور بعض تو

پھولے نہ سماتے تھے۔ ان ہی دنوں وہ لوگ پس پردہ مرکز کے قریب ہونے کے لئے شب و روز دوڑتے رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان دنوں وہ لوگ ہماری تعریف احتراماً کرتے رہتے ہیں۔ بعض سادہ لوح مسلم کانفرنسی اس پرخوش ہوتے ہوں مگر ہمیں تو اصل حقیقت کا علم ہوتا ہے، اس لیے لطف لیتے رہتے ہیں۔

سیاسی چور دروازے:

آزاد کشمیر کی سیاست کا سرسری مطالعہ کرنے سے ہی معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے ہاں بعض لوگ سیاست میں ہمیشہ چور دروازے کی تلاش میں رہتے ہیں انھوں نے کچھ بھی حاصل کیا، وہ انہی راستوں سے حاصل کیا۔ براہ راست سیدھی سیاست والے لوگ کم ہی ملیں گے۔ وہ چور دروازہ کیا ہے؟

بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ چور دروازہ ''مرکزی حکومت اور مسلم کانفرنس کے مابین اختلافات اور کشیدگی ہے''۔ چنانچہ لوگوں کی یہ خواہش اور کوشش رہی ہے کہ کسی نہ کسی صورت یہ اختلافات کبھی کم نہ ہوں بلکہ اس میں جتنی شدت ہو سکے، پیدا کی جائے۔ یہ کام مشکل بھی نہیں ہے کیونکہ حکومت کی کمزوریاں بھی معلوم ہو جاتی ہیں اور ہماری بھی۔ حکومت کی چونکہ کوئی قومی پالیسی تو ہوتی نہیں ہے اس لیے بات محض ذات اور شخصیات پر آجاتی ہے۔ ہر بات کو ذاتی انا کا مسئلہ بنا لیا جاتا ہے جو کسی بھی حکومت کی سب سے بڑی کمزوری بن کر رہ جاتا ہے، اس لیے اس سے استفادہ کرنے والوں کی راہیں اور بھی آسان ہو جاتی ہیں۔

اس طرح ہماری بعض کمزوریاں ہیں جو قابل اصلاح نہیں ہیں۔ ہم اصولوں پر سودے بازی نہیں کر سکتے، عوامی مفادات کو فروخت نہیں کر سکتے، کشمیر پر کسی قسم کی پسپائی قبول نہیں کر سکتے، غرضیکہ ہم ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہیں کر سکتے جو اقتدار پرست سیاستدانوں کا مذہب ہو، اس لیے کسی بھی حکومت کے ساتھ ہمارے تعلقات پوری طرح ایک

رنگ کبھی نہیں ہو پاتے، اس لیے یہ کوئی مشکل نہیں ہے کہ ہمارے بارے میں کسی بھی حکومت کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جائے۔

اس معاملہ کا ذکر کرنے سے غرض یہ نہیں ہے کہ اپنی یا حکومت کی برات ثابت کی جائے نہ اس کی کوئی ضرورت ہے، اس کی اصل وجہ بتانا مقصود ہے۔ اس میں دو اہم بنیادی سیاسی اصول یا عمل کارفرما ہیں۔ ہمارے لوگوں کو ان کے بارے میں صحیح علم ہونا چاہیئے۔ وہ یہ کہ اس الزام تراشی کی اصل وجہ کیا ہے اور کیا اصولی طور پر یہ بات درست بھی ہے؟ چنانچہ بعض لوگ حکومتوں کی تعریف کرتے ہیں لیکن ملک وملت کی ایسی تیسی کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کئی حکومتیں ان ہی حقیقی دشمنوں پر بھروسہ کرنے لگ جاتی ہیں۔ یہ لوگ بظاہر حکومت کے حامی بن جاتے ہیں مگر درپردہ بدترین مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ پھر ان کو اس قماش کے کچھ لوگ سرکاری عہدوں پر فائز بھی مل جاتے ہیں، تو اس ملی بھگت کے ذریعہ وہ مقربین خاص میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مسلم کانفرنس چونکہ کسی حادثے یا سیاسی مصلحت کی پیداوار نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی عمل کا فطری نتیجہ ہے، اس لیے اس کا اپنا ایک مزاج ہے جس میں تبدیلی شاذ و نادر ہی ہوسکتی ہے۔ ہمارا ایک بنیادی مشن ہے اور اس کی تکمیل ہمارا فرض ایمانی ہے۔ اگر ہم اپنے راستے سے سرمو بھی انحراف کریں تو ہمارا وجود باقی نہیں رہتا۔

انسانی عادات بھی چونکہ مقاصد کے تابع ہوتی ہیں، اس لیے ہم حکومتوں کی تبدیلی کیساتھ ساتھ تبدیل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ایک حکومت کو ہمیں سمجھنے میں اتنا وقت لگ جاتا ہے کہ جب وہ ہمیں سمجھنے لگتے ہیں تو خود نہیں رہتے۔ اس طرح ہمارے لیے پھر سے از سرنوئ مشق شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ لیاقت علی خان ہوں، سہروردی ہوں، فیلڈ مارشل ہوں، بھٹو ہوں یا جنرل ضیاء الحق ہوں، سب ہی کے ساتھ ہمارے اختلاف کا سبب یہی رہا۔ اگرچہ ہر ایک کو بالآخر تسلیم کرنا پڑا کہ مسلم کانفرنس کا موقف ہی درست تھا۔ مگر اس اعتراف کا کوئی فائدہ

نہیں کیونکہ یہ بعد از وقت اور بعد از خرابی بسیار ہوتا ہے۔ یہ وہی زود پشیماں کے پشیماں ہونے والی بات ہے۔ اس کا تجزیہ بھی عملی سیاست کے طالب علم کے لئے بے حد دلچسپ اور مفید ہو گا لیکن یہ ایک پورا موضوع ہے جس پر علیحدہ بحث کی جانی چاہیئے۔ جنرل ضیاء الحق صاحب معلوم نہیں کب اس حقیقت کو تسلیم کریں گے۔

ان اختلافات میں ایک ایسا وقت آجانا طبعی امر ہے کہ ہماری بات حکومت کی سمجھ میں آجانا شروع ہو جائے۔ جب ایسا ہونے لگتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ تلخیاں کم ہونے لگتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ چور دروازے والوں کی اصلیت بھی آشکار ہونے لگتی ہے، اس سے حکومت کے طرزعمل میں بھی ضرور فرق آجاتا ہے۔ ہمارے لیے اس دن ان کی سوچ بھی بدلنا شروع ہو جاتی ہے۔ ہم پر کی گئی ناروا سختیوں کا بھی یقیناً ان کو احساس ہونے لگتا ہو گا۔ جب ایسی صورت حال پیدا ہونے لگی تو یہ سب لوگ جن کی صدارت کا دارومدار محض اس اختلاف پر تھا، شور مچانے لگے کہ دیکھو! یہ حکومت جانب دار ہوگئی ہے اور یہ ہو گیا، وہ ہو گیا۔

فی سبیل اللہ فساد:

ضمناًایک بات کہوں کہ حکومت کے ایوانوں میں ایک طبقہ ہمیشہ ایسا موجود رہا ہے جس کا ''مذہبی'' فریضہ ہے کہ وہ حکومت اور محبِّ وطن افراد اور جماعتوں کے درمیان مسلسل اختلاف، دشمنی اور فساد کی کیفیت کو برقرار رکھے، جب بھی ان کا داؤ چلتا ہے، وہ اس کا بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔بعض لوگ اس میں خاصے مشاق ہو جاتے ہیں جس کی صرف ایک مثال دیتا ہوں۔ میں نے بھٹو صاحب سے کہا: میرے خلاف آپ کو غلط اطلاعات جان بوجھ کر دی جاتی ہیں، مجھے پوچھ لیا کریں، جھنجھلا کر کہنے لگے ''کیا میں ایوب خان ہوں''۔ یعنی ان کو بھی فیلڈ مارشل سے ایسی شکایت تھی۔

بہر حال ہوا یہ کہ آزاد کشمیر کی پیپلز پارٹی نے سوچے سمجھے طریقے سے بلاوجہ میرا نام لیکر بر سر عام گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اس پر ہمارے کارکنوں نے کافی تحمل کے بعد کیونکہ ان کو اصل وجہ معلوم تھی لیکن صبر نہ کر سکے، جواب میں بھٹو صاحب کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ایک موقع پر ان کے ایک کارکن نے مجھ سے کہا ''دیکھو یہ ہمارے لیڈر کو گالیاں دے رہے ہیں''۔ مجھے بھی کہنا پڑا ''تم ان کے لیڈر کو گالیاں دینا بند کر دو، وہ تمہارے لیڈر کو گالیاں دینا بند کر دیں گے''۔ نتیجہ وہی ہوا۔ بھٹو صاحب کو وہ گالیاں روز بروز بڑھا چڑھا کر پیش کی جاتی رہیں، یہاں تک کہ ہمارے خلاف منصوبہ بنانے والوں کا کام چل نکلا جو سب کو معلوم ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ کامیابی و ناکامی سب اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور اسی کی تدبیر ہے جو سب سے بہتر ہوتی ہے۔ واللہ خیر الماکرین۔

مسلم کانفرنس کی استقامت:

اس وقت بھی تقریباً یہی صورت ہے۔ حکومت پاکستان اور آزاد کشمیر نے ہمارے خلاف محاذ آرائی بند کی ہوئی ہے اور ہم بھی اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ کوئی امداد نہیں جو وہ ہمیں دے رہے ہیں۔ ان سیاسی لوگوں کو اصل تکلیف یہ ہے کہ حکومت ہماری مخالفت کیوں نہیں کرتی تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں، مگر ہماری طرف سے مخالفت یا حمایت کا معیار کبھی بھی ایسا نہیں تھا۔ ہم نے کبھی قومی و ملی مفادات سے ہٹ کر کسی حکومت کی مخالفت کی ہے نہ حمایت۔ یہ بھی اس جماعت کا ایک طرہ امتیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس استقامت کی توفیق دے۔ آمین۔

مسلم کانفرنس کو کب کسی حکومت کی امداد کی ضرورت تھی؟ خدا کے فضل و کرم سے اس زوال اور انحطاط کے باوجود جو قومی سیاسی زندگی میں رونما ہوا ہے، عوام و خواص کی بھاری اکثریت مسلم کانفرنس کے ساتھ رہی ہے اور مسلم کانفرنس نے اپنے سیاسی کردار کو بفضلہٖ تعالیٰ

برقرار رکھا ہے۔

جانبداری اور غیر جانبداری کی ایک اور مثال سن لیجئیے۔ بریگیڈئر محمد حیات خان صاحب نے چند افراد سے انتقام لینے کے لیے قانون بنایا تھا کہ ملازمت سے علیحدہ ہونے پر کوئی شخص سات سال کے اندر سیاست نہیں کرسکتا۔ پاکستان میں اس کی معیاد دو سال ہے، مگر آزاد کشمیر چونکہ ایک ''بڑی مملکت'' ہے اس لیے معیاد بھی زیادہ رکھی گئی۔ اب ریٹائرمنٹ کے بعد وہ خود اس میں پھنس گئے اور آخر مجبور ہو کر میجر جنرل عبدالرحمٰن خان سے درخواست کی کہ ان کی نا اہلیت ختم کی جائے۔ اگرچہ عبدالرحمٰن صاحب نے کمال مہربانی کی اور ان کی نااہلیت ختم کر دی جس پر ہم نے بھی خوشی کا اظہار کیا لیکن وہی حیات خان زیادہ شور کر رہے ہیں کہ یہ حکومت مسلم کانفرنس کی حمایت کر رہی ہے۔ اگر یہ حکومت ہمارے حق میں جانبدار ہوتی تو بعض سرکاری ملازمین کیسے کھلم کھلا ہماری مخالفت کرتے۔ مگر ہم نے اس پر کوئی شور غل نہیں کیا۔ کیونکہ ہمارا اعتماد خدا کی ذات پر، اپنے مقصد کے صحیح ہونے پر اور اپنی مخلصانہ جدوجہد پر ہے۔ حکومت اگر کبھی ہماری حمایت کرے گی تو ہم اس کو بھی انہیں تین اصولوں کا نتیجہ سمجھیں گے لیکن اس وقت بہر حال حکومتوں کا طرز عمل ایک طرح کا غیر جانبدار نہ ہے۔

غیر جانبداری کا مضحکہ خیز تصور:

یہ جانبداری اور غیر جانبداری کا مسئلہ بھی عجیب ہے، تاہم اس کا ایک اور اہم اصولی پہلو بھی ہے جس پر غور کیا جانا چاہیئے۔ جہاں تک آزاد کشمیر کا تعلق ہے، وہ ایک نظریاتی خطہ ہے اور یہاں کی حکومت کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ آزاد کشمیر کی جو حکومت نظریہ الحاق کو نہ مانتی ہو، اس حکومت میں اور ہری سنگھ کی حکومت میں ہمارے نزدیک کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ جہاں تک حکومت پاکستان کا تعلق ہے، وہ بھی عجیب مخمصے میں پھنسی رہتی ہے۔ دنیا بھر کی حکومتیں تو بلا حجاب اپنے ہم خیال اور ہم مسلک لوگوں کی کھل کر امداد و حمایت کرتی ہیں۔

کانگریس کھل کر شیخ صاحب مرحوم کی حمایت کرتی رہی اور بھارتی حکومت آج بھی اسی اصول پر قائم ہے۔ حضرت قائداعظمؒ کھل کر مسلم کانفرنس کی حمایت کرتے رہے، روس نے اپنے حامیوں کی امداد کے لیے افغانستان پر فوج کشی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ غرضیکہ عقیدے اور نظریئے کے معاملے میں غیر جانبداری ایک مضحکہ خیز کیفیت ہے جس کا کوئی جواز ہے نہ بنیاد، نظریات کے معاملے میں غیر جانبداری تو خالص منافقت ہے اور بے مقصدیت کا بدترین مظاہرہ ہے۔

مجرمانہ غفلت:

کشمیر کی آزادی کا معاملہ بھی اگرچہ بے حد اہم ہے، لیکن پاکستان کے اپنے قومی مفادات جو آزاد کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ بھی کچھ کم نہیں ہیں کہ ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ پاکستان کی معیشت اور دفاع کا تو اس خطے سے چولی دامن کا ساتھ ہے، ایک کا دوسرے کے بغیر زندہ رہنا ہی ممکن نہیں۔ ان باہمی مفادات کے تحفظ کا کوئی اور قابل عمل طریقہ اس کے سوا نہیں ہے کہ کشمیر میں بالعموم اور آزاد کشمیر میں بالخصوص نظریہ الحاق پاکستان پوری طرح حاوی رہے اور کسی لمحہ بھی اس میں کوئی کمزوری واقع نہ ہونے دی جائے۔ لیکن ہماری ملکی سیاست کا عجیب حال ہے کہ پاکستان کی حکومتیں اس نظریئے کو کمزور کرنے پر لگی رہیں اور اس کے کارکنوں کو اپنا مخالف یا دشمن سمجھتی رہیں یا پھر بہت مہربانی کریں تو غیر جانبدار ہو جاتی ہیں۔ پاکستان کی حکومت اگر کشمیر میں الحاق کی حمایت نہیں کرتی تو وہ قومی مجرم ہے اور اگر حمایت کرے تو اس کا عین مذہبی و ملی فریضہ ہے۔ مگر اس کے باوجود اپنی بعض کمزوریوں کی وجہ سے ہم مسلم کانفرنسیوں نے ہمیشہ نیک نیتی سے یہ کوشش کی ہے کہ مرکزی حکومت کو اپنی گروہی سیاست میں ملوث نہ کریں تا کہ مرکزی حکومت کشمیریوں کے لیے ایک جیسی سمجھی جائے۔ ہم نے تو اگرچہ بوجوہ یہ پسپائی اختیار کر رکھی ہے لیکن حکومت پاکستان کو خود سوچنا

چاہیئے کہ وہ کن لوگوں کے لیے ایک جیسی ہوسکتی ہے۔ آیا وہ الحاق پاکستان پر ایمان رکھنے والوں کے درمیان ایک جیسی رہے یا الحاق اور اس کے مخالفین کے درمیان ایک جیسی ہو۔ کسی بھی سیاسی حکمت عملی کی رو سے یہ قومی فریضہ ہے کہ حکومت پاکستان، آزاد کشمیر اور کشمیر میں تحریک الحاق کی بھرپور اور کھلم کھلا حمایت کرے، نہ یہ کہ اس کے علاوہ یا اس کے برعکس ہو۔ تاہم ہم یہ چاہتے ہیں کہ اتنا تو ہو کہ اگر ہماری حمایت نہ کرسکیں تو ہماری مخالفت بھی نہ کریں کیونکہ اس سے وہ نظریہ کمزور ہوتا ہے اور ملکی مفادات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ کرائے کے لوگ اور مفادات کے پجاری دنیا میں کسی بھی نظریئے کی حمایت اور امداد نہیں کر سکتے۔

بلا تنخواہ فوج:

حکومت کے کارندوں نے بھی نظریئے اور عقیدے والے لوگوں کے مقابلے میں کرائے کے مفاد پرست پیدا کرنے کی کوشش کی جو بذاتہ ملک کا بڑا نقصان ہے، کیونکہ کرایہ کش حضرات کا معیار تو پھر کرایہ کی مقدار سے طے ہوتا ہے، عقیدے سے نہیں۔ وہ کرایہ جہاں سے ملے ان کا میلان اسی طرف ہوگا۔ خدا کا لاکھ لاکھ کرم ہے کہ مسلم کانفرنسی لوگ صاحب عقیدہ لوگ ہیں اور ناقابل یقین مشکلات سے وقتاً فوقتاً دوچار ہونے کے باوجود اپنے عقیدے پر قائم ہیں۔ انھوں نے اس تمام عرصے میں نظریات پر کبھی کوئی سودے بازی نہیں کی۔ جن کے خیالات میں کچھ تزلزل آیا وہ بے چارے ہمارا ساتھ چھوڑ گئے اور یہ بات کہنے میں ہم فخر محسوس کرتے ہیں کہ مسلم کانفرنس کے یہ صاحب عقیدہ لوگ پاکستان کی بے تنخواہ فوج ہیں، بلکہ اس خطہ کے مخصوص حالات میں باوردی فوج کے مقابلے میں ان کی افادیت زیادہ ہوگی، کسی صورت میں کم نہیں۔ اس کے برعکس ایک بڑا تلخ تجربہ ہم اپنے مشرقی حصے میں کر چکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر ملک میں بالعموم اور ہمارے جیسے حالات والے ملک میں بالخصوص کسی بھی فوج کا سب سے بڑا سرمایا اور اسلحہ محض شمالی، مغربی یا مشرقی ساخت کا جدید

اسلحہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر اسلحہ اور قوت عوام کی اخلاقی حمایت اور اپنی فوج کے ساتھ یکجہتی ہے۔ یہ بات خصوصیت کے ساتھ آزاد کشمیر کے لیے ایسی حقیقت ہے کہ جس سے چشم پوشی کرنا یا اس کی اہمیت کو کم سمجھنا محض ہلاکت کی دعوت دینا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آزاد کشمیر میں مسلم کانفرنس وہ عوامی تنظیم ہے جس نے نمایاں طور پر وہ فریضہ بھی بکمال ادا کیا ہے بلکہ ایسی حالت میں یہ فریضہ ادا کیا کہ شاید اس کا احساس ابھی ارباب اقتدار کو کماحقہ، نہ ہوا ہو۔ مشرقی پاکستان کا المیہ بھی اس بارے میں ہمارے لیے درس عبرت ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو اس سرزمین کی سلامتی اور بقاء کو محض سیاسی مصلحت نہیں بلکہ جزو ایمان سمجھتے ہیں۔

آزاد کشمیر میں سیاسی گروہ بندی اور چھ جماعتی اتحاد

میں اب یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آزاد کشمیر کی موجودہ سیاسی گروہ بندی کیا ہے؟ اور کون کیا کر رہا ہے؟ یہ جاننا ایک تو اس لیے بھی ضروری ہے کہ گزشتہ دس سالہ دور میں اور اس میں خصوصیت کے ساتھ چند سالہ دور اقتدار تو ایسا گزرا ہے جس نے ماضی میں طے کی گئی تمام بنیادی قدریں تہہ و بالا کر دیں۔ گدھے گھوڑے میں کوئی تمیز نہیں رہنے دی۔ جس کا جہالت میں بھی کوئی مقام نہ تھا وہ بھی اس دور کا افلاطون بن بیٹھا۔ محض یہی وجہ ہے ورنہ آج آزاد کشمیر میں جو اور لوگ سیاسی کام کر رہے ہیں اگر خود ان کو اپنی بد اعمالیوں کا کوئی بھی احساس ہوتا تو شاید بقیہ عمر خدا سے اور عوام سے معافی مانگتے رہتے۔ وہ لوگ جنھوں نے آزاد کشمیر میں تمام جمہوری قدروں کو پامال کیا، ان کا گلا گھونٹا بلکہ بے دردی سے قتل کیا، وہ بھی جمہوریت کی بات کرتے ہوئے حیا محسوس نہیں کرتے۔ اسی طرح کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی عوام دشمنی اور

عوامی مفادات کو کند چھری سے ذبح کرنے کی داستان اگر سنائی جائے تو بلا شبہ مذبحہ خانے بھی ہری ہری کہہ اٹھیں۔ مگر وہ لوگ بھی آج عوام کے درد میں مبتلا ہیں اور قریہ قریہ جا کر غم خواری کر رہے ہیں۔ دوسری یہ بات بیان کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ عوام الناس کو اس تمام عرصے میں ایک طرف ملی ذمہ داریوں سے بے خبر رکھنے پر بھرپور توجہ دی گئی تو دوسری طرف کوئی متبادل مہیا نہیں کیا گیا۔ اس سے ایک خطرناک خلا پیدا ہو گیا ہے اور اگر بروقت عوام الناس کو اس امر کا احساس اور شعور نہ ہوا تو خدانخواستہ کوئی بھی آخری المیہ ہماری دہلیز پر دستک دے رہا ہو گا۔ اس کے علاوہ ان حالات میں اگر آزاد کشمیر میں انتخابات ہوتے ہیں، جیسا کہ ہم توقع کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ جو خرابی کئی برسوں میں حکومت نے کروڑوں روپے خرچ کر کے پیدا کی اس کو اتنی تھوڑی سی مدت میں کون درست کر سکتا ہے اور کیسے سب کو سمجھا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدانخواستہ عوام وخواص اس صورت حال کو معمول پر قیاس کر کے کوئی فیصلہ کریں تو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ فیصلہ کس کے خلاف اور کس کے حق میں ہو، کیا معلوم وہ فیصلہ خود فیصلہ کرنے والوں کے ہی خلاف ہو، اس لیے بعض ایسے ضروری امور کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جن کے بغیر گزارہ نہیں۔

(تصویر: تحریک آزادی کشمیر کے تین اہم ستون

سردار محمد عبدالقیوم خان۔ چوہدری غلام عباس اور سردار محمد ابراہیم خان)

اس کا خیال مجھے اس وجہ سے بھی آیا ہے کہ ایک تو اخبارات میں تمام بامقصد رپورٹ چھپ نہیں سکتی اس کا بہت معمولی سا حصہ ہی ''خبر'' بنتا ہے کیونکہ اس دور میں خبر کا معیار بدقسمتی سے یہ نہیں رہ گیا کہ ملک کے مفاد میں کیا ہے بلکہ ملک کے خلاف بات کو زیادہ نمایاں جگہ ملتی ہے، غالباً پوری دنیا میں بھی یہ رجحان بڑھ گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی خبر آ بھی جائے تب بھی شاید وہ صرف آزاد کشمیر کے ایڈیشن میں ہو یا زیادہ سے زیادہ اس کا کچھ

حصہ پنڈی ایڈیشن میں ہو، بقیہ ملک میں اس کا کچھ علم نہ ہوگا۔ جب کہ یہ امور ایسے ہیں جن کا تعلق ملک کے گوشے گوشے میں رہنے والے ہر شخص کے ساتھ برابر ہے۔ خواہ وہ کشمیری ہو یا کسی دوسرے حصہ کا رہنے والا۔

آزاد کشمیر میں اسوقت سیاسی گروہ بندی کی صورت یہ ہے کہ کوئی درجن بھر جماعتیں یا تنظیمیں ہیں جو جماعت یا تنظیم ہونے کی دعویدار ہیں، ان میں سے کچھ تو ایک اتحاد میں شامل ہیں جس کو کہ وہ ''قومی اتحاد'' کا نام دیتے ہیں۔ وہ چھ جماعتیں اس طرح ہیں۔ لبریشن لیگ جس کے سربراہ کے۔ایچ خورشید ہیں، وہ اس چھ جماعتی اتحاد کے صدر بھی ہیں، اس کے علاوہ حال ہی میں معرض وجود میں آنے والی چند پارٹیاں ہیں۔تحریک عمل پارٹی جس کے سربراہ محمد حیات خان ہیں۔ آزاد جمہوری پارٹی جس کے سربراہ میاں غلام رسول ہیں۔ اسلامی جمہوری پارٹی جس کے سربراہ چوہدری صحبت علی ہیں اور انقلابی محاذ کوٹلی جو پہلے جاٹ گجر، ملک وغیرہ جگتو محاذ تھا، پھر قبائلی محاذ بنا اور اب ترقی کر کے انقلابی محاذ بن گیا ہے، اس کے سربراہ ملک محمد یوسف صاحب ہیں۔ جماعت اسلامی بھی اس اتحاد کی ایک فریق ہے۔ اس کے سربراہ لیفٹیننٹ کرنل ریٹائرڈ عبدالرشید خان ہیں۔ نیز یہ چھ جماعتی اتحاد انتخابی اتحاد بھی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور اتحاد ہے جسے چار جماعتی اتحاد کہتے ہیں۔ یہ انتخابی اتحاد تھا، نہ ہے۔ یہ ایک عبوری مقصد کے لیے چند شرائط پر موقوف اتفاق رائے ہے۔ اس کا کوئی صدر ہے نہ کوئی اور عہدیدار۔ ایک شرط اب باقی ہے جونہی انتخابی شیڈول کا اعلان ہوتا ہے۔ یہ اتحاد خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں محاذ رائے شماری ہے جس کے سربراہ عبدالخالق انصاری ہیں۔ آزاد جموں وکشمیر مسلم کانفرنس ہے جس کے سربراہ چوہدری نور حسین ہیں اور صدر چوہدری سلطان محمود ہیں جو چوہدری نور حسین صاحب کے فرزند ہیں۔

پی پی کے وہ لوگ ہیں جن کے قائد سردار محمد ابراہیم خان ہیں اور کل جموں وکشمیر

مسلم کانفرنس ہے جس کے صدر سردار سکندر حیات خان ہیں اور میں بھی اس میں ان کے ساتھ ہوں۔ ان جماعتوں کے علاوہ جمعیت العلماء اسلام اور جمعیت العلماء پاکستان کے ساتھ نسبت رکھنے والی دو مذہبی تنظیمیں بھی ہیں جو سیاست میں بھی پوری طرح حصہ لینے کی کوشش میں ہیں۔ جمعیت العلماء اسلام جموں وکشمیر ہے جس کے سربراہ مولانا محمد یوسف، صاحبزادہ عتیق الرحمٰن ہیں، اس تنظیم کا نام جمعیت العلماء آزاد جموں وکشمیر ہے۔ ان سب کے بارے میں کچھ مختصراً گزارش کرنا چاہتا ہوں ان کے علاوہ بھی نام کی حد تک کچھ تنظیمیں ہیں، ایک ہماری ہم نام ہے، ایک مسلم لیگ ہے اور ایک تحریک استقلال ہے۔

چھ جماعتی اتحاد:

پہلے چھ جماعتی اتحاد کو لیجیے۔ سیاسی اتحاد بالعموم حکومت کے خلاف بنتے ہیں، کیونکہ وہ ایک طاقتور فریق ہوتی ہے اس لیے جب اس کا مقابلہ تنہا کرنا مشکل ہو تو کچھ جماعتیں مل کر مقابلہ کرتی ہیں۔ جیسے پاکستان قومی اتحاد جو بھٹو صاحب کے مقابلہ کے لیے بنا تھا۔ اس کا نام قومی اتحاد اس لیے رکھا گیا تھا کہ سوائے پی پی کے جو حکمران جماعت تھی بقیہ تمام جماعتیں اس اتحاد میں شامل تھیں۔ ان دونوں خصوصیات کے نقطہ نظر سے آزاد کشمیر کے اس اتحاد کو دیکھیے پہلے تو یہ کہ آزاد کشمیر میں یہ اتحاد کس کے خلاف بنایا گیا ہے۔ حکومت تو خود انتخابات میں حصہ نہیں لے گی، اس طرح ظاہر ہے کہ یہ اتحاد محض اس غرض سے بنایا گیا ہے کہ سب مل کر مسلم کانفرنس کا مقابلہ کریں، ہماری سیاست کی یہ بھی ایک بوالعجبی ہے کہ مسلم کانفرنس کے خلاف ایک اتحاد اس وقت بنا تھا جب کہ آزاد حکومت بھی پی پی کی تھی اور مرکزی حکومت جو بھٹو صاحب کی حکومت تھی، ان سب کی کھل کر امداد کر رہی تھی۔ بلکہ ان کی امداد کے لیے ہر جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھی۔ پھر بھی جب بات بنتی دکھائی نہ دی تو ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ ہمیں دو میں سے ایک راستہ اختیار کرنا پڑا۔ انتخابات میں حصہ لیتے تو ایف

ایس ایف کے درندوں کے ہاتھوں سینکڑوں بے گناہوں کا قتل کروا دیتے اور نتیجہ پھر بھی وہ ہوتا، یعنی پی پی کو کامیاب قرار دے دیا جاتا یا ہم عوام الناس کا خون کروانے سے پرہیز کرتے اور انتخابات کا بائیکاٹ کرتے، چنانچہ ہم نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

مسلم کانفرنس کے خلاف وہ اتحاد مارشل لاء تک قائم رہا، پھر مارشل لاء میں جب انتخابات کی بات چلی تو آزاد کشمیر میں دوبارہ ایک اتحاد بنا جس کو قومی اتحاد کہا گیا۔ اس میں کافی لوگ اکٹھے ہوئے تھے کہ مسلم کانفرنس کا مقابلہ کیا جائے مگر بعد میں یہ اتحاد بھی ختم ہو گیا۔ اب تیسری بار پھر اسی قسم کا اتحاد بنایا گیا ہے۔ اس اتحاد کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا نام بھی قومی اتحاد بنایا گیا ہے جب کہ جو جماعتیں اس میں شامل نہیں ہیں وہ اپنے سیاسی حجم اور وزن کے لحاظ سے اس اتحاد کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ وزنی ہیں۔ اس اتحاد میں جو لفظ قومی استعمال کیا گیا ہے وہ بھی کشمیریوں کی علیحدہ قومیت کی غمازی کرتا ہے۔ قومی اتحاد آزاد کشمیر اور پاکستان سب کو ملا کر تو ہوسکتا ہے لیکن تنہا آزاد کشمیر کو یہ نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس اتحاد کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں شامل کوئی دو جماعتیں ایسی نہیں ہیں کہ جن کے مقاصد میں ہم آہنگی یا کوئی قربت بھی ہو، سوائے ایک قدر مشترک کے یعنی مسلم کانفرنس کی مخالفت۔ چنانچہ آیئے، ہم ان کو مختصر ایک ایک کر کے دیکھتے ہیں۔

لبریشن لیگ

خودمختاری اور دشمن نوازی:

لبریشن لیگ کا بنیادی مقصد آزاد کشمیر کو ایک علیحدہ اور مکمل خودمختار مملکت تسلیم کروانا ہے، مگر اس کے باوجود کہتے ہیں کہ اس سے نہ پاکستان کی مخالفت ہوتی ہے نہ الحاق پاکستان کی۔ یہ بالکل وہ بات ہے جو ہمارے سابق وزیرخزانہ اسحاق خان کبھی کبھی بڑی معصومیت سے کہہ دیتے تھے اشیائے ضرورت کے نرخ اگرچہ بڑھا دیئے گئے ہیں لیکن اس کا کوئی اثر ہمارے غریب عوام پرنہیں پڑے گا۔ خورشید صاحب کے اپنے ہی حالیہ بیان کے مطابق تسلیم کروانے کے اصول پر چل کر جب کشمیر آزاد ہو جائے گا۔ (جو بذاتہ ایک خواب نیم روز ہے) تو پھر مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ پاکستان کے ساتھ ہمارے کون کون سے رشتے اور کیا کیا تعلقات ہیں۔ اس کے معنی صرف یہ ہی معلوم ہوتے ہیں کہ پہلے ایک علاقے کو ایک خود مختار ریاست کے تصور پر حاصل کیا جائے پھر اس کے بعد اس کا پاکستان کے ساتھ الحاق کیا جائے۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ اگر یہ بات ہفتہ دس دن میں ہوسکتی

ہے تو شاید اس میں معقولیت کا کوئی گوشہ تلاش کیا جائے۔ لیکن اس پر اگر کئی سال لگتے ہیں بلکہ ایک عمر درکار ہے جو بظاہر ہے تو ہم اپنی ایک پوری نسل کو پہلے خودمختاری کی تربیت دیں، پھر سب اس وقت تک زندہ رہیں تا کہ ہم ان کو الحاق پاکستان کے لیے راضی کر سکیں۔

ہمارے کئی لوگ اس بات کے محض ظاہری اور فوری تصور کی بنا پر سوچنے لگتے ہیں کہ چلو صاحب اس طرح کل پرسوں کشمیر کا فیصلہ ہو جائے گا جبکہ اس کی حقیقت ظاہر ہے اگر درمیانی عرصہ کا حساب لگایا جائے جس سے گزرنا ناگزیر ہے تو اس کے معانی تو یہ ہوئے کہ ہم دور دراز کسی نامعلوم جھاڑی میں بیٹھی ہوئی چڑیا کے تصور میں اس کو بھی آزاد کر دیں جو ہمارے ہاتھ میں ہے اور پھر عمر بھر اس جھاڑی کی تلاش میں رہیں، جس کے بارے میں وہم تھا کہ وہاں چڑیا ضرور ہوگی۔ یہ کس قدر عقل و دانش کی بات ہے، اس کی کون ''داد'' نہ دے گا، مگر ہمارے ہاں ایسے دانشوروں کی بھی خدا کے فضل وکرم سے کوئی کمی نہیں ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یوں ہوگا کہ اگر کوئی پوچھے کہ صاحب آپ مسلمان ہیں تو ایک کو وہ یہ جواب دے جو معروف ہے کہ الحمداللہ میں مسلمان ہوں، مگر آج تک شاید پوری انسانی تاریخ میں کسی نے یہ نہ سنا ہوگا کہ جب پوچھا جائے کہ کیا آپ مسلمان ہیں تو کہنے والا کہے کہ: صاحب دیکھیئے جب فیصلے کا وقت آئے گا تو میں اپنے گردوپیش کے حالات کو مدنظر رکھوں گا۔ اپنے گاؤں والوں کے اسلام کا خیال رکھوں گا۔ اپنے خاندان والوں کی اسلام کے ساتھ عقیدت کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں۔ یہ بھی تو ایک جواب ہے۔ جو کشمیری پاکستان پر دل سے یقین رکھتا ہے اس کیلئے شرم کی کوئی بات نہیں ہے کہ برملا کہے کہ الحمد اللہ میں الحاق کا حامی ہوں، کئی واسطوں سے بات کرنے کا تکلف کیوں؟ کسی کو کیا بتانا مقصود ہے اپنی نیت کی خرابی کے سوا۔

یہ طرزِ عمل کسی ایک کا نہیں ہے۔ اس میں الحاق پاکستان کے مخالفین سب ہی شامل ہیں۔ اگر ان سب حضرات کی یقین دہانیاں درست مان لی جائیں اور خدا کرے وہ درست ہی

ہوں، تو پھر بھی کہنا پڑے گا کہ یہ لوگ محض مسلم کانفرنس کی دشمنی میں یہاں تک چلے گئے ہیں کہ اپنے منفی عمل سے دشمن کو فائدہ پہنچا رہے ہیں اور اپنے گھر میں انتشار اور دشمنی کی فضاء پیدا کر رہے ہیں۔ یہ بھی ایک فطری امر ہے کہ جس کی نشاندہی خود قرآن کریم نے ''رحماء بینھم'' کے اصول میں کردی ہے۔ سیاست کی وجہ سے جب آپس میں دشمنی ہوگی تو ظاہر ہے کہ دشمن کے ساتھ دوستی ہوگی۔ سیاست کی یہ عجیب وغریب منطق صرف ہمارے ہاں ملے گی، دنیا میں کسی جگہ اس کا سراغ نہیں ملتا اس کے بارے میں ان بعض سرکاری حلقوں میں بھی جن کے عزیز و اقارب خودمختاری کے نعرے لگاتے ہیں جواباً یہی بہانا بنایا جاتا ہے کہ صاحب یہ تو محض مسلم کانفرنس کی مخالفت کی وجہ سے ہے ورنہ یہاں کون ہے جو علیحدگی چاہتا ہے اور پاکستان کا مخالف ہے۔ یہ بات آج کل جب کہ ان لوگوں سے ہمارا آمنا سامنا ہو گیا ہے اور باطل اور تخریبی افکار ونظریات کا پردہ چاک ہو رہا ہے، خاص طور پر زور دے کر کہی جا رہی ہے تا کہ اصل بات پر پردہ پڑا رہے اور وہ مراعات جو ان لوگوں کو ملتی رہی ہیں ان پر کہیں زد نہ پڑ جائے۔

منفی نعرے اور استحصال:

ہمارے ہاں یہ بھی رسم موجود ہے اور کافی مؤثر بھی کہ اس قسم کے منفی اور تخریبی نعرے لگا کر سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہاں تک چونکہ قومی منصوبہ بندی تو ہے نہیں، اس لیے منفی نعرے والوں کو راضی رکھنے کیلئے ان کو ہر قسم کی جائز و ناجائز مراعات سے نوازا جاتا ہے۔ اس سے قومی مفادات کو جو نقصان ہو رہا ہے وہ اپنی جگہ، اس سے منفی رجحان کو کس قدر تقویت ملتی ہے اور مثبت انداز فکر کی کس قدر حوصلہ شکنی ہوتی ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یہ رجحان پھر افراد سے مل جل کر اجتماعی صورت اختیار کر لیتا ہے جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بات شروع ہوتی ہے دباؤ کی خاطر حکومت کے خلاف نعرہ بازی سے تو تان

جا کر ٹوٹتی ہے ملک کے مفادات کو نقصان پہنچانے پر۔ تخریبی عناصر کبھی کبھی خود بھی ایسے حالات پیدا کرتے رہتے ہیں اور یہ ایک معروف تخریبی طریقہ بھی ہے۔ بہر حال خورشید صاحب کا یہ تسلیم کروانے والا معاملہ بھی علیحدہ ایک پورے مقالے کا تقاضا کرتا ہے جو اس وقت ممکن نہیں ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ آزاد کشمیر میں ایک صدر ہے، وزیرِاعظم ہے، سپریم کورٹ ہے، علیحدہ نظریاتی کونسل ہے، علیحدہ ایک جھنڈا ہے اور علیحدہ ایک ترانہ ہے، ظاہر ہے کہ حکومت پاکستان کے نزدیک یہ باتیں جائز ہیں ورنہ یقیناً نہ ہوتیں۔ اس سے زیادہ تسلیم کرنا اور کروانا کیا ہے سوائے ایک علیحدہ مملکت کے جس کیساتھ ویزا اور پاسپورٹ جاری کیا جائے اور جس کے سفارت خانے قائم کئے جائیں۔

اس وقت تو آزاد علاقہ کی حکومت کو ہی ملک بھر میں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر پوری ریاست کی حکومت مانا جاتا ہے الا یہ کہ ریاست کی حکومت شخصی حکومت تھی اور اب عوامی حکومت ہوتی ہے یا کم از کم موروثی نہیں رہی۔ ہری سنگھ کی جانشین تو اسی کو مانا جاتا ہے، البتہ کوئی ہری سنگھ نہیں ہے نہ ہی اس کی اولاد میں سے یہاں کوئی ہے۔ دراصل یہ بات وہی ہے مگر اس کو ایک رنگ دار چینی میں لپیٹ کر کھلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

پھر اس نعرے کے کچھ فوری نقصانات ہیں جن کا اگر صحیح علم اور شعور ہو تو شاید ہی کوئی شخص اس قسم کی بات کر سکتا ہے۔ کس کو معلوم نہیں کہ اسے تسلیم کروانے کا اولین مطلب یہی ہوگا کہ پاکستان اور آزاد کشمیر دو علیحدہ ملک بن جائیں اور دونوں کے مابین ویزے، پاسپورٹ کی پابندیاں اور سفارتی تعلقات قائم کیے جائیں۔ اس نامعقول تجویز یا وہم پر کون اور کس طرح عمل کر سکتا اور وہ کون احمق ہے جو اس کا مطلب نہیں سمجھتا۔ الا یہ کہ کوئی شخص فی الوقع ریاست جموں وکشمیر کو پاکستان سے کاٹ کر ایک علیحدہ ملک بنانے کا خواہش مند ہو۔

یہ سب حضرات کئی بار جواباً اپنے بیانات میں کہتے ہیں کہ وہ نہ تو پاکستان کے مخالف

ہیں نہ الحاق کے بلکہ پاکستان کی سلامتی اور استحکام کو بھی ناگزیر بتاتے ہیں۔ ہماری طرف سے کسی کی نیت پر کوئی شبہ نہیں اور اس بات کو تسلیم بھی کیا جاسکتا ہے کہ ان حضرات میں بعض سنجیدہ صاحبان فی الواقع پاکستان کی سلامتی اور بقاء چاہتے ہونگے۔ ہماری بحث اس سے قدرے مختلف ہے۔ ہم لوگ بھی تو دوسرے ملکوں کی سلامتی چاہتے ہیں اور کسی کے مخالف نہیں ہیں تو کیا اس میں اور الحاق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس پوری بات کو کسی اور حوالے سے بھی دیکھنا مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ کشمیر کا پاکستان کیساتھ تعلق کیا ہے؟ ہونا کیا چاہئیے اور اس تعلق کا کیا اچھا یا برا اثر خود پاکستان کی سلامتی اور بقاء پر پڑ سکتا ہے؟ اور ہماری تحریک آزادی پر بھی؟ کیا محض اتنی بات کہنے سے کہ ہم پاکستان کے مخالف نہیں اور ہم بھی پاکستان کی سلامتی چاہتے ہیں اصل مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

اس جدید فکر کو اس پہلو سے بھی دیکھیئے کہ جس کشمیر کے بارے میں اب کہا جا رہا ہے کہ اس کو حاصل کرنے کیلئے، حکمت عملی کے طور پر ہی سہی، آزاد علاقے کو ایک علیحدہ کامل خودمختار ریاست کے طور پر تسلیم کیا جائے، یہ وہ علاقہ جس کے بارے میں بانیِ پاکستان حضرت قائداعظم کا وہ جملہ شہرہ آفاق ہے کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے یہ نہ محض کوئی تخیلاتی چیز ہے، نہ محض کسی کی آرزو کی شدت کا اظہار، بلکہ اپنے تمام تر مادی اور غیر مادی عناصر اور ترکیبات کے ساتھ ایک حقیقت ہے۔ اس کے بارے میں اگر ہم آئے دن اپنے موقف تبدیل کر لیا کریں تو کیا اس طرح ہم کبھی بھی اور کسی بھی زمانے میں کسی مفید انجام تک پہنچ سکتے ہیں؟ عملاً تو یہ ناممکن ہے پھر اس کا ایک اور اہم اور فوری توجہ طلب پہلو یہ بھی ہے کہ اس طویل عرصہ میں پوری ملت کی سوچ کا رُخ سرینگر کی طرف رہا ہے، لیکن اگر اس تسلیم کروانے والی فکر یعنی ''آزاد کشمیر کو تسلیم کیا جائے'' کو قبول کرلیں تو کیا فوری طور پر ہمارا رُخ اور تمام تر توجہ سرینگر سے ہٹ کر آزاد کشمیر اور اسلام آباد کی طرف منتقل نہیں ہو جاتی؟ صرف توجہ ہی نہیں بلکہ اس راستے کی بعض معلوم اور قابل فہم مشکلات اور رکاوٹوں کو دور کرنے کی باری آئے گی جس سے

فرار کی ممکنہ صورت نہیں ہے۔ تو پھر کیا ہماری تمام تر ذہنی توانائیاں اس لاحاصل مشق یعنی تسلیم کروانے کی جدوجہد پر صرف نہ ہوں گی؟ اور کیا ایک اختلافی بلکہ منافرت اور دشمنی کی سی فضا پیدا نہ ہوگی۔ یقیناً یہ سب کچھ ہوگا۔ ہم پہلے ہی اس کا وافر تجربہ کر چکے ہیں۔ اگر اس قسم کی باتوں سے پاکستان کی کسی مرکزی حکومت سے محض انتقام لینا مقصود ہے۔ تب بھی یہ کھیل مزید خطرناک ہے، اس کا نتیجہ تو خود اپنی ذات سے اور پوری ملت سے انتقام لینے کے مترادف ہوسکتا ہے۔ آخر انتقام بھی کس بات کا؟ محض اس لیے کہ کسی حکومت نے ہم میں سے کسی کو خواہ کسی چور دروازے سے سازش کے ذریعے آزاد کشمیر کی مسند حکومت پر نہیں بٹھایا؟ ورنہ وہ کون سا دوسرا مفاد ہے جس کا راستہ رُکا ہُوا ہے؟

اگر ایک طرف حکومت پاکستان کے اس طرزِ عمل کا جائزہ لیا جائے جو اعتراض کا موجب ہے اور جس کے علاج کے طور پر تسلیم کروانے کی دلیل دی جاتی ہے اور دوسری طرف کشمیری سیاستدانوں کے اپنے طرزِ عمل کے ساتھ اس کا موازنہ کیا جائے تو کوئی بھی انصاف پسند شخص مرکزی حکومت سے زیادہ ہمیں قصور وار ٹھہرائے گا۔ مثلاً اگر بھٹو صاحب کے وقت میں ہم سب لوگ اکٹھے رہتے تو نہ جمہوریت کا ستیاناس ہوتا نہ آزاد حکومت کے اختیارات سلب ہوتے۔ اسی طرح اگر فوجی غیر آئینی حکومت کے خلاف ہم سب متحد ہوتے تو وہ زیادہ دیر تک ہرگز نہیں رہ سکتی تھی۔ مگر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ وہی لوگ جو اس تباہی کے محرک و موید تھے، اب اس واقعہ کو مرکزی حکومت کی بدعنوانی شمار کرتے ہیں اور علاج یہ بتاتے ہیں کہ آزاد کشمیر کو علیحدہ مملکت بنادیا جائے لبریشن لیگ کا معرض وجود میں آنا ہی دراصل ایسا واقعہ ہے جو خود بعض نکات کی وافر وضاحت کرتا ہے۔ ہمارے ہاں جماعتیں بنانے کا ایک وقت وہ ہوتا ہے جب کہ کوئی شخص حادثتاً حکومت میں رہا ہو تو وہ سیاست میں کسی جماعت کو اپنے تعاون کے قابل نہیں سمجھتا، اس لیے اپنی جماعت بنا لیتا ہے۔ کئی جماعتیں اس طرح بنیں اور بگڑیں۔ لبریشن لیگ کے بننے میں اس کے علاوہ بھی کچھ اور عوامل کارفرما تھے۔

ان میں مسلم کانفرنس کی طاقت کو کمزور کرنا اور آزاد کشمیر کو ایک علیحدہ مملکت تسلیم کروانا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی علم ہے کہ اس جماعت کی تخلیق میں ہمارے ایک سابق وزیرِ خارجہ شیخ منظور قادر کی فکر بھی کارفرما تھی اور انہی نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کو اس پر آمادہ کیا تھا کہ وہ تسلیم کروانے والی تجویز پر ہمدردی سے غور کریں۔ اس دوران ان کے ساتھ میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ اس امر کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اس بارے میں مزید معلومات کیلئے آپ آنے والے صفحات میں مسٹر کے ایچ خورشید حکومت کے ضمن میں بعض مندرجات دیکھیں گے۔

تحریک عمل پارٹی اور اس کا نصب العین:

ہماری مخالفت کی بنیاد پر قائم کیے گئے اس چھ جماعتی اتحاد میں دوسری جماعت تحریک عمل ہے۔ یہ جماعت نہ صرف اپنے نام کے اعتبار سے مہمل ہے بلکہ ابھی تک اس کا آئین منشور اور وجود سب کچھ ایک سوالیہ نشان ہے۔ اس جماعت میں زیادہ تر وہی لوگ ابھی تک شامل ہو رہے ہیں جو بلدیاتی انتخابات میں شکست کھا گئے تھے یا سیاست کے آسان راستے کی تلاش میں تھے، یعنی دوسری جماعتوں میں آسانی سے عہدے ملنا مشکل تھے۔ چونکہ اس جماعت میں سب ہی عہدے خالی ہیں، اس لیے وہ شوق بھی پورا ہو سکتا ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے ذمہ اسی دور کے سرکاری واجبات بھی ہیں اور انھیں محاسبے کا خطرہ بھی ہے۔ محمد حیات خان خود بھی اپنے ہی بنائے ہوئے قانون کے مطابق محاسبے کے بالکل سزاوار ہیں۔

ان کی سیاست کا سارا زور سیاستدانوں سے بالعموم سردار محمد ابراہیم خان اور مجھ سے بالخصوص انتقام لینا ہے۔ اس کے علاوہ تعمیر و ترقی کا بہت رونا روتے تھے، اس تعمیر و ترقی کی منصوبہ بندی کا انھوں نے ستیاناس کیا اور عوام الناس کے جذبہ خود اعتمادی اور جذبہ آزادی کو زبردست دھچکا لگایا، یہاں تک کہ آج ہر شخص پریشان ہے اور کسی کو کسی کی بات پر یقین نہیں

آ رہا۔

اس جماعت ''تحریک عمل'' میں سردست محمد حیات خان ہی ہیں جو تحریک بھی ہیں اور عمل بھی، جیسا ویسا بھی ہے وہ ہی ہیں۔ اس لیے جماعت کی بجائے ان ہی کا تذکرہ کرنا چاہیئے، اس سے جماعت بھی سمجھ میں آجائیگی وہ جب تک صدر رہے، کوئی پانچ سال کے قریب، تو ان کا پورا زور اور سرکاری خزانہ اس پر صرف ہوتا رہا کہ آزاد کشمیر کے سیاست دان جنھوں نے آزادی حاصل کی اور اس کو قائم رکھنے میں مؤثر کردار ادا کیا، ان سب کو بددیانت اور سیاست کے لیے نااہل ثابت کیا جائے۔ سیاست دانوں کی جو کردارکشی کی مہم چلائی، ٹربیونل قائم کیے، جھوٹے اور من گھڑت الزمات لگا کر اپنے پورے دور صدرات میں سیاست دانوں کو عدالتوں میں کھڑا کیے رکھا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ کسی سیاستدان کے خلاف عدالتوں میں کچھ ثابت نہ ہوسکا۔

جو چند لوگ نااہل قرار دیے گئے، وہ بھی اپنی غلطی سے ہی شاید ہوئے ہوں۔ ورنہ شاذونادر ہی کوئی نااہل قرار پایا اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اہل قرار دیئے جانے والے دو حضرات کو حیات صاحب نے اپنے ساتھ اتحاد میں شامل کیا ہوا ہے۔ محمد حیات خان یہ بھی کہتے رہے ہیں کہ ان کے کوئی سیاسی عزائم نہیں ہیں مگر دل کا چور کب تک چھپا رہ سکتا ہے۔

یہ ہے وہ پس منظر جس میں تحریک عمل معرض وجود میں آئی۔ اسی سے ان کے مقاصد اور منشور کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اب جب کہ وہ پوری طرح خم ٹھونک کر سیاسی میدان میں آن اترے ہیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ دور صدارت میں سیاست دانوں کے بارے میں جو کچھ وہ کہتے یا کرتے رہے، وہ کتنی دیانت اور صداقت پر مبنی تھا۔ وہ گویا اپنے لیے میدان ہموار کرنا مقصود تھا۔ کیونکہ جیسا کہ دکھائی دیتا ہے ان کے اپنے ہی ضلع میں دو شخصیتیں ایسی ہیں جن کی موجودگی میں حیات خان کی سیاست مؤثر نہیں ہوسکتی۔ ہم اس وقت بھی یہ کہتے تھے کہ حیات خان صاحب جب کہتے ہیں کہ ان کے کوئی سیاسی عزائم نہیں ہیں تو

وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ چنانچہ اب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کوئی سیاسی عزائم نہیں ہیں تو وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ چنانچہ اب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سیاست دانوں کے خلاف تمام کارروائی کسی جائز محاسبے کی خاطر نہیں بلکہ محض کردارکشی کی خاطر کروائی گئی تھی۔

اس پر حکومت کا جو روپیہ صرف ہوا، آخر وہ اس غریب اور مقروض قوم کے کس جرم کی سزا ہے؟ اس فضول کام پر جس کا نتیجہ سوائے تلخی اور انتشار کے کچھ نہ ہو جو رقم خرچ کی گئی، وہ محض اتنی نہیں ہے جو اس مد میں ظاہر کی گئی بلکہ وہ کئی کروڑ کے قریب رقم جو اس دور میں حکومت نے صرف کی، اگر غور سے دیکھا جائے تو سب کی سب اسی مقصد کیلئے صرف ہوئی۔ وہ اس طرح کہ اس روپے کو جو بظاہر آزاد کشمیر کی ترقی وتعمیر کیلئے حکومت پاکستان نے دل کھول کر دیا تھا، اس کو بغیر کسی منصوبہ بندی کے محض ذاتی پسند اور ناپسند کی بناء پر اور زیادہ تر سیاست دانوں کی مخالفت کی بناء پر رشوت کے طور پر ضائع کیا گیا۔ اس کو آج ہر وہ شخص جس کی آنکھیں کھلی ہیں واضح طور پر دیکھ سکتا ہے۔

اگر اس دور میں کئے گئے نام نہاد تعمیری کاموں کی نسبت سے دیکھا جائے تو حقیقت چھپی نہیں رہ سکتی۔ میں نے بار بار صدر پاکستان سے بھی کہا کہ اس بھاری رقم سے کم از کم اتنا کام تو ہونا چاہیئے تھا جو تیرہ کروڑ روپے میں مسلم کانفرنس کی حکومت نے کیا تھا۔ ستم یہ ہے کہ مرکزی حکومت نے بھی ہمارے ساتھ اختلاف کو اس درجہ بڑھایا کہ وہ بھی اس تباہی کا خوش دلی کے ساتھ تماشا کرتے رہے، بلکہ اس پر پسندیدگی کے سرٹیفکیٹ جاری کرتے رہے۔ حیات خان صاحب کی کس کس کارکردگی کا ذکر کیا جائے جس کا بوجھ لیکر اب وہ سیاست کرنے نکلے ہیں، اگر صرف اس ایک بدعنوانی کا ہی حساب لگایا جائے، جو حیات خان صاحب نے صدارت سے علیحدگی کے وقت کے درمیانی عرصہ یعنی کوئی نصف مہینہ کے اندر کی ہے تو انکی عمر بھر کیلئے وہی کافی ہے۔ اگر کسی سیاست دان سے اس کا عشرعشیر بھی ہوا ہوتا تو اس کو اس دور میں خدا جانے کتنی بار الٹا لٹکایا جاتا۔ کس طرح طے شدہ معاملات کو محض کچھ لوگوں کو ذلیل کرنے کی

خاطر از سرنو شروع کروایا گیا، کس بری طرح عدلیہ کے وقار کو مجروح کیا گیا اور جھوٹی اور بے بنیاد رپوٹوں کے ذریعے دوسروں کے حقوق کو پامال کیا گیا، اس کا حساب بہت طویل ہے۔ بدترین یہ کے اس بات کی بھی سرتوڑ کوشش کی گئی کہ آزاد کشمیر کے نمائندہ لوگوں اور صدر پاکستان کے مابین دشمنی پیدا کی جائے تاکہ اس طرح وہ صدر صاحب کی حمایت حاصل کر سکیں۔ اس کا آسان طریقہ وہی تھا، جو پی پی کے کارکنوں نے اختیار کیا تھا اور ایک عرصہ تک خاصا مؤثر رہا یعنی ہمارے خلاف من گھڑت اور جھوٹی رپورٹیں آئے دن حکومت کو بھیجی جاتی تھیں۔

حب الوطنی اور قومی مفاد کا تقاضا تو یہ تھا کہ آزاد کشمیر کے خطہ میں جہاں مرکزی حکومت کے ساتھ کسی مفاد کا براہِ راست تصادم نہیں ہے، وہاں برادرانہ افہام وتفہیم کا ماحول پیدا کیا جاتا، نہ کہ تلخی اور دشمنی کا۔ اس لیے کہ مرکزی حکومت اور ہمارے درمیان کشیدگی سے قومی مفاد کو جو زبردست نقصان ہوتا ہے، وہ کسی بھی دوسری بات سے نہیں ہوسکتا۔ لیکن حیات خان صاحب نے اس کشیدگی کو زندگی اور موت کا مسئلہ بنائے رکھا۔

یہ عداوت نہ صرف پیدا کی گئی بلکہ اس کو جس قدر ممکن ہوا بڑھایا جاتا رہا، یہی ایک ایسا بڑا قومی جرم ہے کہ اگر دوسری باتیں ٹھیک بھی ہوں تب بھی اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے دور حکومت میں منفی اور تخریبی عناصر کی بے حد حوصلہ افزائی کی اور الحاق پاکستان کے حامیوں کی حوصلہ شکنی کرتے رہے۔ ان کے پورے دورِ حکومت میں کالجوں میں ایم ایس ایف جس کی بنیاد ہی دو قومی نظریئے کے خلاف وطنیت کے لادین نظریئے پر ہے اور جس کے ڈانڈے دہریت اور اشتراکیت سے جا ملتے ہیں، اسکا کوئی طالبعلم ہرقسم کی غنڈہ گردی کے باوجود جو ان کا بنیادی منشور ہے، کالج میں پڑھائی سے محروم نہیں رہا، جبکہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جس کی بنیاد دو قومی نظریئے اور اسلام پر ہے اور جو نظریہ الحاق پاکستان کے علاوہ اور کئی اعلیٰ قدروں کی علمبرادار ہے، اس کے کئی ہونہار طالب علموں کو کالجوں

سے خارج کر کے پڑھائی سے محروم کیا گیا۔

اسی طرح حیات خان صاحب کے دور صدارت میں جن لوگوں کو ملازمتیں ملیں، ان میں بھی وہ لوگ بطور خاص شامل کیے گئے جو الحاق پاکستان اور دو قومی نظریئے کی مخالفت کرتے تھے، حالانکہ ان میں سے بعض لوگ کسی صورت بھی اس ملازمت کی اہلیت کی شرط پوری نہیں کرتے تھے۔ وہ لوگ آج بھی ان عہدوں پر بیٹھ کر ہی کام کر رہے ہیں جو وہ ملازمت سے پہلے کرتے تھے۔ یہ بھی اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی ان کو جتنی سزا دی جائے، کم ہے۔ حیات خان تو آج بھی ان کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں بلکہ الٹا مجھ پر الزام لگا رہے ہیں کہ میں بلاوجہ ان باتوں کا ذکر کر رہا ہوں، ورنہ بات ہی کچھ نہیں۔

ان کو تو وہ نعرے بھی سنائی نہیں دیتے جو یہ لوگ برسر عام لگاتے رہے ہیں۔ ان کے اپنے دور میں میرپور، تراڑکھل، باغ اور کئی دوسرے مقامات پر جو مظاہرے ان لوگوں نے کئے اب وہ دہرانے کا فائدہ نہیں ہے۔ حیات خان صاحب کو وہ نعرے بھی جو بعض علاقوں میں سرخ رنگ کے ساتھ درودیوار پر لکھے ہوئے ہیں، یقیناً دکھائی نہیں دیتے یا ان کے معنی نہیں سمجھتے یا مقصد ہی ہم خیالی ہے۔ ہم کیا کہیں کہ ان عناصر کی پشت پناہی کرنے کا کیا مطلب ہے اور عوام الناس کو اس تخریب کاری سے بے خبر اور لاپرواہ کرنے سے کیا مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟ اب تو ان عناصر میں سے بعض لوگ ان کی جماعت میں شامل ہو رہے ہیں کیونکہ ان کو آزاد کشمیر کے اندر کوئی مرکز چاہیئے جس کی چھتری کے نیچے وہ پردہ میں اپنا کام کرتے رہیں۔ یہ بھی ایسے تخریبی عناصر کا معروف بین الاقوامی طریقہ ہے۔

کمیونسٹ اور دہریہ لابی:

باخبر حلقوں کے مطابق کمیونسٹ اور دہریہ لابی کے حامیوں کو باقاعدہ ہدایت دی گئی ہے کہ اب اپنی حکمت عملی تبدیل کر لیں۔ یاد رہے کہ گزشتہ دنوں کل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے صدر سردار سکندر حیات خان صاحب نے کوٹلی کے جلسہ عام میں ایک خط کا تذکرہ کیا تھا جو

ملحد لابی کے ایک سرکردہ شخص نے ہدایت کے طور پر لکھا تھا۔ اس خط میں بھی پہلی حکمت عملی کی مشکلات کا اعتراف تھا اور نئی حکمت عملی اختیار کرنے کو کہا گیا تھا۔ یہ حکمت عملی بھی ان کی معروف بین الاقوامی حکمت کا ہی ایک حصہ ہے۔

اصل خطرات سے چشم پوشی:

حیات خان صاحب اس وقت بھی اور اب بھی اپنے دوروں کے دوران اس کوشش میں ہیں کے عوام کی توجہ کہیں ان کے دور کی رشوت، چوربازاری، بے انصافی اور بد انتظامی جس کو وہ اپنے دور میں جی بھر کر فروغ دیتے رہے ہیں، کی طرف ہی لگی رہے تا کہ لوگ اپنی قومی ذمہ داریوں سے غافل رہیں۔ وہ ایک طرح کے فوجی تو ہیں اور اب ریٹائرڈ جرنیل ہی سہی لیکن محاذوں پر جو خطرہ ہے اس کا کبھی تذکرہ نہیں کرتے نہ عوام اور فوج کے تعلق کی بات کرتے ہیں۔ نہ بھارتی جارحیت کی صورت میں عوام کو ان ذمہ داریوں سے آگاہ کرتے ہیں، نہ الحاق پاکستان کی بات کرتے ہیں لیکن وہ تبرکاً ایک جملے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس عرصے میں جو نظریاتی بحران ہوا، اس بارے میں آج تک انھوں نے کوئی رائے زنی نہیں کی بلکہ اگر کہیں الحاق کی بات کرتے ہیں تب بھی وزن برابر رکھتے ہیں۔ دوسرے ہی جملے میں تخریب پسند عناصر کی حوصلہ افزائی کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں ''چہ دلاور است دزدے'' والی بات ایسے ہی واقعات سے سمجھ آتی ہے۔

احسان فراموش:

اندرون خانہ آج بھی صدر پاکستان کو بدنام کرتے ہیں کہ ان کو صدر کی حمایت حاصل ہے، حالانکہ صدر پاکستان کی ان پر اتنی مہربانی ہی کیا کم ہے کہ اتنی خرابیاں کرنے اور اس قدر واضح شکایات کے باوجود حیات خان صاحب کے خلاف کوئی کاروائی نہیں ہوئی۔ انھوں نے صدر پاکستان کو اپنے دور صدارت میں کوئی کم بدنام نہیں کیا جو اب کسر نکال رہے ہیں۔ بہر حال یہ

ان کا معاملہ ہے یہ وہ جانیں۔ ذکر محض اس لیے کیا کہ جنرل ضیاء الحق صاحب، حیات خان کے بڑے محسن ہیں اور محسنوں کی عزت کا خیال نہ رکھنا ایک خاص قسم کی اخلاقی کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے''**من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ**'' کسی محسن کو بدنام اور رسوا کرنے سے زیادہ اور ناشکری کیا ہوسکتی ہے۔ یوں تو ان کے نزدیک شاید یہ بات نہ ہو کیونکہ جنرل چشتی صاحب جو حیات خان کے محسن اول ہیں جب ریٹائرمنٹ کے بعد بیمار ہوئے تو جنرل ضیاء الحق صاحب بھی ان کو دیکھنے گئے لیکن حیات خان صاحب نے ان سے پوری طرح پرہیز کیا۔ بلکہ چشتی صاحب اس دور میں مظفرآباد گئے۔ نامعلوم ان کو بھی کیا سوجھی شاید وہ حیات خان صاحب کے اندر کا حال معلوم کرنا چاہتے ہوں، تو حیات صاحب بلا پروگرام دورہ ڈال کر مظفرآباد چلے گئے اور جو شخص چند دن قبل ان کا محسن اعظم تھا، وہ بے چارہ اپنا سا منہ لیکر واپس آ گیا۔ چشتی صاحب بھی خدا کرے اس سے سیکھیں۔ سعدی نے خوب کہا ہے ''نکوئی بابداں کردن چنانست کہ بد کردن بجائے نیک مرداں'' (بروں کیساتھ نیکی کرنا ایسا ہے جیسا نیکوں کے ساتھ بدی کی جائے)۔ ان بظاہر چھوٹے چھوٹے واقعات کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کے اندر جو اصل شخصیت پوشیدہ ہے، اس کے بارے میں کچھ علم ہو جائے تا کہ کئی حضرات ان کے ساتھ شمولیت کرتے وقت پوری طرح غور کر لیں۔ ہم جنسوں پر بہر حال اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مشرقی پاکستان میں لوگوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کی زندگی کے ان ہی گوشوں پر غور نہ کیا تو اس کا نتیجہ ان سب نے دیکھا۔ ہمارے ہاں بھی ایسے واقعات کی کوئی کمی نہیں۔ ان لوگوں کا ذکر کچھ زیادہ اس لیے کرنا پڑا کہ ہم باقی لوگ تو نصف صدی سے عوام و خواص کی عدالت میں برابر پیش ہیں ہماری تمام تر خرابیاں اور اچھائیاں اکثر و بیشتر دوستوں کو معلوم ہیں۔

اجارہ داری کے طعنے اور انتقام:

آخری بات جو ان صاحب کے ضمن میں کہنا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی تقریروں کے

آئینے میں ان کی سیاست کی بنیاد ہی انتقام ہے۔ انتقام کی سیاست کا ایک حشر ہم پاکستان میں دیکھ چکے ہیں اور وہ لوگ تو حیات خان صاحب سے یقیناً لاکھوں مرتبہ زیادہ طاقتور تھے۔ حیات خان بار بار کہتے تھے کہ وہ سیاست میں اجارہ داری ختم کرنے کیلئے آئے ہیں۔ اجارہ داری کا لفظ چونکہ بدنام ہے۔ اس لیے اس کی آڑ لے کر وہ درحقیقت کہنا یہ چاہتے ہیں کہ سردار محمد ابراہیم خان کی اور میری اجارہ داری ختم کریں گے، خورشید صاحب بھی ہمارے ساتھ ہوتے مگر اب چونکہ وہ اتحاد میں اکٹھے ہیں اس لیے ان کی اجارہ داری ختم کرنے کے معاملے میں وہ کتنے صادق ہیں، اس کا اس بات سے پتہ چل جاتا ہے کہ خورشید صاحب کو معافی مل گئی۔ ہماری اجارہ داریاں کیا ہیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے درمیان چوہدری نور حسین صاحب کے سوا کہ وہ سرمایہ دار سمجھے جاتے ہیں، کوئی جاگیر دار ہے نہ سردار۔ ہم سب متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں اور اس پر ہمیں اطمینان ہے۔

البتہ ہم نے کچھ ملک وقوم کی خدمت کی ہے جس وجہ سے لوگ ہمارا ساتھ دے رہے ہیں، ورنہ ہماری کیا اجارہ داری ہے۔ ہاں اس کو عوام الناس کی اجارہ داری کہہ سکتے ہیں۔ اگر کسی کی کچھ اجارہ داری معمولی سی ہے بھی تو شاید اس حد تک ہے کہ وہ شخص دیر سے کسی جماعت کا صدر چلا آ رہا ہو گا، یہ بھی محض اس لیے کہ ان جماعتوں میں جن میں خود محمد حیات خان صاحب کی جماعت بھی شامل ہے کوئی دوسرا شخص جماعت کی سربراہی کے قابل نہ سمجھا گیا ہوگا۔ چوہدری نور حسین صاحب کی ایک حد تک کچھ اجارہ داری کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے ابھی سے جماعت کی صدارت اپنے صاحبزادے چوہدری سلطان صاحب پر مسلط یا تفویض کر دی ہے مگر محمد حیات خان کا روئے سخن چوہدری صاحب کی طرف ہی نہیں، زیادہ تر سردار محمد ابراہیم خان صاحب اور میری طرف ہے بلکہ ہے ہی میری طرف۔ مسلم کانفرنس میں تو خدا کے فضل و کرم سے ابھی باصلاحیت کارکنوں کی کمی نہیں ہے نہ یہ کارکن جو اپنے گھر سے کھا

کر محض اخلاص مندی کے ساتھ ایک عقیدے اور نظریئے کیلئے کام کررہے ہیں، اتنے کمزور نہیں ہیں کہ ان پر کسی کو استحقاق اور مقبولیت کے بغیر مسلط کیا جا سکے۔ جمہوریت میں یہ مشکل بھی ہوتا ہے، خاص کر ہمارے ہاں کہ جب کبھی جماعت کا سربراہ حکومت میں چلا جائے تو جماعت کی قیادت کسی دوسرے کے پاس ہو۔ لیکن مسلم کانفرنس میں ہم نے اس کا تجربہ بھی کیا۔ غرضیکہ محمد حیات خان صاحب کا ہمیں یہ کہنا کہ وہ ہماری اجارہ داری ختم کرنا چاہتے ہیں، نہ صرف مضحکہ خیز ہے اور ان الفاظ کے معنی کے بارے میں حیات خان صاحب کی لاعلمی اور بے خبری پر دلالت کرتا ہے بلکہ واقعات کا منہ چڑانے والی بات ہے۔ دراصل وہ اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر بات وہی ہے بشرطیکہ پہلے مصرعے کی لطافت کو مدنظر نہ رکھا جائے کہ ''گفتہ آید در حدیث دیگراں''۔ نفسیات کا مسئلہ بھی غالباً یہی ہے۔

مجھے حیات خان صاحب کی سیاست اور ان کے نئے اتحاد سے وہ واقعہ یاد آتا ہے کہ کسی دیہاتی کو اتفاق سے چند لاکھ روپے مل گئے، تو اس نے سمجھا وہ اب دنیا کا بڑا سرمایہ دار ہو گیا ہے۔ چنانچہ تجارت کیلئے بمبئی یا کراچی کا رُخ کیا۔ کسی بڑے کروڑ پتی تاجر کے ساتھ شراکت کرنا چاہی۔ اس اصلی سرمایہ دار تاجر نے دیہاتی کی اصلیت معلوم کرلی اور اس کو روئی کے کاروبار میں شراکت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ اس نے اپنا روپیہ برابر برابر روئی کے کاروبار میں لگا دیا۔ وہ سرمایہ دار اس دیہاتی کی حقیقت چونکہ جان گیا تھا اس نے اپنے کارندوں کو حکم دے کر وہ سب گودام جلوا دیئے جن میں وہ روئی رکھی ہوئی تھی۔ بے چارہ دیہاتی اس طرح اپنا کاروبار ہمیشہ کیلئے ختم کر کے واپس گھر لوٹ آیا اور پھر آرام سے رہنے لگا، کیونکہ وہ بے آرامی والی چیز ہی نہ رہی۔ بہر حال خدائے پاک کا یہ ارشاد یقیناً حق ہے ''وعسی ان تکرھو شینا وھو خیرلکم'' ترجمہ ''بعض دفع تم کسی چیز کو بُرا سمجھتے ہو لیکن وہ تمہارے حق میں اچھی ہوتی ہے''۔

جن کو اپنے نظریئے کی صداقت اور حق ہونے پر پورا یقین ہے، ان کیلئے اس میں

بھی یقیناً خیر ہی کا پہلو ہوگا۔ اللہ ان سب حضرات کو جزائے خیر دے۔

حق اور باطل کی آویزش ہو یا محض خیر کیلئے مسابقت، متضاد اور مخالف عناصر اور افراد کا وجود بجائے خود بہت ضروری ہے کہ وہی سفر کے شوق کا موجب ہوتا ہے اور وہی شوق مشکلات اور صعوبتوں سے نبرآزما ہونے کا حوصلہ اور حکمت عملی فراہم کرتا ہے۔ شاہین کی پرواز کیساتھ بادمخالف کی آویزش کے بارے میں حضرت علامہ اقبالؒ کا خیال بھی اسی اصول کو زیادہ واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

کارناموں کے چرچے:

حیات خان صاحب کی سیاست محض دونکتوں پر مرکوز ہے۔ سیاسی شخصیتوں کا خاتمہ اور ترقی وتعمیر کا چرچا، جہاں تک ترقی وتعمیر کا تعلق ہے تو میں کہہ چکا ہوں کہ تعمیر وترقی کے جس مفہوم کا عملی مظاہرہ انھوں نے پانچ سالہ دورحکومت میں کیا وہ ایک ڈویلپمنٹ کمشنر تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے ویسے بھی کسی جماعت یا سیاست دان کی ضرورت نہیں۔ سردار حبیب خان صاحب جو ہمارے ڈویلپمنٹ کمشنر تھے، انھوں نے اس سے بدرجہا زیادہ کام زیادہ احسن طریقہ سے انجام دیا تھا۔ یہ جو شخصیات کے خاتمے کی بات ہے تو محض تاریخ سے ان کی ناواقفیت اور ان کے اندر پوشیدہ کسی نفسیاتی کمزوری کو واضح کرتی ہے، کیونکہ تاریخ محض بے ہنگم اور خودکار کیمیائی وجوہات سے رونما ہونیوالے واقعات کا مرکب نہیں ہے بلکہ ساری انسانی تاریخ اچھی یا بری، شخصیات کے کارناموں کا ہی ریکارڈ ہے۔

شخصیات سے اختلاف تو ہوسکتا ہے لیکن ان کو ختم کرنے کی ذمہ داری کوئی نہیں لے سکتا ہے۔ کیونکہ فطرت کا سارا نظام شخصیات ہی چلا رہی ہیں۔ اگر شخصیات کو نکال دیا جائے تو یہ انسانی دنیا نباتات، جمادات اور حیوانات سے زیادہ مختلف نہ ہوگی۔ البتہ حیات خان صاحب کی طرح ایسے لوگوں کے نشان ملتے ہیں جو اپنی کمزوری کا انتقام مخلوق خدا کے قتلِ عام کے ذریعے لینے اور ہر اچھی قدر کو مٹانے کے درپے رہے ہیں۔

جہاں تک تعمیر و ترقی کا تعلق ہے آزاد کشمیر میں 1970ء سے 1975ء تک ہر شعبہ میں جو ترقی ہوئی ہے وہ باضابطہ کتابوں کی شکل میں چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ 1975ء سے 1980ء کا جو پانچ سالہ منصوبہ ہم نے منظور کیا تھا اور رقم بھی اس کیلئے مختص ہوئی تھی، اس کا تو حلیہ ہی بگاڑ دیا گیا۔ باقی جس تعمیر و ترقی کا حیات صاحب ذکر کرتے ہیں وہ عوام کے سامنے پیش کریں تا کہ معلوم ہو جائے کہ وہ کس قسم کی ترقی و تعمیر چاہتے ہیں۔ کیونکہ باوجودیکہ ان کے دور حکومت میں حکومت پاکستان نے کروڑوں روپے ترقی کیلئے دیئے جو ہماری حکومت کو نہیں ملے تھے، وہ کسی خاص تعمیر و ترقی کا عملی مظاہرہ نہیں کر سکے۔

محمد حیات خان صاحب کی جماعت ''تحریک عمل'' کی سیاسی اور قومی سوچ کے معیار کا اس سے بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے منشور میں ایک شق ایسی ہے کہ لوگ وہی کچھ کریں گے جو حکومت پاکستان کہے گی، حالانکہ سیاسی ضرورت کا تقاضا تو جیسا کہ ہم لوگ سوچتے ہیں، یہ ہے کہ حکومت پاکستان، آزاد کشمیر اور کشمیر کے معاملے میں وہی کچھ کرے جو ہم لوگ بتائیں، کیونکہ ان معاملات میں ہماری رائے ہی زیادہ صائب اور درست ہوسکتی ہے۔ چنانچہ مسلم کانفرنس کی حکومت کے دوران بالکل ایسا ہی ہوتا رہا۔ لیکن یہ بات وہی لوگ سوچ سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں جن کا اپنے آپ پر اعتماد ہو اور ان کی سوچ میں ملکی مفادات کو ہر چیز پر ترجیح ہو۔ حیات خان صاحب کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ یہ بھی تشخیص کر سکیں کہ ملکی مفادات کیا ہیں؟ اور ان کے تقاضے کیا ہیں؟ حیات خان صاحب کا پورا دور حکومت میرے اسی خیال کی زندہ اور ناقابلِ تردید دلیل ہے۔

آزاد جمہوری پارٹی:

اس چھ جماعتی اتحاد میں ایک اور جماعت جو چند ہفتوں کی پیداوار ہے ''آزاد جمہوری پارٹی'' ہے۔ یہ سردست محض دو شخصیات پر مشتمل ہے۔ ایک صدر ہیں اور ایک جنرل سیکرٹری، ہم ہی سے علیحدگی اختیار کرنے والے دوست ہیں۔ ابھی تک نہ کوئی تنظیم ہے نہ

منشور۔ ان میں سے ایک تو تحریک عمل میں چلے گئے ہیں، صرف ایک صاحب رہ گئے ہیں۔ اسکے علاوہ ایک اور نئی جماعت ''اسلامی جمہوری پارٹی'' ان چند دوستوں پر مشتمل ہے جن میں سے کچھ تو ذہنی طور پر مسلم کانفرنسی ہیں۔ مگر اپنی جلد بازی اور سیاست کے بارے میں غلط اندازہ لگانے کی وجہ سے جماعت سے علیحدہ ہوئے۔ کچھ دوست ایسے بھی ہیں جو ذہنی طور پر کسی بھی سیاسی جماعت یا اس کے منشور کے قائل ہیں نہ پابند۔

اس اتحاد کا ایک اور جزو وہ ہے جسے انقلابی محاذ کہتے ہیں۔ یہ بھی حال ہی میں معرض وجود میں لایا گیا ہے۔ ان کا مقصد اور منشور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوٹلی کی کم از کم تین برادریوں کا انتخابی اتحاد قائم کریں۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کر لیں تو پھر کوٹلی ضلع کی زیادہ نہیں تو چار سیٹوں پر طالع آزمائی کی بظاہر کافی گنجائش نکل آئے گی۔ یہ اتحاد ہماری سیاست میں فکری پستی کی اپنی مثال آپ ہے۔ جن قبائل عصبیتوں کو خدا کے حبیب ﷺ نے اپنے آخری حج مبارک کے خطبہ میں اپنے مبارک قدموں کے نیچے روند ڈالا تھا، یہ دوست گویا اس کو وہاں سے نکال کر پھر زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ سیاسیات میں ایسے اتحادوں کا کیا مقام ہے؟ وہ اپنی جگہ، مگر یہ تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف کھلی جنگ بھی ہے۔ مسلمانوں کو تقسیم کرنے کا اس سے بدتر کوئی طریقہ آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔ ریاست جموں وکشمیر میں مہاراجہ ہری سنگھ مسلمانوں کی قوت کمزور کرنے کیلئے برادریوں کی تنظیموں کی حوصلہ افزائی کرتا رہا، مگر اس زمانہ میں یہ بات نرالی معلوم ہوتی ہے۔ تاہم ابھی تک کے قرائن سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اتحاد اولاً تو قائم ہی نہیں رہے گا اور اگر بدنصیبی سے اسے قائم رکھا ہی گیا تو اس کی افادیت محل نظر ہو گی۔

جماعت اسلامی

مسلم کانفرنس کی مخالفت:

اس چھ جماعتی اتحاد کا آخری دستہ جماعت اسلامی آزاد کشمیر ہے۔ انا لله و انا الیه راجعون ، اور کیا کہنا چاہیئے ۔ اگر جماعت اسلامی کی نسبت پاکستان کی حمایت سے نہ ہوتی تو پھر معاملہ قدرے مختلف ہوتا۔ کیونکہ یہ لوگ بھی آخر اُنہیں لوگوں میں سے ہیں جن کا ذکر میں ابھی کر آیا ہوں۔ جماعت اسلامی آزاد کشمیر کسی اعتبار سے بھی پاکستان کی جماعت اسلامی کے ساتھ سوائے نام کے اپنی خصوصیات میں کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ البتہ اس جماعت کے کارکنوں نے اصل جماعت کیلئے غیر ضروری مشکلات پیدا کی ہیں بلکہ ان کی بدنامی کا باعث بنے ہیں۔ جس شخص کا واسطہ آزاد کشمیر کے ان لوگوں سے پڑے گا، وہ اصل کے بارے میں کیا قیاس کرے گا؟۔

اول تو یہ بھی قابل غور ہے کہ کیا اس جماعت کا دائرہ کار آزاد کشمیر تک بڑھایا جانا

قومی مقاصد کے نقطہ نظر سے مفید بھی ہے؟ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ وہ تو اپنی جگہ، مگر اس جماعت نے وجود میں آنے کیساتھ ہی براہ راست مسلم کانفرنس کی مخالفت شروع کر دی۔ اس کی اور بھی وجوہات ہوں گی لیکن شاید یہ وجہ بھی ہو کہ جو صاحب اس جماعت کے پہلے امیر مقرر کیے گئے وہ مسلم کانفرنس کے دیرینہ کارکن تھے۔ ان کو جماعت اسلامی نے فی الفور اپنا امیر مقرر کردیا۔ اولاً تو یہی امیر خود جماعت کے اپنے مزاج اور طریقہ کار کی ایسی خلاف ورزی تھی جس نے اپنا اثر ضرور دکھانا تھا۔ جماعت اسلامی آزاد کشمیر پر بہت جلد سیاسی رنگ چڑھ گیا اور آج وہ جماعت آزاد کشمیر جماعت سے بھی کم درجے کا خالص سیاسی گروہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مسلم کانفرنس کی مخالفت گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔

مخالفت کا ردعمل:

اس کا ردعمل اور نتیجہ بھی وہی ہوا جو ان حالات میں ہوسکتا ہے۔ تفصیلات میں اس وقت جانہیں سکتے۔ مگر میں نے پاکستان کی جماعت اسلامی کے مرکزی قائدین کے ساتھ بار بار کوشش کی کہ یہ تلخیاں ختم ہو جائیں۔ لیکن ان حضرات نے سنی ان سنی کر دی۔ میرے خیال میں ان کا گمان یہ ہے کہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ ہمارے درمیان افہام وتفہیم کیلئے جو بات ایک طرح کی شرط معلوم ہوتی ہے، وہ محض اور خالصتاً سیاسی نوعیت کی ہے، وہ بھی ایسی ہے جسے ہم اصولاً قبول نہیں کر سکتے۔ ورنہ اگر ہم اس اصول کو تسلیم کر لیں تو آزاد کشمیر میں کسی مؤثر فرد کیساتھ ہمارا اختلاف ہی شاید باقی نہ رہے۔ تاہم تلخیاں اب اس درجہ بڑھ گئی ہیں کہ ان کا اثر تعلیمی اداروں اور دوسرے سماجی حلقوں تک پھیل رہا ہے ورنہ اس برائے نام اور منفی اتحاد میں جماعت اسلامی کا شامل ہونا ان کی خود اپنی نفی سے کم نہیں ہے۔

مشترکہ مقصد کا تقاضا:

ان حضرات کی منطق بھی عجیب ہے، اگر مقصد سیاست اسلام کی خدمت ہے تو مسلم کانفرنس اس وقت بھی پورے برصغیر میں ان سب سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں کم از کم نصف صدی آگے ہے۔ نہ صرف اصولاً آگے ہے بلکہ ایسی اعلیٰ صلاحیتوں کا عملی مظاہرہ کر چکی ہے جس کی مثال لانا اس دور میں ممکن نہیں ہے، تو پھر انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ہمارے بعد آنے والے وہ حضرات جن کا مقصد بھی وہی ہے وہ بدون کسی شرط ہمارا ساتھ دیتے تاکہ اس مشترک مقصد کو حاصل کرنے میں مدد مل سکتی۔ اسلام کا اپنا طریقہ بھی یہی ہے کہ اگر مسجد میں ایک جماعت پہلے سے کھڑی ہے تو بعد میں آنے والے بشرطیکہ وہ بھی نماز پڑھنا چاہتے ہوں، کوئی اور نماز مقصود نہ ہو تو ان کے لیے دوسرا کوئی طریقہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ بھی اس جماعت کیساتھ مل کر اپنی نماز پوری کریں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ بعد میں آنے والے کچھ لوگ اپنی صفیں بنا کر کھڑے ہو جائیں اور یہ مطالبہ کریں کہ پہلے آنے والے پیچھے مڑ کر ان کیساتھ شامل ہو جائیں، یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ اس تمام قصے سے اصل مقصد پر ہی بد گمانی ہوتی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اصل مقصد سیاسی اقتدار حاصل کرنا ہے اور وہ بھی ہر جائز و ناجائز طریقے سے، اسلام کا نام تو محض ایک ذریعہ ہے۔ اللہ معاف کرے، اقتدار حاصل کرنے کے اس طریقہ کار کو ہمارے لوگ پہلے ہی مسترد کر چکے ہیں۔

پاکستان میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے مگر آزاد کشمیر میں یہ بات بغیر کسی تعلّی کے بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ اسلام کے سیاسی غلبے کیلئے مسلم کانفرنس کے سوا کسی کے پاس پروگرام ہے نہ صلاحیت۔ البتہ کئی حضرات غلط فہمی میں ضرور مبتلا ہوں گے کہ شاید یہ ایسا سہل کام ہے کہ وہ اس کو منٹوں سیکنڈوں میں کر ڈالیں گے۔ اسلام چاہنے والوں کو تو خدائے ذوالجلال کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ ان کی سیاست میں ایک ایسی جماعت موجود ہے جو نہ صرف عقیدے میں کامل ہے بلکہ اپنے قول و فعل کے اعتبار سے ہر مشکل سے مشکل دور کی، آزمائشوں میں خدا کے فضل و کرم سے ثابت قدم رہی ہے اور اس نے وہ کام کر دکھائے ہیں

جو اگر اس وقت نہ ہوئے ہوتے تو آج پاکستان میں زیادہ نہیں تو دس بارہ سال پیچھے ہوتے بلکہ کچھ عجب نہیں کہ وہ کام ابھی تک پاکستان میں شروع ہی نہ ہوا ہوتا۔

کیا خدا کی ناشکری نہیں اور اسلام کے مقاصد سے بے وفائی نہیں کہ اس جماعت کی امداد کرنے کی بجائے اس کو کمزور کرنے کی کوشش کی جائے اور ان کی عوامی قوت کو تقسیم کرنے کے منصوبے بنائے جائیں۔ اس سے بدگمانی بھی پیدا ہوتی ہے کہ ان حضرات کا اسلام سے مقصد ہی غالباً کچھ اور ہے یا ان کا اسلام ہی کوئی دوسرا ہے، اللہ بچائے۔ کیونکہ اگر مقصد وہی ہوتا جو تاریخی تسلسل کا حصہ ہے تو پھر مسلم کانفرنس سے بڑھ کر تو کیا ابھی اس کے قریب بھی کسی کے آنے کا امکان دور دور تک نظر نہیں آتا۔ افراد اور شخصیات کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ اگر اخلاقی قاعدوں اور ضابطوں کی بنیاد پر اور ماضی کی خدمات کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو مسلم کانفرنس مجموعی طور پر قابل رشک دکھائی دے گی، بشرطیکہ فرشتوں کی دنیا کا تصور نہ ہو بلکہ اسی بشری تقاضوں والی دنیا کی بات کریں۔

جماعت اسلامی کے ساتھ اس تلخی کا ایک حالیہ شاہکار میرے گاؤں غازی آباد کا واقعہ ہے یہ جھگڑا دو خاندانوں کا تھا اور نہ کسی بعید قیاس وجہ سے بھی سیاسی تھا۔محض دو بھائی کسی ذاتی وجہ سے لڑ پڑے تھے، لیکن تماشہ دیکھئیے کہ اس پر جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ نے کس ردعمل کا اظہار کیا اور ان مظاہروں میں بھی ہمارے بارے میں کیا زبان استعمال کی۔ کسی بھی ذمہ دار شخص نے یہ معلوم کرنے کی تکلیف نہیں کی کہ اس واقعہ کو اس قدر طول دینے کی کوئی معقول وجہ بھی ہے یا نہیں؟ عقلمندی کا تقاضا تو تھا کہ اگر خدانخوستہ یہ واقعہ سیاسی بھی ہوتا تب بھی اس کو ذاتی سمجھا جاتا، کیونکہ عقل و دانش کا تقاضا فساد کو روکنا ہے، پھیلانا نہیں ہے۔ عقل کے کسی قرینے سے دیکھا جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ حقیقت کیا ہے؟ تاکہ اس سے جماعت کی اندرونی سوچ اور طریقہ کار کا بھی علم ہو جائے۔خصوصاً وہ لوگ اس سے واقف ہو جائیں جو دونوں طرف ہمدردی رکھتے ہیں۔

جماعت اسلامی کے بارے میں مزید ایک، دو امور کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ایک تو اس لیے ہم اپنی پوزیشن واضح کرنا چاہتے ہیں، کیوں کہ جماعت کے پاس تو منظّم پروپیگنڈا مشین ہے، ہمارے لیے سچ بات کا اظہار کرنا بھی وقت طلب ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے ہماری سیاست کے بعض باریک گوشوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ تیسرے اس لیے کہ شاید جماعت اسلامی کے لوگ اپنی فکری، جسمانی اور مادی توانائیاں فضول ضائع کرنے کی بجائے کسی اچھے کام پر مرکوز کرسکیں۔ پاکستان اور اس سے باہر بعض ایسے دوست احباب ہیں جو یک طرفہ اور منظّم طریقہ سے پھیلائی گئی خبریں سنتے رہتے ہیں اور کبھی یہ گمان ہوتا ہو کہ جماعت اسلامی کیساتھ تعلقات خراب ہونے کیلئے شاید صرف ہم ہی ذمہ دار ہیں۔ یہ بات بدقسمتی سے جماعت کا مزاج بن گئی ہے کہ ان کے لوگ کسی حالت میں بھی قصوروار یا ناقص نہیں ہو سکتے۔ وہ ہر حال میں معصوم ہیں اور باقی ہم سب ہر حال میں گنہگار۔

مخالفت کا ذمہ دار کون:

اس وقت آزاد کشمیر کی جماعت اسلامی کے اور ہمارے درمیان خاص کر میری ذات کے ساتھ تعلقات کی جو نوعیت ہے اور اس میں کون کتنا ذمہ دار ہے، اس کا اس واقعہ سے کچھ اندازہ ہوسکتا ہے کہ چند سال قبل جب کہ ابھی ہم نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی تنظیم کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی، آزاد کشمیر کے کالجوں میں انتخابات کے دوران میرے قریب ترین کالج دھیرکوٹ میں اسلامی جمعیت طلبہ جیت گئی۔ اس وقت اس تنظیم میں اکثر و بیشتر لڑکے مسلم کانفرنس کے کارکنوں کے عزیز و اقارب تھے۔ ہم نے بھی ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا جمعیت جب جیت گئی تو انھوں نے جو مظاہرہ کیا، وہ نہ صرف غیر ضروری تھا بلکہ ہماری جماعت کیلئے بالعموم اور میری ذات کیلئے بالخصوص ایک کھلا چیلنج بن گیا۔ ان طالب علموں نے صرف اسی مقامی مظاہرے پر اکتفانہ کیا اشتہارات بھی چھپوا کر تقسیم کیے کہ ’’سردار قیوم کو اس کے گھر میں شکست ہوگئی ہے‘‘۔

یہ اشتہارات صرف دھیرکوٹ میں نہیں بلکہ آزاد کشمیر اور پاکستان میں بھی چسپاں کیے گئے۔اس کا جو ردِعمل ہونا تھا وہی ہوا۔

جماعت اسلامی کا طرزِ عمل:

آج بھی جن بچوں کو ہم سختی سے کہتے ہیں کہ وہ ایم۔ایس۔ایف میں شامل ہو جائیں وہ زیادہ تر ہمارے کارکنوں اور ساتھیوں کے بچے ہیں، مگر یہ عجیب ناراضگی ہے کہ جماعت والوں کو تو حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمارے بچوں کو اسلام کے نام پر اپنی پوری تاریخ سے ہی نہ صرف دور کر دیں بلکہ اس کے مخالف بھی کر دیں تو عین ثواب ہے۔ لیکن ہم اپنے انہیں بچوں کو اپنی ہم مسلک تنظیم مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف بلائیں تو ہم مجرم اور قابل گردن زدنی ٹھہرتے ہیں۔ اگر جماعت والے ہمارے کسی کارکن کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ورغلا لیں تو عین اسلام ہے اور اگر ہم اسے واپس لے آئیں تو ہم مجرم ہیں، یہ منطق بھی کیسی عمدہ ہے؟

آگے چل کر میں یہ بھی عرض کروں گا کہ یہ حضرات سیاسی میدان میں عملاً کیا کر رہے ہیں؟ طالب علموں کے سلسلہ میں، میں نے ان نوجوانوں سے بھی کہا کہ اگر ایک مسلم کانفرنسی کا بیٹا مسلم کانفرنس کی کسی مخالف تنظیم میں چلا جاتا ہے تو وہ انتخابات میں ایسی حالت میں کیا کرے گا، جب کہ ایک طرف اس کا باپ یا بھائی یا دادا مسلم کانفرنس کا امیدوار ہو اور دوسری طرف اس جماعت کا امیدوار ہو۔ اگر وہ لڑکا قرابت داری کی بنیاد پر ووٹ دیتا ہے تو اس تنظیم سے لفظ غداری ثقیل ہے تو یہ بیوفائی بہر حال ہے اور اگر تنظیم والوں کے امیدوار کا ساتھ دیتا ہے تو اپنے گھر سے بے وفائی اور پھر جدائی کی نوبت بھی زیادہ دور نہیں، بشرطیکہ اس مسلم کانفرنسی امیدوار کا جس کا وہ عزیز ہے خود اپنا ہی عقیدہ خراب نہ ہو گیا ہو۔ تو آخر یہ لوگ آزاد کشمیر میں اس جواں نسل کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ ایسے ہی کئی گھر اسی طرح بربادی اور تباہی کے دھانے پر کھڑے کر دیئے گئے ہیں۔ اس سے اسلام کی کیا خدمت مقصود ہے؟

ہم نے تو دوسرے سیاسی عقائد رکھنے والے کے کسی بچے سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے بزرگوں کیساتھ دھوکہ کرے باوجودیکہ یہ سب لوگ ایک عرصہ تک مسلم کانفرنس میں ہی تھے۔ اگر ہم لوگ خود بد اخلاقی اور بے عقیدگی کا درس دینے لگیں تو وہ اخلاقی معاشرہ جس کی ہم کوشش کرتے ہیں کب اور کیسے پیدا ہو گا؟ نوجوانوں میں منافرت کا جو رجحان پھیل رہا ہے اس کا کیا تذکرہ کیا جائے مگر اس کا نتیجہ محض ایسی خانہ جنگی ہی ہوسکتی ہے کہ ایک جماعت والے باقی لوگوں کو بروز شمشیر فتح کریں، وہ تو ہو گا نہیں لیکن اس کا فائدہ دشمن کو ضرور ہو گا۔

طلبہ کی اصلاح بندی اور اس کے نتائج:

اس طرز عمل کا ایک سنگین ردعمل ہم بھٹو صاحب کی پھانسی پر سرینگر میں دیکھ چکے ہیں۔ سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو مسلح کرنے کا کام بے حد خطرناک ہے مگر بدقسمتی سے یہ کام ہو رہا ہے، خاص طور پر تعلیمی اداروں میں، بعض تعلیمی ادارے تو محض اسلحہ خانے اور دہشت گردی کے اڈے بن رہے ہیں۔ پاکستان میں تو شاید بعض مقامات پر اس کا کوئی لغو سا جواز موجود ہے کیونکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر یہ لوگ بھی دہشت گردی کا مظاہرہ نہیں کریں گے یا اس میں برتری حاصل نہیں کریں گے تو پھر کوئی دوسرا طبقہ اور خصوصیت کیساتھ جن کو یہ ''سرخے'' کہتے ہیں، ایسا کر لے گا۔ اس لیے کہ ان کے پاس کوئی مذہبی اخلاقی یا تعمیری فکر تو ہے نہیں کہ اس سے کسی کو متاثر کرسکیں۔ یہ بات اگرچہ امر واقع ہے لیکن میں نے اس کو جواز اس لیے کہا ہے کہ اگر اسلام کا نام لینے والی قوتیں اخلاق، انسانیت اور شرافت کی قدروں کو خود کمزور سمجھنے لگیں تو پھر ہر اعتبار سے دوسرے ہی بہتر ہیں۔ کیونکہ وہ کم از کم دو کشتیوں پر سوار نہیں ہیں۔ اسلام میں طاقت کا مظاہرہ ایک آخری امر ہے، وہ بھی محض دفاع کیلئے اور ایک حد تک دہشت گردی پر انحصار کرنا تو اسلام کی روح کے ہی منافی ہے۔

آزاد کشمیر میں جمعیت کا کردار:

آزاد کشمیر کے کالجوں میں تو یہ بات ایک معمول ہے کہ ایم ایس ایف کے مقابلے میں جمعیت کے عزیز طلباء نہایت سہولت کے ساتھ تمام تنظیموں کیساتھ اتحاد کر لیتے ہیں جو سرے سے لادینیت کی حامی اور دوقومی نظریئے کی کھلی مخالف ہیں بلکہ ان کے اخلاق و عادات میں بھی اصل اختلاف سرخ اور سبز میں نہیں ہے بلکہ وہ ایم ایس ایف اور جمیعت میں ہے۔ اگر بائیں بازو والوں کا مقابلہ مقصود ہے، جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے اور بے شمار لوگ ایسے ہیں جو تعلیمی اداروں میں اسلام اور شرافت کی حکمرانی چاہتے ہیں تو پھر مقابلہ اس طرح تو ہرگز نہیں ہوسکتا کہ دو طاقتور ہم خیال تنظیمیں آپس میں بھی لڑیں اور مخالفوں کی حمایت بھی برابر کرتی رہیں۔

مخالف نظریات کا متحدہ محاذ:

یہ حال آزاد کشمیر میں محض جمیعت ہی کا نہیں بلکہ خود جماعت اسلامی کا طرزِ عمل بھی بالکل یہی ہے۔ وہ جو پہلا ''قومی محاذ'' بنا۔ اس میں بھی مسلم کانفرنس کی مخالفت ہی قدرِ مشترک تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ محاذ رائے شماری کو بھی اس اتحاد میں بڑی کوشش اور تگ و دو کے ساتھ شامل کیا گیا تھا، وہ اتحاد بھی انتخابی اتحاد تھا۔ ان اتحادوں سے ہمارے سیاسی کردار کے پوشیدہ پہلو بھی دکھائی دیتے ہیں۔ کئی جماعتوں کے لوگ جو ایک دوسرے کیساتھ عقائد کا شدید اختلاف رکھتے ہیں، وہ بھی مسلم کانفرنس کی مخالفت میں متحد ہو جاتے ہیں۔ اتحاد بھی کوئی عارضی نہیں بلکہ انتخابی اتحاد، جس میں منشور اور نظریات وغیرہ سب ہی پر کھلی زد پڑتی ہے۔ دیو بندی مکتب فکر والے حضرات جو جماعت اسلامی کے بارے میں ایک واضح مذہبی موقف رکھتے ہیں وہ بھی اس کو حسب ضرورت نرم کر دیتے ہیں اور طرفہ تماشہ یہ کہ وہ ضرورت بھی کوئی اضطراری اور غیر اختیاری نہیں بلکہ محض عارضی۔ اس کے حق میں مفتی محمود مرحوم کی مثال دی جاتی ہے اور آزاد کشمیر میں ہمارے اور محاذ رائے شماری کے اتحاد کی بات بھی کی جاتی ہے، مگر سب کو معلوم

ہے کہ آزاد کشمیر میں ہمارا یہ اتحاد محض وقتی اور چند نکات کے ساتھ مشروط تھا۔ یوں بھی وہ کوئی انتخابی اتحاد ہرگز نہیں تھا کہ اس سے ہمارے عقائد یا مقاصد پر کوئی زد پڑتی یا آنچ آتی ہو۔

پاکستان میں تو قومی اتحاد نہایت ہی خوفناک حالت میں معرض وجود میں آیا تھا۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ کون سلامت رہے گا۔ اس قومی اتحاد میں اولین امر خوف کا تھا جو اضطراری ہے اور اس میں بعض رخصتیں خود بخود موجود ہیں اور فطرت انسانی کا حصہ ہیں۔ ہمارا یہ چار جماعتی اتحاد یا اتفاق رائے بھی بعینہ اسی قسم کے خوف و خطر کی فضا میں قائم ہوا تھا اور ہم نے اسکے مقاصد میں اس کو واضح کردیا تھا۔ لیکن کیا آج یہاں آزاد حکومت کے ہاتھوں کوئی ادنیٰ سی تکلیف بھی پہنچی؟ مذہب کے اعتبار سے ہماری جماعت مسلمانوں کے تمام فرقوں پر مشتمل ہے۔ سیاسی طور پر کسی محبّ وطن کو ہم سے کوئی ادنیٰ سا خوف بھی نہیں ہوسکتا۔ البتہ ڈر اُن کو ضرور ہونا چاہیئے جو اس ملک میں تخریب کرنا چاہتے ہیں۔ ڈر بھی یہ نہیں کہ ان سے خدانخواستہ کوئی انتقام لیا جائے گا بلکہ ڈر صرف اس بات کا کہ وہ دھوکے سے لوگوں کو گمراہ نہیں کرسکیں گے، وہ خاص سیاسی امور اور حالات جن کی آڑ لے کر وہ اپنا شکار کھیلتے ہیں، پیدا ہی نہیں ہونے دیئے جائیں گے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس چھ جماعتی اتحاد کو اضطراری کیفیت نہیں کہا جا سکتا، اور اگر ایسا نہیں تو پھر اس اتحاد کے مقاصد واضح ہیں کہ مسلم کانفرنس کو شکست دینا مقصود ہے جو کوئی دینی کام ہے نہ سیاست کے لیے کسی درجے میں مفید، بلکہ سیاست میں تو یہ بات اس ملک کے مفادات کیساتھ ایک طرح کی دشمنی ہے۔ میں تو یوں بھی اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ حکومت کسی سختی سے دوسروں کے نظریات کو دبائے، خاص طور پر جب یہ معلوم ہو جائے کہ وہ نظریات محض بے بنیاد اور بودے ہیں۔ ایسے میں تو صرف اسی قدر کافی ہوتا ہے کہ ہم لوگ اپنا کام ٹھیک سے کریں، پھر کسی منفی نظریئے کے ابھرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن جب ہم اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں تو اس خلاء کو ''دیو'' پر کر سکتے ہیں۔ کوئی چیز خلا میں تو رہ نہیں سکتی۔ یہی کچھ میں نے اپنے دور صدارت میں کیا تھا۔ جس سے آزاد کشمیر میں اُبھرنے والا خود مختاری کا فتنہ

جلد ہی تقریباً معدوم ہوگیا تھا، میں نے تو ان لوگوں کے کسی مفاد کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ البتہ یہ حکومت کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ قومی خزانے سے تنخواہیں دے کر تخریب کاری نہ کرنے دے اور بس اپنے گھر سے کھا کر اگر کوئی طبع آزمائی کا خواہش مند ہے تو اس کا مقابلہ اسی میدان میں کیا جا سکتا ہے۔

مخالف نظریات کے پنپنے کے اسباب:

ہمارے ملک میں یا کسی دوسرے ملک میں جہاں کہیں منفی نظریات ابھرتے ہیں تو محض اور محض اس لیے کہ مسلمان قائدین اور کارکنوں نے اپنا صحیح کام چھوڑ دیا ہے، وہ اپنے کردار کی عظمت کا سکہ منوانا تو کجا اپنے کردار کی تعمیر ہی نہیں کر سکے۔ اس لیے ان کو بظاہر اسلام کی حفاظت کیلئے مگر دراصل اپنی حفاظت اور بقاء کیلئے طاقت کے استعمال کا سہارا لینا ہماری مخالف قوتوں کی حتمی الامکان کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ ہمیں ہمارے اصل میدان یعنی اخلاقی قوت سے ہٹا کر خالص مادی وسائل کے میدان میں لے آئیں، جہاں کہیں ایسا ہوا وہیں دوسروں کو فتح ہوگئی۔ اس لیے ہماری حکومت سے کسی کو کیا ڈر یا خطرہ ہوسکتا ہے۔ ہم تو اس کیلئے تیار ہیں کہ اگر ہمیں اللہ تعالیٰ موقع دے تو ہم حکومت کے کام تنہا نہ کریں، بلکہ اپنے دوسرے ہم خیال لوگوں کو ساتھ لے کر چلیں۔ لیکن اس کا طریقہ یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم اقتدار سے قبل ہی اقتدار کی تقسیم شروع کر دیں۔ ہمارا نقطہ نظر تو یہ ہے کہ اقتدار کیلئے اہلیت حاصل کرنے میں ہر جماعت کو خود اپنے گھوڑے دوڑانا چاہئیں، جب اسمبلی معرض وجود میں آجائے تو ہم خیال لوگوں کو بہرصورت یکجا ہوکر قومی ذمہ داریاں سنبھالنا چاہییں۔ اس میں کسی سودے بازی یا اصولوں پر سمجھوتے کی نوبت ہی کیوں آئے۔

”کشمیر بنے گا دارالسلام“ کا نعرہ:

جماعت اسلامی کے سیاسی طرز عمل کے بارے میں بھی کچھ کہنا ہے، ایک تو یہ کہ

آزاد کشمیر میں اسلامی جمعیت طلبہ نے جو اصل جماعت اسلامی ہے اب یہ نعرہ لگانا شروع کیا ہے کہ ''کشمیر بنے گا دارالسلام''۔ ذرا غور فرمائیے کہ ایک طرف نصف صدی سے یہ پوری قوم اس جہاد میں مصروف ہے کہ ''کشمیر بنے گا پاکستان'' یعنی ''الحاق پاکستان'' تو دوسری طرف بعض عناصر جو بھی وجہ ہو وہ، نعرہ لگا رہے ہیں کہ ''کشمیر بنے گا خودمختار'' اور ''کشمیر کو تسلیم کرو'' پھر اگر یہ بھی یاد رہے کہ خودمختاری کے پس پردہ جو لوگ ہیں ان کی ذہنیت کیا ہے؟ ان کے مقاصد کیا ہیں اور وہ عملاً کیا کر رہے ہیں؟ تو ایسی صورت حال میں ''دارالسلام'' کے نعرے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم اس کو محض معصومانہ فعل ہی سمجھ لیں، جیسا کہ بتایا جاتا ہے کہ یہ لفظ چونکہ قرآن و حدیث میں آیا ہے اس لیے اسی کو اختیار کیا جائے، تو کیا اس سے خود پاکستان کی نفی نہیں ہوتی؟ کیونکہ آج تک کشمیریوں کا دارالسلام تو پاکستان رہا ہے۔ پھر نیا دارالسلام کون سا ہے۔ اگر اس سے مراد پاکستان ہے تو پھر پاکستان کہنے میں کیا بات ہے؟ خاص کر اب 37 سال بعد اس تبدیلی کا کیا مطلب ہے؟ اگر اس سے مراد پاکستان نہیں ہے، جیسا کہ فی الواقع نہیں ہے، تو اس کا مقصد ''خودمختاری''وغیرہ کی تحریکوں سے کس طرح مختلف ہو گا؟ اس کا مطلب تو صرف یہ ہو گا کہ کشمیر بے شک خودمختار ہو مگر اس کا نام بجائے خودمختار کشمیر کے دارالسلام ہو جائے، بس قابل قبول ہو جائے گا۔ کیسی نرالی منطق ہے، اس کو کوئی افلاطون ہی سمجھ سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے تو الحاق پاکستان کی بات تھی مگر چونکہ اس سے کچھ نہیں بنا اس لیے اب پہلے کشمیر کو دارالسلام بناؤ پھر الحاق کریں گے، تو ایک سیدھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پاکستان دارالسلام نہیں ہے یعنی خدانخواستہ دارالکفر ہے تو پھر کشمیر کے اس قیمتی دارالسلام کا الحاق دارالکفر کیساتھ کیوں کر ہو گا۔ اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ پھر ہم کشمیر میں بیٹھ کر پاکستان کی طبیعت درست کریں گے، اس کو دارالسلام بنائیں گے اور پھر الحاق کریں گے۔ وہ بے چارہ شیخ چلی مفت میں بدنام ہوا۔

یہ دارالسلام کا نعرہ جو علیحدہ قومیت کی بنیاد پر مبنی ہے، اس کا مفہوم بالکل ایسا ہی ہے

جیسے پاکستان کے کسی ایک صوبے کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس کو دارالسلام بنایا جائے گا۔ یعنی پنجاب بنے گا دارالسلام یا سرحد بنے گا دارالسلام وغیرہ۔ البتہ ایک غور طلب امر یہ ہے کہ خودمختاری کا نعرہ خالص لادینی نظریات پر مبنی ہے، جب کہ عین اسی زہر کو مذہبی شکر چڑھا کر کھا لیا جائے تو موجب صحت ہوگا۔ سبحان اللہ و بحمدہ۔ اس نعرے سے تو وہ لوگ جو خودمختاری کے لادینی نظریئے سے متاثر نہیں تھے، وہ بھی متاثر ہونے لگیں گے اور اس طرح تخریب کاری کیلئے زمین خوب ہموار ہوسکتی ہے۔ کاش! کہ یہ لوگ اس ملک کی قسمت کیساتھ مذاق نہ کرتے اور آزادی کی اس غیر مترقبہ نعمت کی تضحیک کر کے اس طرح اس کی ناشکری نہ کرتے۔

اکابرین جماعت سے ایک گزارش:

خدا کرے کہ میری یہ بات جماعت اسلامی کے ان اکابرین کی سمجھ میں آ جائے جن کا وطن خود پاکستان ہے۔ وہاں اگر خدانخواستہ اسی پاکستان کے بارے میں شکوک وشبہات ہیں تو پھر ہرچہ خواہی کن، اس نقارخانے میں کون کسی کی سنتا ہے۔ جماعت اسلامی کے پاکستانی اکابرین کو میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر آپ اس ڈرامے میں شریک نہیں ہیں تو پھر آپ یہ مار آستین کیوں پال رہے ہیں؟ اس سے نہ صرف جماعت اسلامی بلکہ پورا ملک متاثر ہوگا اور بھارت کے عزائم کو پنپنے میں مدد ملے گی۔ ان اکابرین کے نوٹس میں یہ بھی لانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ان حضرات کی دیکھا دیکھی یا اسی کو اس قوم کی پالیسی سمجھ کر مقبوضہ کشمیر کی جماعت کے لوگ بھی اب بجائے پاکستان کے ''اسلامی جمہوریہ کشمیر'' کی بات کر رہے ہیں۔ اس طرح کشمیری مسلمان کو اسلام کے نام پر مزید تقسیم کر دینے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

اب یہ کوئی راز نہیں ہے کہ کشمیر میں اسلامی جمعیت اور ایم ایس ایف کے مابین اس پر گفت وشنید بھی ہو رہی ہے کہ کوئی متفقہ لائحہ عمل اختیار کیا جائے کیونکہ فرق تھوڑا رہ گیا ہے۔ کشمیر کو قادیانیوں کی طرح ہی کہ وہ بھی اس کو مرزائی ریاست بنانا چاہتے تھے، جس کا نام

انہوں نے بھی ''دارالسلام'' تجویز کیا تھا، ایک علیحدہ مملکت بنایا جائے اور نام بھی وہی ہو۔ خدا کے لیے پاکستان سے علیحدہ کر کے کشمیر کو جماعت اسلامی کی ریاست بنانے کی راہ نہ اختیار کریں، اس کے دوسرے مضمرات کے علاوہ یہ ریاست کبھی بھی قائم نہ ہو گی، البتہ اس سے لادینی نظریات کو فروغ ضرور ملے گا۔ پھر جن لوگوں کو جماعت کے ان حضرات سے واسطہ پڑا ہے وہ تو ان کے مقابلے میں لادینی تو کیا اشتراکی ریاست کو بھی ترجیح دی جائے گی۔

(تصویر: سردار محمد عبدالقیوم خان، سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل شہید سے محو گفتگو)

مقبوضہ کشمیر کی صورت حال:

دوسری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ بھی اسی کا حصہ ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں حالیہ انتخابات سے کچھ عرصہ قبل وہاں کی جماعت اسلامی کے امیر عرب ممالک سے ہوتے ہوئے پاکستان اور آزاد کشمیر بھی آئے اور انھوں نے باا ثر سرکاری وغیر سرکاری شخصیات کیساتھ ملاقاتیں بھی کیں۔ میں نے بعض ذمہ دار حضرات کو بتایا کہ ان ملاقاتوں کا محض سیاسی مقصد ہے، یعنی کشمیر کے مسلمانوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ پاکستان کی حمایت ان صاحب کو حاصل ہے۔ لیکن میں نے سب کو بتایا تھا کہ یہ بہت خطرناک کام ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے مسلمان اس وقت محض اپنے مذہبی تشخص کو برقرار رکھنے کی آزمائش میں ہیں، کیوں کہ بھارت کیلئے شیخ محمد عبداللہ کی موجودگی میں جو مشکل تھی وہ اب نہیں ہے۔ بھارتی حکومت کو اپنا راستہ صاف کرنا زیادہ آسان نظر آتا ہو گا۔ اس کا راستہ صرف اسی طرح روکا جا سکتا ہے کہ وہاں کے تمام مسلمان اس امر کا احساس کریں اور اپنے ہزاروں اختلافات کے باوجود اسلامی تشخص کے لیے فاروق عبداللہ کا ساتھ دیں۔ چنانچہ میں نے اخباری بیانات میں اس اتحاد کی طرف توجہ دلائی اور خدا کا کرم ہے کہ اس پار کے مسلمانوں نے بھی اس کی نزاکت کو محسوس کیا، سوائے جماعت اسلامی، کہ ان پر ہمارے کلام نرم و نازک کا اثر نہ ہوا لیکن باقی تمام حضرات نے بالعموم اور

میر واعظ مولوی محمد فاروق اور شیخ فاروق عبداللہ کا اتحاد کیوں ہوا، مقبوضہ کشمیر میں مسلمانوں پر جو آفت ٹوٹی ہے اس کی بہت واضح دلیل ہے بشرطیکہ چشم بینا ہو اور دردمند دل ہو۔ مگر جماعت والوں کو اس کا کوئی احساس نہ ہوا ہوگا۔

جماعت اسلامی کے اس طرز عمل کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں اسمبلی میں گیلانیوں کی جو ذاتی اور ایک ہی سیٹ یقینی تھی وہ بھی چلی گئی، بلکہ لطیفہ یہ ہے کہ سرینگر ریڈیو نے کامیاب اور ناکام امیدواران کے جو اعلان کیے، ان میں جماعت والوں کا نام ہارنیوالوں کے قابل بھی نہ سمجھا گیا۔ دوسرا نقصان جو ناقابل معافی ہے وہ یہ ہوا کہ جماعت والوں نے جہاں جہاں اپنے امیدوار کھڑے کیے وہاں شیخ صاحب کے بعض لوگ ہار گئے اور مسلمانوں کے قاتل کانگریسی جیت گئے۔ اس طرح انھوں نے گویا مسلمانوں کے مقابلے میں اندرا گاندھی کا ساتھ دیا۔ نیت جو بھی ہو مگر یہ ہے وہ خدمت جو اس پار سیاسیات کشمیر میں جماعت اسلامی والے کر رہے ہیں۔ اس پر غریب مسلمانوں کا خدا جانے کتنا زور اور زر صرف ہو رہا ہے۔ بعینہ اسی طرح آزاد کشمیر کی صورت ہے یہاں بھی مسلم کانفرنس ہار جائے، مگر جو جیتے وہ ٹھیک ہے، کیونکہ مسلم کانفرنسیوں نے ریاست کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کر کے دو قومی نظریہ کو قبول کر کے اس پر عملدرآمد کر کے اور کافر کے خلاف جہاد کر کے ایک خطہ آزاد کروایا۔ نظریہ پاکستان کو منوایا، قادیانیوں کا مسئلہ حل کیا، اسلامی قوانین کی بنیاد رکھی اور سیاست میں رواداری شرافت اور الحاق پاکستان کے نظریہ پر عمل کیا ہے، شاید یہی وہ سنگین جرائم ہیں جن کیلئے ان لوگوں کو بہر حال سزا ملنا چاہیئے۔ واللہ یهدی من یشاء الی صراط مستقیم، ترجمہ! ''اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے''۔

آزاد کشمیر میں جماعت کا کردار:

آزاد کشمیر کی جماعت اسلامی کے سیاسی کردار کے بارے میں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ محمد حیات خان کی حکومت جو نہ صرف غیر آئینی تھی بلکہ غیر جمہوری اور تمام اخلاقی

تقاضوں سے عاری اور ملک کے مفادات کیلئے سب سے زیادہ نقصان دہ تھی، جب وہ آزاد کشمیر میں سیاسی قائدین کی کردارکشی کر رہی تھی تو جماعت اسلامی کے کارکن اس حکومت کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ اسی طرح جب سیاسی قائدین نے آزاد کشمیر میں جمہوریت کی بحالی اور اصلاح کیلئے تحریک چلائی اور وسیع پیمانے پر گرفتاریاں دیں تو اس جماعت کے لوگ اپنے بیانات کے ذریعہ محمد حیات خان صاحب کے بلا اعلان اور غیر قانونی مارشل لاء کے دوام کی بات کرر ہے تھے۔

بہر حال اس چھ جماعتی بندھن میں جو جماعتیں شامل ہیں، ان میں صرف لبریشن لیگ و جماعت اسلامی ہیں جن کا کردار نظریاتی ہے اور تادیر قائم رہ سکتی ہیں۔ باقی سب عبوری نوعیت کی ہیں اور حالات سے استفادہ کرنے کی خاطر وجود میں لائی گئی ہیں۔ یہ جو ایک عرصہ تک سیاسی عمل معطل رہا ہے، وہ بھی اس قسم کی موسمی پیداور کا سبب ہے۔

محاذ رائے شماری

تنظیم اور اس کے ارکان:

اب کچھ ان جماعتوں کے بارے میں بھی جو حال ہی میں معرضِ وجود میں آنے والے اس چھ جماعتی اتحاد کے علاوہ ہیں، ان جماعتوں میں جیسا کہ پہلے کہہ آیا ہوں، چار جماعتیں ایسی ہیں جو ایک عبوری اور مشروط اتحاد یا اتفاقِ رائے سے وابسطہ ہیں۔ ان میں ایک محاذ رائے شماری ہے جو اپنے سیاسی کارکنوں کی تعداد کے لحاظ سے کافی محدود ہے، اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کے اس نقطہ نظر کو کہ ''کشمیریوں کو استصواب کی صورت میں پاکستان اور بھارت کے ساتھ الحاق کے علاوہ خودمختاری کا بھی حق ہونا چاہیئے'' ہمارے ہاں کوئی قابل ذکر پذیرائی نہیں ہوئی۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کے طریقہ کار میں خود کوئی خاص حد

بندی ہو یا یہ دونوں وجوہ ہی ہوں تاہم ان کے کارکنوں کا ایک خاص مزاج اور سوچ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مزاج اور سوچ والے لوگ ابھی ہمارے ہاں صرف اتنے ہی ہیں جو محاذ کے ساتھ ہیں محاذ رائے شماری اپنے نام کے لحاظ سے اور واقع کے لحاظ سے بھی مقبوضہ کشمیر میں ایک مرتبہ قائم ہونے والے محاذ رائے شماری کے ساتھ متعلق ہے۔ وہاں جب نیشنل کانفرنس پر بخشی غلام محمد وغیرہ کا قبضہ ہو گیا تو شیخ صاحب نے افضل بیگ کی قیادت میں محاذ رائے شماری قائم کیا۔

مقبوضہ کشمیر میں تنظیم کا جواز:

وہاں اس جماعت کا قیام بھارت کے سر پر ننگی تلوار لٹکانے کے مترادف ہے اور بقول شیخ محمد عبداللہ مرحوم یہ وہی کام تھا جو مسلم کانفرنس کر رہی تھی، مگر وہاں چونکہ مسلم کانفرنس پر پابندی تھی اس لیے محاذ کے نام سے کام کرنا پڑا۔ لیکن یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ کشمیر کے محاذ کا مقصد تو وہی بین الاقوامی رائے شماری تھا، پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق، اس میں تیسری کوئی شک نہیں تھی۔ چنانچہ وہاں یعنی مقبوضہ کشمیر میں رائے شماری کے نام سے محاذ یا جماعت بنانے کا مقصد خاص تو واضح تھا لیکن یہاں آزاد کشمیر میں اس کا کیا جواز ہے؟ کیونکہ آزاد کشمیر کے لوگ تو تلوار کی نوک سے اپنی اس رائے کا اظہار کر چکے ہیں کہ وہ پاکستان کے ساتھ ہی رہ سکتے ہیں پس یہاں اس محاذ کا مطلب گویا یہ ہوگا کہ فیصلہ جو لاکھوں انسانی جانوں کی قربانی کی صورت میں کیا گیا وہ غلط تھا اور اب اس کو تبدیل کر کے کوئی نیا فیصلہ کرنا چاہیئے۔

آزاد کشمیر میں قیام محاذ کے نتائج:

اس خیال کے پس منظر میں کتنی ہی معصومیت کیوں نہ ہو جو یقیناً نہیں ہوسکتی، تب بھی آزاد کشمیر میں اس قسم کے خیال کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ الا یہ کہ ہم سب ماضی میں دی

جانے والی ان تمام قربانیوں کی نفی کریں جو 1931ء سے ریاست جموں و کشمیر کے مسلمان دیتے آرہے ہیں۔ دوسری یہ کہ جب سلامتی کونسل میں طے پایا کہ استصواب صرف اس بات پر ہونا ہے کہ کشمیر کے لوگ پاکستان یا بھارت میں سے کس کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں اور اس بات کو کشمیری نمائندوں کے علاوہ پاکستانی اور بھارتی حکومتوں نے بھی تسلیم کر لیا تو اسی صورت میں ایک تیسری شکل کو پیدا کرنا ہر طرح سے طے شدہ تجویز کو سبوتاژ کرنا نہیں تو پھر کیا ہے۔ اس تجویز میں اس وقت تک تبدیلی نہیں ہوسکتی جب تک کہ مذکورہ بالاسب فریقین یعنی سلامتی کونسل، پاکستان، بھارت، اور کشمیری اس تبدیلی پر متفق نہ ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔ تو پھر اس خودمختای کی تحریک کے کیا معنی ہونگے؟ کشمیریوں کی توجہ اور بامقصد جدوجہد کیلئے میرے خیال میں صرف یہی ایک راستہ نسبتاً آسان اور امید افزاء ہے کہ وہ پاکستان یا بھارت کے حق میں فیصلہ کریں۔ کشمیریوں کے پورے رائے عامہ ان ہی دو میں سے کسی ایک کے حق میں ہو یا مخالف، اور تمام تر کوششیں اسی نقطے پر مرکوز ہوں۔ لیکن اس تیسرے فکر کی وجہ سے کشمیریوں کی رائے خود تقسیم ہو کر ان کی فکری اور جسمانی قوتوں کو محض کمزور ہی کرسکتی ہے، جو نتیجہ کے اعتبار سے مسئلہ کو جوں کا توں رکھنے میں تو شاید مددگار ثابت ہوسکتی ہے لیکن اس کے حل میں کوئی مدد نہیں دے سکتی۔

اگر آج اس بنیادی مفروضے سے انحراف کیا جائے تو پھر یہ کس حکیم نے کہا ہے کہ خودمختاری ہو۔ چین بھی تو ایک اچھا پڑوسی ہے اور روس بھی ایک جابر طاقت ہے، اور کشمیر کی سرحد بھی ان سے ملتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جو لوگ اشتراکیت کی بات کرتے ہیں ان کا قبلہ مقصود پاکستان اور بھارت کے علاوہ کوئی اور جگہ ہے تو گویا خودمختاری کی اس تحریک سے نہ صرف کئی دوسرے قبیح اور غیر متوقع مسائل اور فتنے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کشمیریوں کی توجہ اور صلاحیتیں بھی تقسیم ہو جاتی ہیں جو بالآخر اس مسئلے کو جوں کا توں رکھنے کا ذریعہ ہوسکتی ہیں مگر اس میں کوئی حرکت نہیں پیدا کرسکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نعرے کی کسی

قسم کی کوئی پذیرائی مقبوضہ کشمیر میں نہیں ہوئی۔ لیکن یہاں تو ہم سکھ کا سانس لے رہے ہیں، اسی لیے شاید ہمارے تحت الشعور میں اس مسئلہ کے حل کی کوئی خاص جلدی نہیں ہے اور جو چاہے ہمارا حسن کرشمہ ساز کرے، ورنہ اس مسئلہ کو مزید الجھن میں ڈالنے کی ذہنی عیاشی کرنے کا موقع ہی نہ آتا۔

مقبوضہ کشمیر کا مسلمان تو ایک ایک دن اور ایک ایک لمحہ گن گن کر گزارنے پر مجبور ہے اور دراصل کشمیر کے مسئلہ کا صحیح بیرومیٹر بھی وہی کشمیری مسلمان ہے۔ ہم تو آزادی کی اس فضاء کی نعمت کی محض ناشکری کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ کسی چیز کا بظاہر اچھا ہونا اس کے مفید ہونے کی قطعاً دلیل نہیں ہے۔ چھری سونے کی ہو تب بھی وہ چھری ہے، اس کو اپنے پیٹ میں نہیں گھونپا جا سکتا۔ خودمختاری کی یہ تحریکیں ویسے بھی فتنہ ہیں اور کوئی عجب نہیں کہ ان کے پیچھے ہمارے دشمنوں کا ذہن کارفرما ہو۔ وہ ہو یا نہ ہو تب بھی وہ کیوں نہ ان تحریکوں سے استفادہ کرنا چاہیں گے، جب کہ یہ تحریکیں پاکستان اور بھارت دونوں کو ان کی سیاسی، معاشی، جغرافیائی قوت سے محروم کرنے کا بہترین اور مؤثر ذریعہ ہیں۔ میں تو یہ کہنے میں کوئی غلطی نہیں سمجھتا کہ اگر یہ تحریکیں جاری رہیں تو پاکستان اور بھارت کی اپنی آزادی اور خودمختاری نا صرف محل نظر ہو گی بلکہ صاف طور پر خطرے میں پڑ جائے گی۔ اگر ان تحریکوں کو آج ان دو پڑوسی ملکوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے خلاف ہوا دے رہا ہے تو گویا ہر ایک خود اپنے خلاف کارروائی کر رہا ہے اور بالواسطہ دونوں ہی اپنے وجود کے خلاف اپنے مخالفین کے آلہ کار بننے کا ''نیک'' کام انجام دے رہے ہیں۔

محاذ کی قادیانی قیادت:

محاذ رائے شماری کی قیادت یا خودمختاری کی اس فکر کی سیاسی قیادت عرصہ تک قادیانی حضرات کے ہاتھ میں رہی۔ خواجہ غلام نبی گلکار جو کشمیر میں قادیانیوں کے امیر جماعت تھے جب تک زندہ رہے اس طبقے کی قیادت کرتے رہے۔

پاکستان کی مرکزی حکومت ہو یا صوبائی، ہر جگہ جہاں اس کے ہم مذہب حضرات تھے اکثر و بیشتر گلکار صاحب کی کھلی حمایت کرتے رہے۔ ہماری وزارت خارجہ پر تو ان حضرات کا پہلے دن سے ہی اثر ونفوذ تھا بلکہ خود وہ وزارت ہی ان کے مصرف وتصرف میں تھی۔ اس لیئے خودمختاری کی اس فکر کو پاکستان میں سب سے زیادہ امداد اور رہنمائی وہیں سے ملتی رہی۔ اس وزارت نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی خاص اور مؤثر حکمت عملی کے ساتھ تحریک الحاق پاکستان کو فرسودہ، رجعت پسندانہ اور ایک قسم کی غیر سیاسی تحریک بنا کر پاکستان کے بعض حکمرانوں کو الحاق کی تحریک کا مخالف بنائے رکھا۔ بہر حال یہ معاملہ اس مختصر تحریر میں پوری طرح نہیں لایا جا سکتا، اس کے لیے علیحدہ کتاب لکھ رہا ہوں جو ان شا اللہ جلد مکمل ہو جائے گی۔

محاذ کی موجودہ صورت حال:

محاذ رائے شماری کے بھی حصے بخرے ہو گئے یا کئے گئے واللہ عالم۔ اس وقت بھی تین چار حصوں میں تقسیم ہے اگرچہ ہر ایک حصہ اپنی اپنی حکمت عملی سے اس مقصد کے لیے کام کر رہا ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جو چار جماعتی اتحاد میں شامل ہے۔ یہی حصہ قدرِ معتدل مزاج اورنسبتاً بہتر کارکنوں پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا حصہ وہ ہے جو لندن میں کام کر رہا ہے اور اس کی قیادت امان اللہ خان کر رہے ہیں۔ ان کا زیادہ تر کام اس پوری تحریک کے لیے لٹریچر وغیرہ مہیا کرنا اور پاکستان کے باہر اس زہر کو پھیلانا ہے تاکہ پاکستان سے باہر کام کرنے والے کشمیری حضرات کو اس تحریک کا ہم نوا بنایا جائے کیونکہ بیرونی ممالک کی فضاء ہی اس کام کیلئے راس آتی ہے۔ خاص طور ہماری قوم کے لیے کہ ہمارے ذہن ابھی خام ہیں اور اپنا کوئی قومی نظریہ بھی ہمارے خیالوں میں مستحکم نہیں ہوا ہے۔ تاہم ان کے روابط کچھ آزاد خیال اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ممالک کی ایجنسیوں کے ساتھ بھی بتائے جاتے ہیں۔ قرائن بھی ان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس تحریک کا تیسرا جزو ''لبریشن فرنٹ'' ہے جو اس پوری تحریک

کا جنگی دستہ سمجھا جاتا ہے لیکن جیسا کہ میں کہہ آیا ہوں ان کے جنگی مقاصد ہیں۔ پہلا اور آخری مقصد مسلم کانفرنس اور نظریہ الحاق پاکستان کے حامیوں سے جنگ کرنا ہے۔ شاید ان کا دائرہ کار پاکستان کے اندر اور باہر جہاں وہ ہیں، وہاں تک ہے۔ بھارت، لندن اور مشرق وسطی وغیرہ کے بارے میں اکثر سنتے رہے ہیں کہ آج فلاں صاحب فلاں جگہ ہیں۔ مقبول بٹ کی پھانسی سے چند دن قبل یہ لوگ لندن میں بتائے جاتے تھے اور ایک بھارتی صفارت کار کے قتل کے مبینہ ذمہ دار بھی۔ ان کی نقل و حرکت ہماری نظر میں تو زیادہ تر زیرِ زمین ہے مگر شاید ارباب اختیار کے نزدیک وہ ظاہر ہو، کیونکہ وہ اس پر چشم پوشی کر رہے ہیں یا ان ہی کی ایماء پر ایسا ہو رہا ہو۔

نئی پود پر محاذ کا اثر:

اس تحریک کو ہماری عمر کے لوگوں میں تو کوئی خاص پذیرائی نہیں ہوئی، لیکن جیسا کہ ان تمام منفی اور تخریبی تحریکوں کا خاصا ہے وہ اس کوشش میں ہیں کہ طالب علموں اور نوجوانوں میں اس کو پھیلایا جائے۔ یہ کام جتنا نقصان دہ اور خطرناک ہوتا ہے اتنا ہی بوجوہ آسان بھی، بالخصوص ایسے حالات میں کہ مکان خالی ہو تو قدیم روایت یہی ہے کہ اس میں بھوت پریت آباد ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک ہماری نئی نسل کو نظریاتی تربیت دینے اور ماضی سے ہم آہنگ کرنے کے فرض اولین کا تعلق ہے وہ ہم سب جانتے ہیں کہ اس کام کو ایک فضول اور لا حاصل چیز سمجھا جاتا رہا ہے، اس کے نتیجہ میں جو خلاء پیدا ہوا اس کو کسی منفی اور تخریبی فکر سے پر کرنا زیادہ دشوار نہیں تھا اس پر مستزاد یہ کہ مرکزی سطح پر پورے ملک میں کسی بامقصد منصوبہ بندی کے نہ ہونے کی وجہ سے جو خرابیاں لازماً پیدا ہوتی ہیں، وہ بھی ان تخریبی آبیاری کا کام دیتی ہیں۔ چنانچہ ان حضرات نے بھی سکولوں اور کالجوں کا رخ کیا اور اتنی تیزی سے کام کیا کہ اگر ہم لوگ آڑے نہ آتے تو ہر ذمہ دار شخص مایوسی سے منہ بنا کر کہتا کہ ''نئی نسل تو پاکستان

اور اسلام کے خلاف ہو گئی ہے' میں نے کسی ایک کے منہ سے نہیں سنا کہ اس کا علاج کیا جائے، اس کے برعکس مایوسی ہی نظر آئی ہے۔

این۔ایس۔ایف کا کردار:

جن حضرات کو میں نے خود بتایا کہ یہ مسئلہ قابل علاج ہے اور ہمیں جلد اس طرف متوجہ ہونا چاہیے تو ان میں سے بھی کسی ایک نے مثبت جواب نہ دیا۔ بہر حال اس مقصد کے لیے اس تحریک کا ساتھ تعلیمی اداروں میں این ایس ایف نے دینا شروع کر دیا اور کہیں کہیں قابل ذکر کامیابی بھی حاصل کی۔ بعض تعلیمی اداروں پر تو ان کا واضح تسلط رہا ہے جو شاید اب ایم ایس ایف کی وجہ سے کمزور ہو رہا ہے۔ تخریبی نظریات کی پذیرائی اور جو سازگار ماحول جیسا کہ میں ابھی ذکر کر آیا ہوں، ان کو میسر آیا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ الحاق پاکستان اور اسلام کے نام پر مر مٹنے والے بعض افراد اور خاندانوں ہی کے بیٹے منفی اور تخریبی تحریک کا باعث بنے رہے۔ بالکل وہی جو مشرقی پاکستان میں ہوا۔ مسلم لیگیوں کی اولاد کو اس منفی رجحان سے بروقت نہ روکا جا سکا تو انھوں نے ایک تاریخ ہی مسخ کر ڈالی۔ این ایس ایف جیسا کہ نام سے ظاہر ہے دو قومی نظریے کی مخالفت اور ایک قومی نظریہ یعنی کافر اور مسلمان کو ایک قوم ماننے کی بنیاد پر قائم ہے جس کے بانی آنجہانی گاندھی اور جواہر لال نہرو وغیرہ ہیں اگر ہمارے عزیز بچوں کو صرف اتنی ہی بات سمجھ میں آجاتی تو میرا یقین ہے کہ اکثر و بیشتر بچے اس کے نزدیک بھی نہیں بھٹکتے۔

اس تحریک کے اندر جو بھی محاسن اور خوبیاں بالفرض ہوں، مگر یہ کہ اسکا قبلہ گاندھی کی طرف ہے اور یہ کفر اور اسلام کو ایک ہی جنس سمجھنے پر مبنی ہے، ہمارے غیرت مند جوانوں کو اس سے دور رکھنے کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔ مگر یہ نہ ہو سکا۔ اس مرتبہ پہلی بار جب ضرورت پیش آئی تو ہم نے اسے واضح کرنے کی کوشش اور اس کا اثر بھی ہوا، الحمداللہ۔ اس کے علاوہ این ایس ایف کے اعمال و افعال اور پاکستان میں ان کے تعلقات سمجھنے میں ادنیٰ سی دقت بھی نہیں ہوتی

کہ وہ نہ صرف مکمل لادینی مکتب فکر کی حامل ہے بلکہ اس کا رخ سیدھا اشتراکیت کی جانب ہے یعنی اگر یہ کہا جائے کہ تعلیمی اداروں میں کوئی اشتراکی تنظیم ہے تو وہ این ایس ایف ہی دکھائی دے گی۔ پی ایس ایف بھی اگرچہ بائیں بازو سے تعلق رکھتی ہے اور اسی طرح کئی دوسری علاقائی تنظیمیں بھی ہیں مگر ان سب سے زیادہ مؤثر تنظیم یہی ہے۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہے اور خاص کر آزاد کشمیر کی حد تک تو وسوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اس تنظیم میں شامل سب ہی طالب علم لادین ہیں نہ اشتراکی۔ لوگ اسباب اور وجوہات کے تناسب سے کئی گروہوں میں منقسم ہیں، کچھ تو اس خلاء کے باعث ہیں جو ہماری کوتاہی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ بعض محض من چلے پن کا شکار ہیں، بعض محرومیوں سے دو چار ہیں، کچھ محض دوستیاں پال رہے ہیں، کچھ اپنی غربت کا علاج ڈھونڈتے ہیں اور کچھ بری عادتوں کے لیے وسائل تلاش کر رہے ہیں۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ ہم نے بروقت اس کا نوٹس لیا اور اب روز بروز یہ صورت حال بہتر ہو رہی ہے۔ ورنہ وہ وقت دور نہیں تھا کہ یہ لوگ طاقتور ہو جاتے اور مسلح ہو کر ملت کے اس دفاعی حصار پر آخری وار کرنے کے قابل ہو جاتے۔ لا سمع اللہ۔

تعلیمی اداروں میں اساتذہ کا کردار:

این ایس ایف میں مزید گروہ بندی بھی ہے مگر قبلہ سب کا وہی ہے۔ اس تنظیم کو پھیلانے میں تعلیمی اداروں کے اندر بعض اساتذہ بہت کام کر رہے ہیں یہ وہ اساتذہ ہیں جن کا تعلق اسی مکتب فکر سے ہے جو دہریئے، ملحد اور علیحدہ قومیت کے حامل ہیں، وہ ہمارے تعلیمی اداروں میں نہ صرف بااثر ہیں بلکہ اس میں شاید ہی کوئی ہو گا جو اپنے منصبی کام پر باقاعدہ حاضر ہوتا ہو، روز وشب اسی کام میں لگے رہتے ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ ان سے باز پرس کرنا تو درکنار، ان کا تبادلہ تک نہیں ہوتا۔ جب ان لوگوں میں سے کسی کے خلاف شکایت سامنے آجائے تو انتظامیہ کوئی تادیبی کارروائی نہیں کرتی۔

تعلیمی اداروں میں یہ لڑکے اس لیے بھی من مانی کرتے ہیں کہ شریف اساتذہ کو

پستول دکھا کر ان سے جو کچھ چاہیں کروالیتے ہیں اس لیے دوسرے لڑکے بھی اُن کو قیادت کے اہل تصور کرنے لگتے ہیں۔تعلیمی ادارے ہوں یا امتحانی ادارے ان سب کا قانون ان ہتھیار بندلڑکوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، بس اساتذہ یا ذمہ دارلوگ بھی ان لڑکوں کا غصہ شریف بچوں پر نکالتے ہیں اور پوارا قانون ان ہی پر نافذ کرتے ہیں۔ اس صورت حال کا جونتیجہ ہونا چاہیئے وہ معلوم ہے بعض اساتذہ تو ان بدمعاش لڑکوں سے اپنی حمایت حاصل کرنے کیلئے ان کے ساتھ باہمی مفاہمت بلکہ سمجھوتہ کر لیتے ہیں، نہ کریں تو تعلیمی ادارے کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، نہ طالب علم اس کا مداوا کرتے ہیں نہ حکومت۔غور سے دیکھا جائے تو ایسے کئ تعلیمی ادارے ہیں جن کا نظم ونسق محض غنڈہ گردی کی پشت پناہی کرنے سے ہی چل رہا ہوتا ہے۔ جہاں کسی نے اس میں مداخلت کی وہ ادارہ بند ہوگیا اور اس کا نزلہ بے چارے کسی شریف النفس استاد ہی پر پڑتا ہے۔حکومت کی نااہلی اور ناکامی سے بھی ان اداروں میں غنڈہ گردی کو اہمیت مل رہی ہے۔

درس و تدریس کا کام تو صرف وہی اساتذہ کر سکتے ہیں جو نہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہوں، نہ اشتراکیت اور نہ اتحاد سے، لیکن یہ حضرات زیادہ تر نوکری بچانے اور شرافت کے ساتھ کتابیں پڑھانے کا کام کرتے ہیں، جبکہ دوسرے حضرات تو اکثر و بیشتر بچوں کو کتابی علم کی بجائے ''کالاعلم'' پڑھاتے رہتے ہیں تاکہ وہ دنیا کے رہیں نہ دین کے۔ اشتراکیوں اور الحادیوں کی بات سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ اسلام کا دم بھرنے والے اساتذہ بھی بچوں کو انتہا پسندی کا ہی درس دیتے ہیں۔ جماعت کے لوگ بجائے کفر واتحاد کا مقابلہ کرنے کے، جیسا کہ ان کے بارے میں گمان تھا،تعلیمی ادارے ہوں یا باہر، اپنے علاوہ سب ہی کودرست کرنے پر زور دے رہے ہیں۔ اس طرح جوتلخی پیدا ہوئی اور لازماً پیدا ہوگی، اس سے بھی دہریت اور اشتراکیت کے پھیلنے میں یقیناً مدد ملتی ہے۔ یہ حکمت عملی

بھی عجیب ہے کہ جمیعت ان عناصر کے ساتھ مل کر ایک صحیح العقیدہ تنظیم کی مخالفت کرے۔ اسلامی جمیعت کا متوقع کردار تو یہ نہیں تھا اگر واقعی مقصد یہ نہیں تھا تو پھر غور کرنا چاہیئے کہ کہیں جمیعت اپنے اصل مقصد سے دور تو نہیں ہوتی جارہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ متعلقہ اکابرین اس پر سنجیدگی سے غور کریں اور اپنے معصوم عن الخطا ہونے پر اصرار نہ کریں، ورنہ جب وزن بڑھ جائے گا تب واپسی ناممکن ہوگی۔ جمیعت کے ذکر کا یہ محل نہیں تھا۔ مگر ایک مماثلت کی وجہ سے ایسا کرنا پڑا۔

آزاد مسلم کانفرنس

تعارف:

محاذ رائے شماری کے علاوہ دوسری جماعت آزاد جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کہلاتی ہے۔ اس کے موجودہ صدر چوہدری سلطان محمود ہیں جو چوہدری نور حسین صاحب کے فرزند ہیں۔ تاہم یہ جماعت چوھدری نورحسین صاحب کی نسبت و مناسبت سے ہی زیادہ تر معروف ہے۔ اس جماعت کے پہلے صدر سردار محمد ابراہیم خان تھے جو 1970ء کے انتخابات میں صدارت کے امیدوار تھے۔ وہ انتخابات میں حصہ لیتے وقت اس جماعت کی صدارت سے علیحدہ ہو گئے۔ شاید وجہ یہی وجہ ہے کہ سردار صاحب اور نورحسین میں سمجھوتا ہوا تھا کہ ایک صاحب جماعت کے صدر ہوں اور دوسرے انتخابات میں حصہ لیں اس جماعت کی بنیادی تشکیل بھی کچھ خاص حالات میں ہوئی تھی، یہ وہ وقت تھا جب وزارتِ امور کشمیر اس کوشش میں تھی کہ ایک 1964ء کو اسطرح سے تبدیل کیا جائے کہ پاکستان میں مقیم مہاجرین کو علیحدہ کر دیا جائے۔ پہلے تو کُل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے لیے کوشش کی گئی کہ وہ اس پر رضا مند ہو جائیں لیکن ان کو تو بہر حال نہ اس پر راضی ہونا تھا نہ یہ ممکن تھا۔ اس مایوسی کی حالت میں

وزارت کی شدید خواہش اور ان کی کھلی آشیر باد کے ساتھ جیسا کہ ہمارا علم ہے، یہ فکر پیدا کی گئی کہ کُل جموں وکشمیر کی بجائے محض آزاد کشمیر کا لفظ مسلم کانفرنس کے ساتھ لگایا جائے۔ یہ اسی شکست خوردہ ذہنیت کا شاخسانہ ہے کہ بقیہ کشمیر کو جو ہے وہ رہنے دیا جائے اور جو ہمارے پاس ہے اُسی پر اکتفا کیا جائے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اور اگر ہم اس قدر دور نہ بھی جائیں تب بھی ایک بات تو باہر حال واضح ہے کہ اس نام کی مناسبت سے اس جماعت کا دائرہ کار محض آزاد کشمیر ہی ہوسکتا ہے، جس سے مہاجرین مقیم پاکستان کا آزاد کشمیر سے تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نقطہ نظر پر سردار محمد ابراہیم خان صاحب کا ہوا تھا یا نہیں، آیا چوھدری نور حسین صاحب کا اتفاق بھی ہے یا نہیں۔ تاہم اگر لوگ بقیہ کشمیر کی آزادی کیلئے اپنا کوئی نقطہ نظر نہ رکھتے ہوں اور اس میں سنجیدہ نہ ہوں جیسا کہ بعض اوقات حکومت پاکستان کی پالیسی رہی ہے تو اُن کے لیے ذہنی طور پر آزاد کشمیر پر ہی اکتفا کر لینا کوئی اچنبے کی بات نہیں، اس کے لیے پھر اسی نام والی جماعت ہی کام آسکتی ہے۔

جماعت کا دائرہ کار:

اس جماعت کا دائرہ کار زیادہ تر میر پور کے ضلع کے اندر اور اس میں بھی وہ انتخابی حلقہ جہاں چوھدری صاحب خود رہتے ہیں، وہیں تک محدود رہا ہے پھر اس کو تھوڑی سی وسعت دے کر میر پور کے باہر بسنے والی اس برادری میں جو میر پور کے علاوہ زیادہ تر کوٹلی کے ضلع میں ہے، بڑھانے پر توجہ دی جاتی رہی۔ اب غالباً دوسرے اضلاع کی طرف رجوع کیا جا رہا ہے۔ ان کے طریقہ کار میں زیادہ تر برادری اور وسائل کا دخل بتایا جاتا ہے اور بظاہر معلوم بھی ایسا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ گزشتہ کچھ عرصہ سے چوھدری سلطان محمود پاکستان سے باہر خاص کر امریکہ اور لندن بار بار جاتے ہیں، لندن میں وہ پڑھتے بھی رہے ہیں۔ سنتے ہیں کہ وہ کشمیر

کے مسئلے پر کام بھی کر رہے ہیں، وہاں کام کتنا ہو رہا ہے اس کا اندازہ لگانا خاصہ مشکل ہے تاہم ہمارے ہاں اخبارات میں کافی کام ہو رہا ہے، جس کا ایک شاہکار وہ ہے جو بڑی شہ سرخیوں سے شائع کیا گیا ہے کہ ''چوہدری سلطان محمود نے برطانوی پارلیمنٹ سے خطاب کیا'' اس پارلیمنٹ سے خطاب کرنے کے آداب وقواعد کیا ہیں؟ اور کون لوگ اس کو خطاب کر سکتے ہیں، جو لوگ ان امور سے ناواقف ہیں ان کے نزدیک یہ بہت بڑا کارنامہ ہے، خاص کر جب یہ خبر شہ سرخیوں سے چھپ جائے۔

بیرونِ ملک دورے، مصلحتیں اور نقصانات:

ہمارے معزز قومی اخبارات میں گنگا جہاز کے اغواء، مقبول بٹ کی پھانسی اور اسی دوران میں ایک بوئنگ طیارے کے ہائی جیکروں سے سنسنی خیز واقعات کی داستانوں نے تو کرائم کلب کے افسانوں کو بھی مات کر دیا۔ بااین ہمہ یہ امر بھی محل نظر ہے کہ وہاں اس وقت مظاہرے کرنے سے زیادہ مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے ہمیں اپنے گھر میں بے حد کام کرنا ہے، اور اگر ہم نے اس کو درست کر لیا تو نیویارک اور لندن والے خود ہمارا حال دریافت کرنے یہاں آجائیں گے۔ جیسا کہ ہم ایک تجربہ مشہور تحریک ''کے ایل ایم'' کے دور میں کر چکے ہیں، اس خبر سے ہی سارا بین الاقوامی پریس ہماری جانب دوڑ پڑا تھا۔

بیرونِ ملک کام کرنے سے ایک فائدہ اور بھی ہے کہ ہمارے بعض شکست خوردہ ذہنیت والے لوگ جو نہیں چاہتے کہ گھر میں اس مسئلہ پر کوئی نقل وحرکت ہو، وہ بھی خوش ہوتے ہیں کہ یہ بلا بے شک لندن اور نیویارک میں گھومتی رہے بلکہ اور بھی اچھا ہو اگر یہ اس سے بھی پرے کسی جگہ جا سکے۔ بیرونِ ملک پروپیگنڈے کے بارے میں میرا نقطہ نظر کچھ اس طرح سے ہے کہ وہاں کسی کو اس سے دلچسپی نہیں کہ کشمیریوں کا حق کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

ایک غیر ملکی اخبار نویس نے اس مزاج کے بارے میں ایک مرتبہ بڑی صحیح اور دلچسپ بات کہی۔ اس نے کہا: ''مسٹر سردار! دنیا اس وقت انصاف اور حق وغیرہ میں دلچسپی نہیں رکھتی وہ تو صرف کسی دھماکے کا انتظار کرتی رہتی ہے''۔

1947-48ء میں جب ہم لوگ لڑ رہے تھے تو ساری دنیا دلچسپی لے رہی تھی بلکہ بھارت نے خود جاکے ساری دنیا کو بتایا تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن جب سے ہم نے حق و انصاف کی دہائی دینا شروع کی اور اصل بات کے بارے میں کمزوری آ گئی یا خراب ہو گئی تو ہماری بات سے کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ دوسری بات بہت باریک ہے اور اس طرح سے دو دھاری تلوار پر چلنے کے مترادف ہے، وہ یہ کہ بیرونِ ملک اور اولاً تو کسی کو اس سے قطعاً دلچسپی نہیں ہے کہ ریاست کے لوگ پاکستان میں شامل ہوں، وہاں تو پلڑا بھارت کے حق میں نظر آتا ہے کیونکہ بھارت ملک بڑا جو ہوا یا اگر اس سے زیادہ کچھ سمجھ میں آسکتا ہے تو وہ خودمختاری کی بات ہے مگر موجودہ حالات میں ہماری بات کوئی غیر نہیں سمجھ سکتا۔ ایک تیسرا گروپ ہے جو پھندا لگائے بیٹھا ہے کہ کشمیریوں کی تحریک کا رُخ اصل موضوع سے ہٹا کر ایسی دلدل کی طرف کروایا جائے جہاں وہ خود ہی ایسے غرق ہوں کہ کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکے، میرا تجربہ ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ وہی شخص اپنی بات کر سکتا ہے جس کا علم و دانش اس معاملے میں ان سے زیادہ ہو، بلکہ بات کرنے والے کا ایمان و یقین ان لوگوں سے بدرجہ کامل ہو، ورنہ بات کرنے والا ان کے پہلے یا دوسرے سوال پر ہی اپنے ہتھیار ڈال کر انکی ہم نوائی کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ یہ اس لیے بھی صحیح ہے کہ بیرونِ ملک پاکستان میں کسی بھی جگہ اور خاص کر لندن میں جو کہ روئے زمین کی غیبتوں کا مرجع و مرکز ہے، کشمیریوں کی طرف سے پاکستانی نقطہ نظر سے کشمیر کے مسئلہ کو کبھی باقاعدہ پیش نہیں کیا گیا جب کہ محاذ رائے شماری کا ایک حصہ مستقل طور پر ایک عرصے سے کام کر رہا ہے۔

یہ لوگ جب غیر ملکیوں سے کہتے ہیں کہ کشمیر خودمختار ہونا چاہیئے، یعنی بھارت اور

پاکستان دونوں کو وہاں سے نکال دیا جائے تو اس ملک کے دانشور اس کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔ ان کی حکمت عملی واضح ہے کہ بھارت کو تو وہ کشمیر سے نکال نہیں سکتے لیکن یہ لوگ جو پاکستان کے ویزوں اور پاسپورٹوں پر ہوتے ہیں اور آزاد کشمیر میں رہنے سہنے کے ناطے سے پاکستانی سمجھے جاتے ہیں جب ان کے منہ سے ایسی بات نکلتی ہے تو ایک غیر ملکی کا اس میں کیا نقصان ہے کہ وہ کہے: ''بہت اچھا یہی صحیح عمل ہے''۔

کیونکہ اسے معلوم ہے کہ بھارت کو نکالنا تو مشکل ہے البتہ اس طرح خود ان پاکستانی کشمیریوں کو پاکستان سے بدظن کر کے اپنے ہی ملک کا دشمن تو بنایا جاسکتا ہے۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار تو ہو سکتے ہیں، ایک طرف پاکستان کی دشمنی تو دوسری طرف کشمیر کے مسئلہ کو جوں کا توں رکھ کر بھارت کی حمایت۔

سکھ تحریک کے ساتھ تعاون:

چوھدری سلطان محمود صاحب نے سکھوں کے ساتھ جو ملی بھگت کی کوشش کی ہے کہ شاید اس طرح کچھ بن آئے، اس بات کو اگر بڑی خالص سیاسی ہی کیوں نہ تصور کریں اور محض پروپیگنڈا برائے شہرت نہ سمجھیں تب بھی یہ خودمختاری سے بھی زیادہ خطرناک کھیل ہے جو شخص سیاسی تدبر کے ساتھ اس کے نتائج وعواقب پر غور کرے گا اسے جلد ہی اصل صورت حال نظر آنے لگے گی۔ سکھوں کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس معاملہ کے ساتھ اس کی کوئی ادنیٰ نسبت بھی نہیں، نہ وہ سب مل کر ہماری کوئی معاونت و امداد کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہم لوگ جو خود ایک بڑی آزمائش میں ہیں، ایک مزید الجھن میں ملوث ہو جاتے ہیں اور اپنی توجہ کو بانٹ دیتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں۔

بھارت کی متعصب پالیسی اور اس کے نتائج:

اگر یہ کہا جائے کہ اس طرح ہم بھارتی حکومت کو پریشان کر رہے ہیں تو یہ محض

بچگانہ سوچ ہے۔ اس قسم کی سوچ نے ہمیں ہمیشہ قومی نقصانات سے دو چار کیا ہے۔ ملی ہوئی چھتوں میں سے کسی ایک کو آگ لگانے سے تمام چھتوں کا جلنا ایک ہی امر ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو آنجہانی اندرا گاندھی اور بھارت کی ہندو قیادت کی سمجھ میں نہ آئی۔ محض اس لیے کہ ان کی آنکھوں پر پٹی چڑھی ہوئی تھی۔ بھارتی قیادت کی فہم و فراست سے انکار نہیں، لیکن اس تعصب کے باعث ان کو باقی امور تو دکھائی دیتے رہے، مگر یہ بنیادی امر ان کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔ اس طرح وہ آزادی جسے حاصل کرنے کیلئے متحدہ ہندوستان، مسلمانوں اور دوسرے لوگوں نے بیش بہا قربانیاں دیں، اس کو محض جنونی تعصب کی وجہ سے اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارنے کا پروگرام بناتے رہے۔

(تصویر: سردار محمد عبدالقیوم خان کے استقبال کا ایک منظر)

جنرل چشتی کی اعزازی رکنیت:

آزاد مسلم کانفرنس کے بارے میں ایک اور امر قابل ذکر ہے۔ سنا ہے کہ جنرل فیض علی چشتی صاحب بھی اس کے اعزازی رکن ہو گئے ہیں اور انھوں نے ''پی ایل او'' کی طرز پر ''کے ایل او'' بنانے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ چشتی صاحب کے بارے میں آزاد کشمیر میں ابھی کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ یہ خاموشی بے معنی نہیں کیونکہ چشتی صاحب ایک وقت میں آزاد کشمیر کور کمانڈر اور وزیرِ امور کشمیر رہے ہیں۔ وہ بھی اپنے دور میں پاکستان کی مرکزی حکومت کے ''کنگ میکر'' اور حکومت ساز سمجھے جاتے تھے۔ آزاد کشمیر پر ان کی ان گنت عنایات ہیں، جن کا تذکرہ کسی مناسب فرصت میں ہو گا۔ جن لوگوں کو اس دور میں چشتی صاحب سے واسطہ پڑا ہے وہ جانتے ہیں کہ پاکستان کے تمام ڈکٹیٹر اور فرعون مزاج افراد ملا کر بھی ان کے برابر نہیں، کیوں نہ ہو جب کہ صدر پاکستان، پاکستان افواج کے کمانڈر ان چیف اور حکومت کے منتظم اعلیٰ جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے اور ان کو مرشد کہہ کر پکارتے ہیں۔ بہرحال جو کچھ بھی انھوں نے کیا اس کا اندازہ اس جزا اور سزا سے بخوبی ہو سکتا ہے جو ان کو

اس دنیا میں مل رہی ہے۔ وہ اپنی سیاست کا آغاز آزاد مسلم کانفرنس سے فرما رہے ہیں۔ (اگر احساسِ زیاں جاتا رہے تو بھی یہ بات سمجھ نہیں آسکتی)۔ تاہم مجھے امید ہے کہ جنرل فیض علی چشتی صاحب کے اس فعل پر پاکستانی فوج کے باقی جرنیلوں کو قیاس نہیں کیا جائے گا۔

ہمارے بھائی چوھدری نور حسین صاحب کے مزاج سے جو لوگ نہ واقف ہیں وہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ خود چوھدری صاحب کی قیادت میں کام کرنے کا کیا مطلب ہے؟ لیکن چشتی صاحب محترم کی قسمت کی خوبی دیکھیئے کہ ان کو ایک طرف چوھدری صاحب کی قیادت میں چلنا پڑا اور یہ چوھدری صاحب بھی وہی ہیں جن کے بارے خود چشتی صاحب کی ایک خاص رائے تھی جس کا اظہار وہ برملا کرتے رہے، دوسری طرف بیک وقت چوھدری صاحب کے نو خیز صاحبزادے سلطان محمود کی قیادت بھی قبول کرنا پڑی۔ جبکہ سلطان محمود کو سیاست میں بلوغت تک پہنچنے میں ابھی کافی سال درکار ہیں کیونکہ کہتے ہیں کہ سیاست میں بلوغت کی عمر چالیس سال سے شروع ہوتی ہے۔

چشتی صاحب کے اس واقعہ سے مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے سزا کے طور پر کسی شخص کی پشت پر ایک درخت پیدا کر دیا، مگر وہ چونکہ اس احساس زیاں سے محروم تھا کہنے لگا:

"اچھا ہے میں اس کے سایہ میں بیٹھا کروں گا"

کہا جاتا ہے کہ فطرت کی تعزیریں ہیں بڑی سخت۔ واللہ اعلم

پاکستان پیپلز پارٹی

تعارف اور حیثیت:

اس چار جماعتی اتحاد میں ایک اور جماعت پاکستان پیپلز پارٹی آزاد کشمیر ہے۔ دراصل جب اتحاد قائم ہوا تو سردار محمد ابراہیم خان صاحب کے ساتھ بات ہوئی جو پی پی کے کوئی عہدے دار نہیں ہیں مگر سیاست میں ان کا اپنا ایک مقام ہے جو پی پی کا بہرحال محتاج نہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پی پی کا جو حصہ آزاد کشمیر میں ہے اس میں سے سردار صاحب کو منہا کر دیں تو باقی دوستوں کے لیے اپنے طور پر جماعت کی حیثیت منوانا قدر مشکل معاملہ ہے، ویسے یہ حضرات خود بھی اپنی حیثیت کا تعین پی پی کی مرکزی قیادت سے کرتے ہیں، ورنہ شاید دوسری جماعتوں میں شامل ہو جاتے چنانچہ وہ لوگ جو سردار محمد ابراہیم خان صاحب کے ساتھ ہیں، وہ لوگ ہیں جو اس چار جماعتی اتحاد میں ہیں۔ باقی کچھ حضرات جو پی پی کی سرکاری جماعت کے صدر پیر علی جان شاہ صاحب کے ساتھ ہیں، وہ اس اتحاد میں ایک آدھ میٹنگ کے سوا کبھی شامل نہیں ہوئے بلکہ ان کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ جب یہ چار جماعتی اتحاد آزاد کشمیر میں محمد حیات خان کی حکومت کے خلاف تحریک چلا رہا تھا، اس وقت وہ طبقہ نہ صرف خاموش تھا بلکہ حیات خان صاحب سے مراعات حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔ بہرحال اس تحریک سے ان کی دوری تو کسی بھی شک و شبہ سے بالا تر ہے۔ سردار محمد ابراہیم خان خود گرفتار ہوئے، ان کا بیٹا خالد ابراہیم اور دوسرے چند ساتھی بھی گرفتار ہوئے، مگر بقیہ پی پی سب تماشہ بنی رہی۔ ویسے بھی ان میں بعض حضرات گرم جگہ پاؤں رکھنے کے حق میں نہیں ہیں۔

پی پی والوں کی ایک مشکل یہ ہے کہ یہ اپنی تمام تر راہنمائی پی پی کے مرکز سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ مرکز ایک تو اب ملک سے باہر چلا گیا ہے، دوسرے یہ کہ کشمیری سیاست

کے بارے میں ان کا نقطہ نظر ابھی ہمارے نزدیک واضح نہیں۔ یہ لوگ یہاں ہر بات کیلئے مرکز کی ہدایات کے منتظر رہتے ہیں۔ پی پی کا نظام خود بھی کوئی جمہوری نہیں ہے کہ وہاں کسی کارکن کی رائے کو کوئی دخل ہو۔ وہاں عمل دخل تو درکنار کسی کو خود سوچنے کی اجازت نہیں اور یہ نظام سوشلزم اور کمیونزم کے فلسفے کے عین مطابق ہے، اس لیے خود آزاد کشمیر کی سیاست میں ہی بعض یک لخت مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں جیسے کے لانگ مارچ کے ضمن میں ہوئیں۔ کیونکہ باقی تین جماعتوں والے اس میں شامل نہیں ہوئے، نہ ہو سکتے تھے محض اس لیے کہ اس لانگ مارچ کو تجویز کرنے میں ہم شریک نہیں تھے، نہ ہی پی پی کے مرکز کے ماتحت تھے کہ ان کا حکم بسر و چشم مان لیتے۔

تاہم اس سے آزاد کشمیر کی سیاست کو نقصان تو ضرور ہوا مگر کسی بھی جگہ سے اس کا کوئی ادنیٰ سا فائدہ مرتب نہ ہوا۔ ہمارے لیے یہ مشکل تھا کہ اگر ہم آزاد کشمیر کی سیاست میں آزاد کشمیر سے باہر کسی کا حکم اور پھر اس خاندان یا اب محض ماں بیٹی کا حکم مانیں وہ بھی جب کہ وہ کراچی یا لندن میں ہوں تو پھر ہمارے نزدیک اسلام آباد میں کسی مرد کا جو بااختیار بھی ہے حکم نہ ماننے کا کوئی جواز نہیں۔

جنرل ٹکا خان ''ماہر امور کشمیر'':

آزاد کشمیر کی سیاست کے بارے میں پی پی کا انداز فکر اور عجیب ہے کہ انھوں نے حکومت کے علاوہ اپنی جماعت میں بھی ایک قسم کی وزارت امور کشمیر مقرر کر رکھی ہے اور ان دوستوں کی بدقسمتی سے اس کا سربراہ انھوں نے جنرل ٹکا خان کو مقرر کر رکھا ہے۔ فوجی اعتبار سے وہ اس قسم کے جرنیل یا افسر تو ہی مگر سیاست میں ان کا ہنوز زورِ اول ہے۔ ویسے بھی مثل مشہور ہے کہ طوطے نہیں پڑھتے اور پھر سیاست کا علم غالباً دنیا میں مشکل ترین علم ہے۔ مجھے اپنے پی پی والے دوستوں پر رحم آتا ہے کہ ان میں اچھے خاصے ذہین اور فعال لوگ ہیں، خود سردار صاحب بھی معروف شخصیت ہیں۔ ان کا جو حشر ٹکا خان کے ساتھ ہوتا ہو گا اس کا کچھ

اندازہ میں بھی کر سکتا ہوں۔ ایک بار ایک مجلس میں ٹکا خان سے بڑی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے ایک دو بار اجازت چاہی مگر سردار محمد ابراہیم خان صاحب نے کہا کہ تھوڑی دیر اور بیٹھو، وہ خود بھی غصے میں آپے سے باہر ہوگئے اور مہذب سیاسی زبان میں انھوں نے ٹکا خان کو صلواتیں سنائیں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ابھی ناراض ہو کر چلے جائیں گے مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ مزے سے اپنی بات میں لگے رہے۔ مجھے وہ گونگا اور بہرہ جہنم کا داروغہ یاد آرہا تھا جو نہ کسی کی سنے گا اور نہ کسی سے بات کرے گا، اپنے کام میں لگا رہے گا۔ اس پارٹی کے کئی رکن بھٹو صاحب کے زوال کے فوراً بعد اس سے علیحدہ ہوگئے تھے۔ کچھ مولانا کوثر نیازی صاحب کے گروپ میں شامل ہو گئے۔ کچھ اِکا دُکا اسی خیال میں ہیں۔ باقی مزید منتشر ہو گئے ہیں۔ دو حضرات نے تو ایک تیسرا گروپ قائم کر دیا ہے جو ان ہی دو افراد پر مشتمل ہے اور جس کا نام انھوں نے آزاد جمہوری پارٹی رکھا ہے اور وہ چھ جماعتی اتحاد میں شامل ہیں جس کا پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ بقیہ پی پی کا جو بڑا اور مؤثر حصہ ہے اس میں بھی دو نمایاں گروہ بن گئے ہیں۔ ایک پیر علی جان شاہ صاحب کے ساتھ ہے اور ایک سردار محمد ابراہیم خان صاحب کے ساتھ ہے۔ سردار صاحب کا خیال یہ ہے اور وہ بالکل درست ہے کہ آزاد کشمیر کے معاملات کو پی پی کے مرکز کے ماتحت نہ رکھا جائے بلکہ کسی طرح محنت کیے بغیر اقتدار تک رسائی حاصل ہو جائے مگر بقول پی پی کے ایک معروف رکن کے ''اب پاکستان سے دونوں کے بکس بھر کر نہیں آئیں گے''۔ ویسے بھی ہماری سیاست میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اخلاقی کمزوری یا سیاسی مصلحت کی وجہ سے یہ بات زبان پر لانے کی جرائت نہیں کرتے مگر دل سے یقین رکھتے ہیں کہ کشمیر کا اب کچھ نہیں ہوسکتا۔اس لیئے اسی پر اکتفا کر لیا جائے تو اچھا ہے اور خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کیا جائے، اس لیے انھوں نے اپنے منشور میں آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنانے کا مطالبہ درج کر رکھا ہے بلکہ اس میں ان کے مرکز کی ہدایات بھی درجہ اول میں شامل ہیں۔

اس فکر کا چرچہ پہلی مرتبہ اس وقت شروع ہوا جب بھٹو صاحب شملہ سے تشریف

لائے تھے۔ پی پی کا دائرہ کار آزاد کشمیر تک بڑھانے کا کام بھی عملاً تیزی کیساتھ اسی وقت شروع ہوا۔ اگرچہ کافی دیر پہلے سے یہ سوچ شروع ہو چکی تھی اور بھٹو صاحب کے ساتھ اس معاملہ میں بحیثیت صدر آزاد کشمیر تک بڑھانے کا معاملہ کوئی پہلی بار یوں زیرِ بحث نہ آیا تھا بلکہ اس روایت کو پی پی کے یہاں قیام سے قبل حسین شہید سہروردی اپنی جماعت بنا کر توڑ چکے تھے اور فیلڈ مارشل ایوب خان نے بھی ارادہ کر کے میرے ساتھ گفتگو کے بعد ترک کر دیا تھا۔

پارٹی کا منشور:

بہر حال یہاں پی پی نہ صرف قائم کر دی گئی بلکہ اس کے لیے کئی دوسرے پاپڑ بھی بیلے گئے۔ آزاد کشمیر کے آئین میں ترمیم کی گئی، مجھے خلاف آئین ایف ایس ایف کے ذریعہ صدارت سے جبراً علیحدہ کیا گیا اور پی پی کو برسر اقتدار لانے کیلئے ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ مسلم کانفرنس صرف بائیکاٹ ہی کر سکتی تھی۔ غرضیکہ آزاد کشمیر میں پی پی کے قیام کا اور جو بھی مقصد ہو یہ بات بہت نمایاں ہے کہ وہ آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنانے کا منشور رکھتی ہے اور صوبہ بنانے کے مضمرات کچھ پردے میں نہیں ہیں۔ اس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر کی آزادی کی تحریک ختم کر دی جائے اور جو یہاں ہے اُسی پر اکتفا کرے یا حکومت پاکستان براہِ راست کشمیر کو آزاد کروا کر ہمارے سپرد کرے۔ یہ فکر نہ صرف ناقابل عمل ہے بلکہ بے حد نقصان دہ ہے اور بھارت کے ساتھ جنگ کرنے کا تقاضا رکھتی ہے۔

چنانچہ پی پی کے دور میں آزاد کشمیر میں جو حکومت قائم ہوئی اس میں مہاجرین کا کوئی نمائندہ نہیں تھا۔ صدر، وزیرِ اعظم، سپیکر اور پوری کیبنٹ آزاد کشمیر کے لوگوں پر مشتمل تھی، البتہ محض اشک شوئی کے لیے صدر کا ایک مشیر اور اسلام آباد میں کونسل کا ایک مشیر مہاجر تھا جن کا آزاد کشمیر کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا، جب کہ مسلم کانفرنس کی حکومت میں اسپیکر مہاجر تھا۔ کیبنٹ میں ایک مہاجر نمائندہ تھا اور صدر کا ایک مشیر مہاجر تھا۔ اس سے اس سوچ کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس نظام کے پیچھے کارفرما تھی۔ میرا خیال ہے اور باتوں کے علاوہ پی پی

ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو قناعت پسند ہیں، انہیں مزید کوئی علاقہ نہیں چاہیئے جو ہے بس وہی کافی ہے، سب کوشش اس پر مرکوز کرنا چاہیئے۔ نیز یہ لوگ پوری طرح پاکستان کی پی پی میں مدغم ہو چکے ہیں، ان کی علیحدہ کوئی حیثیت نہیں رہی، اگر یہ کسی وقت کشمیری جماعت ہونے کا ذکر کریں تو یہ زیادتی ہو گی کہ ان کو کشمیری جماعت سمجھا جائے۔

پارٹی کے کارنامے:

پی پی کا دورِ حکومت کئی لحاظ سے منفرد تھا۔ اولاً تو یہ کہ پہلے سے طے شدہ تمام معاملات کو درہم برہم کرنے کا کام ان کے ہاں ترجیحات میں سب سے اول درجے پر تھا یہاں تک کہ مسلم کانفرنس کی حکومت نے تعلیمی اداروں میں ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کا جو نعرہ شروع کرایا تھا اس کو فوراً بند کر دیا گیا۔ متفقہ آئین میں یک طرفہ بے شمار ایسی ترامیم کی گئیں کہ وہ آئین ایک کھلونا بنا کر رکھ دیا گیا۔ ان تفصیلات میں جانا تو اس وقت مشکل ہے۔ اسی قدر کافی ہو گا کہ کوئی اخلاقی، معاشی، سیاسی اور انتظامی قدر ایسی نہیں تھی جس کو انھوں نے پامال نہ کیا ہو، وہ دور یاد آتا ہے تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تیار فصل کے کھیت میں کوئی بدمست بھینسا گھس گیا ہو، جو حشر وہ کرتا ہے وہ بھی شاید اس حکومت کی صحیح تصویر کشی نہ کر سکے۔

ان دنوں جب میں گھر پر نظر بند تھا مجھے ایک چارج شیٹ دی گئی کہ میں اس کا جواب دوں، میں نے اس جواب کو ''جمہوری نازی ازم'' کا عنوان دیا تھا اور اس میں کہا تھا کہ اگر ہمارے معروف ناول نویس ایم اسلم صاحب اس دورِ حکومت کا جائزہ لیتے تو یقیناً ''رقص ابلیس'' کے نام سے ایک ناول اور لکھتے انھوں نے تقسیم ہند کے واقعات کو رقص ابلیس کے نام سے پہلے ہی قلمبند کیا ہوا ہے۔ تاہم میرے علاوہ خود بھٹو صاحب نے جو اس حکومت کے سر پرست اعلیٰ تھے، اپنے مظفرآباد کے دورے کے دوران اس حکومت کو ایک اخباری بیان کے ذریعہ جو مشہور سرٹیفکیٹ دیا وہ بھی کوئی کم نہ تھا، انھوں نے پیپلز پارٹی کی حکومت کو مخاطب کر کے

فرمایا تھا: ''آپ لوگوں نے یہاں اتنا گند جمع کیا ہے کہ پاکستان کے سارے دھوبی ملکر بھی اسے صاف نہیں کر سکتے''۔

اسی طرح اس حکومت کے دوران ہی وہ رسوائے زمانہ دلائی کیمپ قائم کیا گیا جو ہٹلر کے بعض عقوبت خانوں کی یاد تازہ کراتا رہا۔ وہاں اذیت کن کو دی جاتی ہے، یہ بھی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے؟ اس کیمپ میں پاکستان سے لائے گئے پی پی کے اپنے پاکستانی معروف کارکنوں کے علاوہ آزاد کشمیر کے خالصتاً مسلم کانفرنسی کارکن تھے جن کا جرم محض یہ تھا کہ وہ نظریہ الحاق پاکستان کو جزو ایمان سمجھتے رہے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس میں آزاد کشمیر کی اس حکومت کی ذمہ داری نہیں تھی ان کا اس میں کوئی ہاتھ نہ تھا تو اس کا مطلب اس حکومت کی انتہائی نالائقی، نااہلی اور مجرمانہ چشم پوشی سے کم نہیں ہوسکتا اور اگر ان کا ہاتھ تھا، تو یہ لوگ اس قومی جرم میں برابر کے شریک تھے۔ یہ دور تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ بری نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

یوں بھی پی پی کی حکومت نے اس لحاظ سے بھی سابقہ ریکارڈ توڑ دیے تھے کہ اس دور میں اصل حکمران ایک چیف سیکرٹری اور ڈی آئی جی تھے۔ اس دور کی تصویر کشی کرنا آسان نہیں ہے۔ قانون، روایت، ضابطہ اخلاق، شرافت، غرضیکہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں گرد نہ اُڑائی گئی ہو۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری محض پی پی والوں پر ہی نہیں بلکہ اس قیامت خیز ڈرامے میں سوائے مسلم کانفرنس کے باقی تمام جماعتیں اور لیڈر صاحبان نہ صرف شریک تھے بلکہ جمہوریت اور استحکام کی علامت مسلم کانفرنس کی حکومت کو منہدم کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ثواب حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جو لوگ آج جمہوریت اور نہ جانے کیا کیا دعوے کرتے ہیں، ان کا وہ کردار انمٹ تاریخی نقش ہے جو ہماری سیاست کے ماتھے پر ایک بدنما سیاہ داغ کی حیثیت سے ہمیشہ قائم رہے گا۔ مگر یہ ہماری سیاست کا وہ عجیب وغریب پہلو

ہے کہ آج وہی لوگ پھر جمہوریت، سیاست اور عوامی مفاد کا رونا لے کر جگہ جگہ تکلیف اُٹھا رہے ہیں، تاہم ان میں کچھ اچھے کارکن بھی ہیں۔قومی معاملات میں اگر ان کو اپنی سوچ وفکر کی اجازت اور آزادی ہوتو وہ مفید کردار ادا کر سکتے ہیں۔

مسلم کانفرنس

تعارف اور تاریخ:

اس اتحاد کی چوتھی جماعت آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس ہے۔ اس جماعت کی اپنی ایک درخشندہ تاریخ ہے بلکہ یہی جماعت خود ریاست کے مسلمانوں کی تاریخ ہے اور تاریخ ساز بھی۔ یہ جماعت سیاست میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری سے لے کر جہاد تک اور جہاد سے لے کر اب تک مسلسل مصروفِ عمل ہے اور خدا کے فضل و کرم سے اس سے جانثار اور مخلص کارکنوں نے ہر دور کی آزمائشوں اور امتحانوں کا مقابلہ کیا ہے مگر کبھی پسپائی اختیار نہیں کی۔ اس موضوع پر بھی علیحدہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت یہ بھی ہماری بڑی ہی قابل گرفت کوتاہی ہے کہ ہم نے مسلم کانفرنس کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں کچھ بھی تحریر نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہے کہ نئی بننے والی جماعتوں نے خلا پر کیا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی مسلم کانفرنس کا نہ تو کوئی ماضی ہے، نہ حال ہے اور نہ ہی مستقبل۔

اس وقت خاص طور پر جن حالات کا سامنا یہ جماعت کر رہی ہے اگر مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ ایسا کر سکتی تو مشرقی پاکستان کی کوئی طاقت بنگلہ دیش نہ بنا سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ اس جدوجہد کو بھی ایک مقدس فریضہ بلکہ جہاد سمجھتے ہیں اور جو لوگ جانتے ہیں کہ وطنِ عزیز پاکستان کے دفاع اور سلامتی کے اس خطے کے ساتھ کشمیر کا کتنا گہرا تعلق ہے، وہی ہماری کوشش کے بارے میں سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیا ہیں اور کن حالات میں ہم لوگ کچھ کر رہے ہیں جس کی نہ کوئی قیمت ہے نہ معاوضہ۔ اس کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو پاکستان کے ساتھ آزاد کشمیر کے اس تعلق کا احساس اور شعور رکھتے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر جو چند بنیادی مقاصد ہیں وہ یہ ہیں کہ:

۱: نظریہ الحاق پاکستان کو مضبوط تر کیا جائے اور اس کے خلاف اُٹھنے والے تمام فتنوں کا مقابلہ کیا جائے۔

۲: پاکستان میں مقیم کشمیری مہاجرین کے ساتھ تعلق برقرار رکھا جائے تاکہ تحریک آزادی کی گاڑی کے یہ دونوں پہیے بوقت ضرورت مل کر کام کر سکیں۔

۳: کشمیر کی آزادی کی تحریک کو زندہ رکھا جائے اور سیاسی محاذ پر پسپائی نہ ہونے دی جائے۔

۴: آزاد کشمیر کی آزادی کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

۵: پاکستان کی دفاعی سرحد کے اعتبار سے اس علاقہ میں ہمہ وقتی فکری لام بندی جاری رکھی جائے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ بھارت اگر کسی وقت فوجی پیش قدمی کرے، جیسا کہ حالات سے ظاہر ہے تو اس کی مزاحمت صرف ہماری باوردی فوج ہی نہ کرے بلکہ آزاد کشمیر میں بسنے والے پہاڑی اور جنگ جو قوم کے بیس لاکھ مرد و زن اس مزاحمت کو اپنا دینی اور ایمانی فرض منصبی سمجھیں اور یہی لام بندی پاکستان کے خلاف بھارت کے جنگی جنون اور تیاریوں کا مثبت اور منہ توڑ جواب ہے۔

مذہبی جماعتیں

تعارف:

اس کے علاوہ ہماری سیاست میں جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں دو اور مذہبی جماعتیں ہیں جو اب سیاسی کام کرنے پر توجہ دے رہی ہیں۔ ان میں ایک جمعیت العلمائے اسلام آزاد جموں وکشمیر ہے جو دیو بندی مکتب فکر کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اس ناطے سے نظریاتی طور پر جے یو آئی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگرچہ جے یو آئی نے آزاد کشمیر میں اپنی کوئی باقاعدہ تنظیم قائم نہیں کی۔ جے یو آئی کے قائدین بالخصوص مولانا مفتی محمود مرحوم بہت سختی کے ساتھ اس پر اصرار کرتے تھے کہ پاکستان کی کسی جماعت کا دائرہ کار آزاد کشمیر تک نہیں بڑھنا چاہیئے۔ دوسری مذہبی جماعت جمعیت العلمائے جموں کشمیر ہے جو بریلوی مکتب فکر کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اس وجہ سے جے یو پی کیساتھ نسبت ہے۔ مگر جے یو پی نے بھی یہاں اپنی کوئی باقاعدہ تنظیم قائم نہیں کی۔ جے یو پی کے صدر مولانا شاہ احمد نورانی اور دوسرے اکابرین کا بھی یہی خیال رہا ہے اور وہ اصولی طور پر اس بات پر قائم ہیں کہ آزاد کشمیر کو ملکی سیاست کا اکھاڑا نہ بنایا جائے مگر پھر بھی اس بات کی توقع ہے کہ آزاد کشمیر میں دونوں جماعتیں اپنے اپنے طور پر انتخابات میں حصہ لیں گی اور شاید کسی دوسری جماعت کے ساتھ کسی قسم کے مضبوط یا ڈھیلے ڈھالے اتحاد کی صورت پر بھی غور کریں گی۔ دینی جماعتوں کے ضمن میں کچھ اصولی باتیں بھی ہیں جن پر غور کیا جانا چاہیئے۔

علماء اور انتخابی مجبوریاں:

پاکستان میں تو ان مذہبی تنظیموں کا انتخاب میں حصہ لینا کسی حد تک سمجھ میں آتا ہے کیونکہ وہاں سیاسی جماعتیں تقریباً دینوی طور پر کام کر رہی ہیں اور ان کے منشور دینی جماعتوں سے مختلف ہیں لیکن آزاد کشمیر میں صورت حال اس کے برعکس ہے، یہاں تو مسلم کانفرنس

خالص اسلامی نقطہ نظر سے روز اول سے ہی کام کر رہی ہے جب کہ اس کے مقابل نیشنل کانفرنس تھی جس کا نقطہ نظر وطنیت پر اور دنیوی طریقہ پر مبنی تھا، اس میں اسلام اور دو قومی نظریہ کی گنجائش نہیں تھی۔ مسلم کانفرنس کی تمام تر کوششیں اسلام کی خاطر ہی تھیں، اور اب بھی خدا کے فضل سے اسی نہج پر کام ہو رہا ہے بلکہ مسلم کانفرنس کی حکومت نے آزاد کشمیر میں جو اصلاحات کیں وہ اس کردار کی بہت واضح دلیل ہیں، البتہ ہم نے اس کو علماء کی جماعت نہیں بنایا۔ لیکن تمام مکاتب فکر کے علماء و مشائخ اس میں شامل ہیں عرصہ دراز تک تو علماء اور مشائخ کا سیاسی پلیٹ فارم یہی مسلم کانفرنس تھی ۔گو کچھ علماء جس طرح کانگریس کے ساتھ تھے یہاں بھی کچھ حضرات نیشنل کانفرنس کے ساتھ بھی تھے مگر غالب اکثریت مسلم کانفرنس کے ساتھ رہی ہے۔ اس اعتبار سے آزاد کشمیر میں دینی جماعتوں کو علیحدہ اپنے اپنے سیاسی پلیٹ فارم قائم کرنے کی اصولاً کوئی ضرورت نہیں ہے، نہ یہ بات کسی طرح ممکن ہے کہ یہاں خالص کسی ایک مکتب فکر کی دینی حکومت قائم کی جائے۔ اس لیے مذہب کے نقطہ نظر سے بھی مفید یہی تھا کہ یہ سب حضرات مسلم کانفرنس کی تائید و حمایت کرتے اور جو علماء حضرات اسمبلی میں جانے کے خواہش مند ہوتے اور اپنے حلقے میں انکی حیثیت ایسی ہوتی کہ وہ الیکشن لڑنے کی پوزیشن میں ہوتے تو وہ مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ہی انتخاب میں حصہ لیتے، زیادہ مناسب تو یہی تھا۔

میرا خیال تو یہ ہے کہ علماء بھی دوسرے ماہرین کی طرح ہیں، ان کے لیے اسمبلی میں چند سیٹیں مخصوص کر دی جائیں اور اسمبلی کے ذریعے ہی مناسب حضرات کو منتخب کروایا جائے۔ البتہ وہ علماء حضرات جو سیاستدان ہوں یا بننے کا شوق رکھتے ہوں وہ بحیثیت عالم دین نہیں بلکہ ایک سیاسی شخص کی حیثیت سے بے شک شوق کریں، مگر محض عالم دین ہونے کی وجہ سے اگر کوئی صاحب ممبر بننا چاہیں گے تو یہ امر اس لحاظ سے تکلیف دہ ہوگا کہ محض دینی علم کی بنیاد پر وہ شاید ہی منتخب ہوسکیں۔ اگر ہار جائیں تو یہ دینی علم کے شایان شان نہ ہوگا بلکہ اس سے ایسی

راہ کھل جائے گی کہ لوگوں کے دلوں میں دینی علم اور علماء کا جو احترام ہے وہ ختم نہ بھی ہو کم ضرور ہو جائے گا البتہ ایک دوسری خرابی یہ ہوگی کہ جو شخص محض عالم کی حیثیت سے انتخاب میں حصہ لے گا وہ بھی کم و بیش وہی طریقہ اختیار کرے گا جو عام لوگ ان انتخابات میں کرتے ہیں کیونکہ یہ تو ایسی مجبوری ہے جس سے کوئی مفر نہیں ہے، وہ برادری کی بات کرے گا، اپنے دینی علم کا واسطہ دے گا، روپیہ پیسہ استعمال کرے گا۔ ووٹ ڈالتے وقت کئی قسم کی خرابیوں کے ارتکاب میں ملوث ہو گا اور دوسرے امیدواروں کی کمزوریوں کا ذکر کرے گا جس کے جواب میں دوسرے لوگ بھی اس پر زبانیں کھولیں گے، غرضیکہ اسے ایسی کئی قباحتوں کا مرتکب ہونا پڑے گا جس کے بارے میں عام زندگی میں شاید وہ شخص منبر و محراب پر کھڑے ہو کر مذمت کرتا رہا ہو۔ جس کی مثال یہ سمجھیں کہ ہمارے ایک ثقہ عالم دین جب انتخاب لڑنے لگے تو ساتھیوں نے جلوس وغیرہ کا اہتمام کیا ایسے جلوسوں میں ڈھول ڈھمکے کے بغیر رونق نہیں ہوتی اور بات نہیں بنتی لیکن وہ صاحب تو ڈھول باجے کے سخت مخالف تھے، اس کو ناپسند کرتے تھے اور دوسروں کو بھی سختی سے منع کرتے تھے۔ تاہم اس انتخابی مہم نے ان کو مجبور کر دیا کہ ڈھول والوں کی اقتدا میں چلیں۔ اس مہم کا انتظام کرنے والوں میں سے بعض نے چسکے لے لے کر وہ باتیں ہم لوگوں سے بیان کیں اور اس سے ان کو جو غرض ہو گی وہ کچھ محتاج تشریح نہیں بلکہ ایک تیسری مشکل یہ پیش آئے گی کہ یہ علماء حضرات اپنے اپنے مکتب فکر کی بنیاد پر باتیں کریں گے جس سے نفرتوں کے طوفان برپا ہوں گے اور گھر گھر میں فساد شروع ہو جائے گا اگر کسی جگہ کوئی شخص کامیاب ہو گیا تب بھی تفرقوں میں اضافہ ہو گا اور ناکام ہو گیا تب بھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس امت کو اس قدر آزمائش میں ڈالنا کسی طرح مناسب ہے۔ خاص طور پر کشمیری مسلمانوں کو کہ جنھوں نے ابھی ایک معرکہ سے صبر آزما ہونا ہے اور اپنے وطن کا بیشتر بقیہ حصہ آزاد کرانا ہے۔ ہمارے ہاں تو ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام قبیلے، طبقے اور تمام علاقے غرضیکہ رنگ و نسل کے سب امتیازات کو مٹا کر مکمل یک جہتی کا مظاہرہ کیا جائے۔

کشمیر کی تحریک آزادی ہو یا آزاد کشمیر کی آزادی کو برقرار رکھنا ہو، پاکستان کا دفاع کرنا ہو یا بھارت کے جارحانہ عزائم کا مقابلہ کرنا ہو، ہرصورت میں ہماری یکجہتی ہی اولین شرط ہے۔ ہمارے ہاں انتخابات کا معیار اور طریقہ کار کچھ ایسا ہے کہ جو کوئی بھی ان میں حصہ لیتا ہے اس کو وہی راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس کو عرف عام میں عامیانہ اور نہایت گھٹیا ہتھکنڈوں کا راستہ کہا جاتا ہے۔ سوائے ان چند حضرات کے جن کے قد و قامت ایسے ہو جاتے ہیں کہ انھیں انتخابات جیتنے کیلئے غیر ضروری تردد کی محتاجی نہیں رہتی۔ اس لیے ظاہر ہے کہ جو لوگ غلط طریقہ کار کو اپنا کر انتخاب جیتے ہوں گے وہ اپنے علم و فضل کے معیار کو آگے چل کر کیسے قائم رکھ سکیں گے۔ چنانچہ یہ بات عام طور پر دیکھنے میں آئی ہے کہ اکثر و بیشتر جنھوں نے انتخابات میں حصہ لیا، انھوں نے بالآخر کسی جگہ برادری کا سہارا لیا، کسی جگہ روپے پیسے کا تو کسی جگہ غلط ووٹ ڈالنے کا، غرضیکہ بات وہیں پہنچتی ہے۔ مجھے 1970ء کے انتخابات میں پہلی مرتبہ یہ معلوم کر کے بے حد افسوس ہوا کہ انتخابات نے بے شمار حضرات کو علم و فضل کے بلند مرتبے سے نیچے عام سطح پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ اس سے پہلے میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ کچھ علماء جو علم و فضل اور سیاست و معاشرت کے بلند مرتبے پر ہوں وہ بھی انتخابات میں برادریوں اور قبیلوں کے بتوں کی پوجا کا پرچار کرتے ہیں۔ مجھے تو اس سے بے حد مایوسی ہوئی اور اپنی بے خبری پر ندامت بھی۔ مولانا رومی کا وہ شعر کتنا سچا ہے:

علم را بر دل زنی یار بود

علم را بر تن زنی مارے بود

یہی نہیں بلکہ اچھائی، شرافت اور دین کے کسی دعویدار نے اگر انتخابات میں حصہ لیا اور کامیاب ہو گیا تو آگے جا کر وہ بھی اسی نقارخانے کی نذر ہو گیا۔ اس ضمن میں ایک بڑی برمحل مثال ہے، ہمارے ایک معروف عالم دین جو میرے دورِ صدارت میں اسلامی قوانین کی ترتیب و تدوین وغیرہ کی طویل مشق میں بہت نمایاں خدمات سرانجام دیتے رہے اور ہر طبقہ

میں اپنے لیے انھوں نے عزت کا مقام پیدا کیا بلکہ مسٹر جسٹس حمود الرحمان مرحوم نے بھی ان کی بے حد تعریف کی اور میری خواہش بھی رہی کہ انھیں اور زیادہ مؤثر خدمت کا موقع ملتا، لیکن جب انھوں نے انتخابات میں حصہ لیا تو اکثر لوگوں نے بتایا کہ ایک تقریر کے دوران انھوں نے کہا ''سردار قیوم تو محض سیاسی مصلحت کے لیے اسلامی قوانین کا نفاذ کر رہا تھا'' اس سے زیادہ اور کیا غلط بات ہوسکتی تھی۔ ہماری سیاسی مصلحت بھٹو صاحب کے دور میں کیا تھی یہ کس کو معلوم نہیں بلکہ سیاسی مصلحت تو وہ تھی جس پر مولانہ خود عمل کرتے رہے کہ دو سال کا عرصہ اسمبلی میں گزارا مگر کبھی بھول کر بھی اسلامی نظام کا نام نہ لیا۔ یہ ہے وہ خرابی جو اس پوری مشق سے حاصل ہوئی، یہ کتنا بڑا خسارہ ہے۔ اسی طرح برادریوں کے بارے میں علماء کے طرزِ عمل کو ذرا دیکھیئے کہ پنجاب سے کچھ علماء حضرات جو میرے نزدیک قابل احترام رہے ہیں، مظفرآباد محض اس لیے تشریف لائے کہ مسلم کانفرنس میں سے اپنی برادری کے بعض نمایاں کارکنوں کو نکال کر پی پی میں شامل کیا جائے۔ ذرا غور کیجئیے کہ کس طرح علم وفضل، مذہب اور دین سب کچھ اس سیاست کی نذر ہو جاتا ہے، جن لوگوں کو ان علماء حضرات کے کردار کے اس پہلو کا علم ہو جائے ان کی نگاہ میں علماء کے علم وفضل کی کیا عزت باقی رہے گی۔ اگر یہ فرقہ واریت کی وبا نہ ہوتی تو ایسے علماء حضرات کو خود بھی قدر عافیت معلوم ہو جاتی۔ یہ کوئی ایک آدھ اتفاقی واقعہ نہیں ہے، اس کا ردعمل صرف علماء حضرات کی ذات تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ بدقسمتی سے اس سے بہت آگے جا پہنچتا ہے ورنہ سیاسی میدان میں کوئی بخل نہیں ہے، یہ بہت کھلا میدان ہے، اس میں جتنے لوگ چاہیں شریک ہوں اسطرح بلدیاتی انتخابات میں تفرقوں کا جو طوفان اُٹھا، اس نے ایسے گوشے بھی متاثر کیے جن کے بارے میں کوئی عقلی گمان ممکن نہیں تھا۔ ابھی انتخابات دور ہیں مگر بعض علماء حضرات کی نقل وحرکت کی وجہ سے ابھی سے دونوں طرف زبانیں کھل رہی ہیں۔ جب اصل وقت آئے گا تو اس وقت کیا قیامت برپا ہوگی؟

ملک بھر میں آزاد کشمیر وہ خطہ ہے جہاں علماء کا رکھ رکھاؤ ابھی کافی حد تک باقی ہے۔

خدا نہ کرے کہ یہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے اور حاصل کچھ بھی نہ ہو۔ اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ نہیں صاحب، ایسا نہیں ہوگا۔ ہم انتخابات اسطرح لڑیں گے کہ کسی کو خبر تک نہ ہوگی تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑا فریب یا خود فریبی اور کوئی نہیں ہے۔ جماعت اسلامی جیسی تنظیم جو عرصہ دراز سے ایک خاص نہج پر چل رہی ہے اور اس کے لیے بڑی مشق و مشقت سے گزری ہے، وہ بھی اس حمام میں ایسی ننگی ہوئی ہے کہ سب کو مات کر دیا۔ ہمارے ہاں تو یہ لوگ اب محض تھرڈ کلاس سیاسی ہتھکنڈے استعمال کرنا ہی اپنا اصل کام سمجھتے ہیں۔ انتخابات اور سیاست میں غلط کاری سے بچنے کیلئے اپنے یقینِ کامل کے علاوہ بڑی انتظامی صلاحیت اور قابلیت درکار ہے۔ کہنے کو تو ہر شخص اس کا دعویٰ کر سکتا ہے مگر میدان عمل میں اس کا مہیا کرنا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک انتخابات میں حصہ لینا ایک مدت تک ناجائز تھا مگر وہ جائز ہو گیا اور جب جائز ہو گیا تو اس کے مروجہ لوازمات بھی خود بخود جائز ہو گئے۔ ان کا ذکر مثال کے طور پر اس لیے کرتا ہوں کہ ایک عرصہ تک جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان افکار سے متاثر تھا اور توقع کرتا تھا کہ یہ لوگ کسی معاملہ میں بھی پسپائی اختیار نہیں کریں گے لیکن جب وہ بھی نہ ٹھہر سکے تو کسی دوسرے کی بات ہی کیا۔ ہم لوگ اکثر و بیشتر بعض اصولوں کی پابندی کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہوئے ہیں تو اسکی بھی بڑی وجوہات ہیں جو آسانی سے میسر نہیں آئیں۔ اس لیے میں نے اس پر جس قدر غور کیا ہے، خلوصِ نیت کے ساتھ اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ علماء کی جماعتوں کو نہیں چاہیے کہ وہ علماء کو انتخاب لڑوائیں الا یہ کہ نہایت آسانی سے کسی مہم کے بغیر اور مذہبی آداب وقواعد اور اپنے علمی تجربے کا لحاظ رکھتے ہوئے منتخب ہو سکتا ہو۔

مسلم کانفرنس کے ہاں علماء کا مقام:

ہمارے ہاں ایسے علماء موجود ہیں کہ جن کو بڑے سے بڑا مرتبہ مل جائے تو مجھے خوشی ہو گی اور ان کو اس کا مستحق سمجھوں گا، مگر جب وہ کسی حلقہ انتخاب سے لڑنا چاہیں گے تو وہاں دوسروں کے علاوہ ہمارا بھی کوئی امیدوار ضرور ہو گا کیونکہ ایسا کوئی حلقہ نہیں ہے جہاں ہمارے ایک سے زیادہ امیدوار نہ ہوں اور وہ سب کے سب مستحق لوگ نہ ہوں پھر ان کی پشت پر طویل سیاسی خدمات اور قربانیاں بھی ہیں۔ اگر وہ خود اس حق سے دستبردار نہ ہوں تو ہم انھیں اس پر مجبور نہیں کر سکتے، ظاہر ہے کہ اس انتخابی مہم میں تو پھر وہی حمام والی بات ہے۔ اگر شرافت کے سب اصول بھی اپنائے جائیں تب بھی جمہوری حق اتنا باقی رہتا ہے کہ کوئی شخص اپنے امیدوار کی کامیابی کیلئے ہر ممکن کوشش کرے۔ اس سے پھر ہم اسی مقام پر واپس آجاتے ہیں اور اس مرتبہ مسلم کانفرنس کے ذمہ دار حضرات سے میں یہ بات کہوں گا کہ وہ کسی معروف بے دین اور بد معاش کو ٹکٹ جاری نہ کریں بلکہ اگر خدانخواستہ کسی جگہ ایسی صورت پیدا ہو جائے جو بظاہر دکھائی نہیں دیتی تو اصولاً یہ طے کر لیا جائے کہ ایسی صورت میں کسی دوسرے بہتر امیدوار کی امداد کی جائے، خواہ وہ ہمارا کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو اپنے امیدوار میں سیاسی اصلاحات اور استحقاق کے علاوہ اس کو اولیت حاصل ہے اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ اس شخص کا تعلق مذہب کے ساتھ کیسا ہے اگر واجبی حد تک بھی ہو تب بھی قابلِ برداشت ہے ورنہ نہیں۔

دین و سیاست:

اس ضمن میں ایک اور اہم اور بنیادی بات قابلِ ذکر ہے۔ اکثر سنا گیا ہے کہ دین و سیاست ایک ہی چیزیں ہیں کئی لوگ اس کے جواز میں یہ مصرعہ پیش کرتے ہیں:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اور کئی دوسرے لوگ ہیں کہ وہ اس سے بھی دور کی کوڑی نکال لاتے ہیں، کہتے ہیں کہ سیاست

چونکہ فراست ہے اور فراست کے بارے میں خدا کے حبیبﷺ کا ارشاد ہے ”اتقو فراسة المومن انه فنظر بنور الله“ ترجمہ ”مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے“

تو گویا اس طرح ہر مومن صاحب فراست ہے، لہذا وہ صاحب سیاست بھی ہے۔ اس طرح کئی دلیلیں اور بھی لاتے ہیں، گویا اس طرح عقیدہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہر شخص جو مسلمان ہے وہ سیاست دان بھی ہے۔ اور جو جتنا مومن ہے اتنا ہی وہ صاحب سیاست بھی ہونا چاہیئے۔ لہذا سیاست اور دین اس طرح سے اکٹھے ہو سکتے ہیں .... اس فکر کو عملی نقطہ نظر سے ذرا دیکھیئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی عملی صورت کیا ہے۔ نیز یہ کہ اس اصول کا اطلاق تاریخ اسلام میں کس طرح ہوتا رہا ہے۔ عملی صورت یہ ہے کہ اگر مفروضہ کو مان لیا جائے تو پھر ہر مسلمان کو خود بخود ڈاکٹر، انجنیئر اور تمام فنون کا ماہر بھی ہونا چاہیئے جو سب کو معلوم ہے کہ نہیں ہوتا۔ سیاست بھی نہ صرف ایک فن ہے بلکہ میری حتمی رائے میں کارِ نبوت کے بعد سب سے مشکل کام ہے، اس لیے بھی دوسرے فنون کی طرح ہی جب تک ایک فن کا جوہر کسی کی فطرت یا جبلت میں نہ ہوگا تو کوئی تعلیمی ادارہ اسے یہ فن عملاً نہیں سکھا سکتا اس کا کتابی علم چاہے جس قدر وہ پڑھ جائے مگر کبھی بھی وہ ارباب فن کی صف میں شمار نہیں ہوگا بلکہ سیاست میں تو ایک اضافی اور منفرد امر یہ ہے کہ دوسرے تمام فنون کے عالم ان کے ماہر عامل بھی سمجھے جاتے ہیں مگر سیاست کے کتابی علم کا کوئی ماہر محض اس کے علم کے باعث سیاست دان نہیں بن سکتا نہ بنا ہے۔ چنانچہ سیاسیات کے عالم، پروفیسر تو بہت ہیں مگر ان میں کوئی سیاست دان نہیں ہے۔ اس میں ان کے علم و فضل کا قصور نہیں ہے بلکہ یہ گویا ایک پیدائشی یا فطری امر ہے جو سیاست میں کارفرما ہے، اسی لیے یہ سب جلیل القدر علماء جو علم و فضل کے آفتاب تھے ان میں کوئی بھی عملی سیاست دان نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں دنیا بھر کے موضوعات پر اعلیٰ سے اعلیٰ اور معیاری کتابیں تو موجود ہیں مگر سیاست پر کوئی ایک کتاب بھی موجود نہیں ہے۔ سیاست کے

فلسفہ پر تو کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ، ابنِ تیمیہ اور کئی دوسرے حضرات نے اس موضوع پر کافی کچھ لکھا ہے مگر کوئی ایک کتاب بھی اس موضوع پر ایسی نہیں ہے جو کسی ایسے شخص نے لکھی ہو جو خود سیاست دان رہا ہو۔ ابنِ خلدون نے اپنے مقدمے میں اس پر کافی کچھ لکھا ہے مگر وہ بھی اگر دیکھا جائے تو اس ہمہ گیری سے محروم ہے جو سیاست کا تقاضا ہے اور جس کی ضرورت ہر اس شخص کو ہوتی ہے اور ہوگی جو سیاست میں اسلامی نقطہ نظر سے رہنمائی چاہتا ہو۔ (تصویر: سردار محمد عبدالقیوم خان وزیرِ اعظم کا حلف اُٹھاتے ہوئے)

اسوۂ حسنہ:

بات طویل ہوگئی۔ صرف خلفاء راشدین کا پاک زمانہ ہے جو ہمارے لیے قیامت تک ایک نمونہ ہے مگر وہاں بھی بات وہی ہے کہ ان مبارک حضرات نے بھی اس موضوع پر خود کوئی کتاب تصنیف نہیں کی نہ اس وقت اس کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ یہ حضرات گرامی ایسے منفرد کردار کے مالک تھے کہ وہاں اب شاید قیامت تک کسی کی رسائی نہ ہو سکے۔ میں تو شاید اپنی کم علمی اور بے عملی کی وجہ سے کئی بار سوچتا ہوں کہ آیا خلافت راشدہ کا مبارک دور اسلامی نظام کی وجہ سے تھا یا ان حضرات کرام کے کردار کی عظمت کے باعث تھا کیونکہ اگر اس دور میں سے ان مبارک ہستیوں کو منہا کر دیا جائے پھر باقی جو رہتا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اس سے تو بہر حال انکار نہیں کہ ان حضرات کی عظمت کو بھی اسلام نے ہی چار چاند لگائے مگر خود نفس اسلام اور اسلامی نظام کا فرق بھی واضح ہے۔

چنانچہ دیکھیئے کہ اس دور میں ہوا کیا۔ نبی کریم ﷺ نے جن حضرات کو حکمرانی کیلئے پسند فرمایا وہ سب کے سب وہی حضرات کرام تھے جو اسلام سے پہلے بھی سیاست دان تھے۔ پھر حضور ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو کسی عہدہ کی طلب کا جو جواب عطا فرمایا وہ بجائے خود اس پورے معاملے میں ایک اصولی فیصلہ ہے، بات اگر صرف تقویٰ اور ایمان کی ہوتی تو حضرت ابوہریرہؓ سیاسی فراست میں کسی سے کم نہیں تھے۔ اس لیے یہ امر تو ناقابلِ تردید ہے کہ سیاست

کا فن محض اسلام اور ایمان کی وجہ سے نہیں آ سکتا۔ سرورِ کونینﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ ''خیارکم فی الجاھلیة خیارکم فی الاسلام'' ترجمہ ''دور جاہلیت میں تمہارے نیک لوگ، دور اسلام میں بھی نیک ہیں''

اس سے بھی بہت حد تک یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی طرح ضعیف اور قوی مومن کے فرق کے بارے میں حضورﷺ کا ارشاد مبارک بھی راہنمائی کرتا ہے۔ پھر سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دین، ایمان اور سیاست کو اکٹھا کیسے کیا جائے تو ظاہر ہے اس کی بھی بڑی تفصیل ہے مگر میرے خیال میں اس کے صرف دو طریقے ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ یا کوئی مومن سیاست میں آ جائے، دوسرا یہ کہ کوئی سیاستدان اپنے آپ کو اسلام کے تابع اور سپرد کردے۔ زیادہ قرین امکان اور مؤثر طریقہ یہی دوسرا ہے اور اسی پر پوری تاریخ میں عمل ہوتا رہا ہے۔ خود قائداعظم کی مثال لیجئے۔ اس وقت متحدہ ہندوستان میں دینی اعتبار سے علم وفضل کے جو آفتاب و مہتاب موجود تھے، شاید کہ کبھی اس ملت کو پھر ایسا وقت میسر آ جائے لیکن دیکھئے کہ ملت اسلامیہ کی قیادت کون کر رہا تھا۔ یہی نہیں کہ وہ شخص محمد علی جناحؒ تھا بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے گویا ان کے علاوہ دوسرا کوئی بھی شخص وہ کام کر ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ جب اس شخص محمد علی جناحؒ نے خود کو اسلام کے سپرد کر دیا تو وہ مسلمانوں کا قائداعظمؒ کہلایا اور اکثر و بیشتر علماء اور مشائخ نے اسی کو اپنا سیاسی راہنما تسلیم کیا، حتیٰ کہ اس بات کا بھی کوئی خیال نہ رکھا کہ قائداعظمؒ خود کس مذہب فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ نہ قائداعظم کے قول وفعل سے اس کا اظہار ہوا، خاص طور پر پاکستان کی حمایت کرنے والے دینی طبقہ نے تو بلا شرط قائداعظم کی قیادت پر اعتماد کیا۔ اس لیے وہ علماء اور مشائخ حضرات جو سیاست میں عملاً حصہ لینے کے خواہش مند ہیں اگر ان گزارشات پر غور کر لیں تو میرے خیال میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔

آزاد کشمیر میں جماعت سازی کی عیاشی

جماعت سازی کے اسباب:

آزاد کشمیر میں سیاسی جماعت سازی کی جو عیاشی ہو رہی ہے اس کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں بھی ہمارے عوام و خواص کو کچھ معلوم ہونا چاہیئے یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ آزادی اور جمہوریت کے تقاضوں میں سیاسی جماعتوں کا بننا اور بگڑنا طبعی امر ہے اس کو برا نہیں سمجھا جا سکتا۔ تاہم جماعتوں کی فراوانی اور اس قدر بہتات کا ایک سبب تو یہی ہے کہ جب انتخابات کا عمل رک جائے تو جماعتیں خود بخود اگنا شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک تو اس لیے کہ بقاء اصلح یا قرآن کا اصول بقاء انفع (سب سے بہتر کا باقی رہنا یا سب سے مفید کا باقی رہنا) تو کارفرما نہیں رہتا۔ اس لیے جس کا جو جی چاہے کرے۔ جب کسی پر کسی کی ذمہ داری نہیں رہتی تو پھر ذہنی عیاشی کا ماحول خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے اس لیے بھی ایسا ہونا طبعی امر ہے کہ جب ایک عمل رک جائے تو اس کا متبادل عمل خود بخود شروع ہو جاتا ہے۔ کوئی چیز ساکن نہیں رہ سکتی کیونکہ کارخانہ قدرت میں سکون محال ہے۔ اگر آزاد کشمیر میں انتخابات ہوتے رہتے تو شاید ہی کچھ لوگ اس ذہنی عیاشی میں پڑتے۔ ہمارے ہاں جماعتوں کی تخلیق چند اور وجوہ سے بھی ہوئی ہے، ایک تو تاریخی سیاسی عمل کی وجہ سے، جیسے کل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس، دوسرے حصول اقتدار کی خواہش میں، جیسے پی پی اور آزاد مسلم کانفرنس، تیسرے منفی رجحانات کے تقاضوں کی وجہ سے، جیسے لبریشن لیگ، محاذ رائے شماری وغیرہ اور چوتھے سیاسی حادثے سیاسی خلاء کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئیں۔ پی پی بھی دراصل اس سیاسی خلاء کے باعث وجود میں آئی، جو ہماری ملی سیاست میں عرصہ سے پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے ایوب خان کا مارشل لاء۔ ایوب خان مرحوم کے ایک قریبی دوست نے نہ صرف مجھے بلکہ کئی لوگوں کو بتایا کہ اس شخص نے ایوب خان سے جب وہ کمانڈر

انچیف تھے ایک دن یہ کہا کہ ایوب خان آپ حکومت کیوں نہیں سنبھال سکتے! جواب میں ایوب خان نے جب کوئی حوصلہ افزا بات نہ کی تو وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے کہا اچھا تو لالہ میں ہی حکومت سنبھال لیتا ہوں، اس پر ایوب خان نے پوچھا وہ کیسے؟ یہ صاحب ایک وقت محکمہ حسابات کے افسر تھے مگر ایوب خان کے ساتھ بہت پرانی رفاقت تھی اور ایوب خان کو لالہ کہہ کر پکارتے تھے۔ دلچسپ بات وہ ہے جو اس افسر نے ایوب خان کے سوال کے جواب میں کہی، وہ کہتا ہے کہ ..... ''یہ تو بہت آسان ہے اس وقت ملک کی حالت ایسی ہے کہ جو بھی جا کر ریڈیو پر اعلان کر دے کہ وہ صدر ہو گیا ہے تو سب لوگ اسی کو صدر مان لیں گے''۔

سیاسی خلاء:

ہماری سیاست میں جو خلاء ایک مدت سے چلا آ رہا ہے اس میں کوئی بھی شخص کوئی بھی منفی نعرہ لگا کر کامیاب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ 70-1969ء میں جب سوشلزم کے خلاف فتویٰ دیا گیا تو میں نے علماء کرام سے گزارش کی کہ ایسا نہ کریں، اس فتوے کو کوئی نہیں مانے گا اور وہی ہوا۔ وجہ یہ نہیں کہ خدانخواستہ ہمارے لوگ اسلام سے پھر گئے ہیں بلکہ اصل وجہ وہ خلاء ہے جس کو صحیح طریقہ سے پر کرنے کی بجائے محض فتویٰ کے ذریعے پر کیا جا رہا تھا، جو کسی صورت بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص کو بھوک لگی ہو تو فتوے کی رو سے اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ صاحبان حق کی بات نہیں بلکہ عامتہ الناس کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے کئی لوگوں سے ایک ہی جواب سنا، اکثر نے یہی کہا کہ وہ اسلام والوں کے کھوکھلے نعروں سے تنگ آ گئے ہیں، اگر اسلام والے مخلص ثابت نہیں ہو سکتے تو ان دوسروں کو بھی آزما لینے میں کیا فرق پڑے گا۔ اس سوچ کی اصلاح روئے زمین کے کسی فتویٰ سے نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے تو ملک کی اقتصادی حالت درست کرنے کا پروگرام دینا ہو گا، طبقاتی کشمکش کو ختم کرنے کیلئے اقدامات کرنے ہونگے، سیاسی بصیرت کا مظاہرہ ضروری ہے۔ عوام کی جان و مال، عزت و آبرو کا تقدس بحال کرنا ہو گا، اور ملک کی اس انتظامیہ کو ایک آزاد اور غیور قوم کے شایانِ شان بنانا ہو گا اور

اگر برا نہ مانا جائے تو اس ملک کے متوسط نچلے طبقہء قوم کے لیے روٹی کپڑے اور مکان کی ضمانت مہیا کرنا ہوگی، رشوت کے طور پر نہیں، استحقاق کے طور پر بلکہ مذہبی فریضے کے طور پر۔ طب کہیں یہ خلاء پر ہوگا ورنہ اس میں دیو ہی بسیں گے۔ چھومنتر کا زور کب تک مارشل لاء کی صورت میں اس کا مداوا کرے گا۔ بہر حال دوسرے جو بھی اسباب ہوں مگر جماعت سازی کی اس عیاشی کے اسباب میں ایک قدر مشترک بھی ہے۔ شخصیات کا تصادم، اس پوری ملت کے باوجود میں ایک دائمی مرض کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ بااین ہمہ ایک اور امر جو کشمیری سیاست کے ضمن میں قابل ذکر ہے اور قابل غور بلکہ نہایت ہی اہم ہے اور ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے، وہ ہمارے لوگوں کے ذہن میں نہیں رہا یا دانستہ اسے صرف نظر کیا گیا ہے یا اسے سرے سے تسلیم نہیں کیا گیا کہ کشمیری سیاست میں اس تمام جماعتی کشمکش کو اس بنیادی نقطہ نظر سے دیکھا جائے کہ آیا ہمارے حالات کے تقاضوں میں مسلم کانفرنس کے سوا کسی بھی دوسری جماعت کا وجود جائز بھی ہے یا نہیں، اور دوسرے یہ کہ اس جماعت سازی کا نقد نتیجہ برآمد ہوا یعنی فائدہ اور نقصان کیا ہوا۔

آزاد کشمیر کے عوام کی خصوصی حیثیت:

پہلے تو یہ دیکھیں کہ ان جماعتوں کا قومی و ملی مفادات کے نقطہ نظر سے جواز و عدم جواز کیا ہے۔ چنانچہ ملی مفاد کا کوئی معیار بھی متعین کر لیا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ آزاد کشمیر میں سب کو معلوم ہے کہ فائر بندی (CEASEFIRE) ہوئی ہے نہ وقفہ۔ اس کے لفظی اور عملی دونوں نتائج فی زمانہ محض ایک ایسا واقع ہے کہ جس کو دونوں طرف کی قوتیں اپنے اپنے مفادات میں استعمال کریں۔ جنگ ابھی جاری ہے اور وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ واقعی جاری ہے، سوائے اس کے کہ گولی چلنا سردست اصولاً تو بند ہے مگر عملاً تو اکثر

وہ بھی سنائی دیتی ہے۔ اس میں ایک اہم غور طلب امر یہ ہے کہ اس جنگ کے فریق تو سب پر واضح ہے، وہ بھارت کی ٹڈل دل فوج ہے جو سب کو معلوم ہے لیکن دوسری جانب یعنی ہماری اپنی جانب اس فوج کے مقابلہ میں کون ہے؟ وقت کے ساتھ ساتھ اس بارے میں عام و خاص دونوں قسم کے لوگوں کی سوچ میں ایک بنیادی غلطی پیدا ہوگئی یا کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ بھارت کی فوج کا مقابلہ پاکستان اور آزاد کشمیر کی فوج کو ہی کرنا ہے اور عوام ان کے امدادی ہیں۔ یہ سوچ ایک عام آدمی کے نقطہ نظر سے تو کوئی غلط یا بری سوچ نہیں بلکہ عام قاعدہ بھی یہی ہے البتہ اس قدر سب کو ضرور معلوم ہو گا کہ کوئی بھی فوج ہو وہ عوام کی اخلاقی تائید و حمایت کے بل بوتے پر ہی کامیابی سے لڑ سکتی ہے۔ یہ سب تو وہ معروف اور اہم امور ہیں جن کی کچھ زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے لیکن آزاد کشمیر کے بارے میں صورتِ حال بالکل دوسری ہے، وہ یہ کہ بھارتی فوج کے مقابلے میں ہماری اصل لڑاکا فوج آزاد کشمیر کے عوام ہیں جب کہ باوردی حضرات ہمارے امدادی ہیں یعنی یہ صورت پہلی اور عام صورت کے بالکل برعکس ہے، صحیح بھی یہی ہے کیونکہ اولاً آزاد کشمیر کا خطہ زمین کسی باقاعدہ فوج نے آزاد نہیں کرایا۔ جس وقت فائر بندی کی گئی اس وقت تقریباً چالیس ہزار مجاہدین محاذوں پر تھے اور بھارتی فوج کی زبردست ناکامی نوشتہ دیوار دکھائی دیتی تھی۔ معاملہ ان ہی چالیس ہزار پر موقوف نہیں تھا، بلکہ ہمارا ہر فرد اس جنگ میں کسی نہ کسی طریقے سے شریک تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، فوجی، غیر فوجی غرضیکہ کہ یہ کئی لاکھ مجاہدین کی فوج تھی جو بھارتی فوج کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اس طرح ان کا مقابلہ کرنا بھارتی فوج کے بس کا روگ نہیں رہا تھا۔ ایک وجہ تو یہ ہے اور دوسری وجہ جو اس سے بھی اہم تر ہے وہ یہ کہ بھارت کے ساتھ فوجی مقابلہ کا انحصار لامحالہ افرادی تعداد، اسلحہ کی مقدار اور بیرونی امداد و حمایت پر ہو گا اور اس میں کسی کو شک و شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس بارے میں ہماری پوزیشن کیا ہے۔ بھارتی فوج کی تعداد، اسلحہ ساز و سامان اور جنگی صلاحیت ان سب کے بارے میں کسی کو ہماری غلط فہمی یا خوش فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ تاہم ایک ہتھیار اور

ایک جنگی صلاحیت ہمارے پاس ایسی بھی ہے کہ اس کے مقابلے میں بھارت کی فوج کی تعداد، اسلحہ اور صلاحیتیں سب بیکار ہو کر رہ جاتی ہیں، وہ یہ ہے کہ بھارت کو ہم پر حملے کی صورت میں صرف باوردی فوج کے ساتھ ہی نہیں بلکہ بیس لاکھ کے قریب بے تنخواہ مجاہدین کے ساتھ لڑنا پڑے گا۔ یہ مجاہدین بھی کوئی نامعلوم نہیں ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے بھارت اور ریاست کشمیر کی نہایت ہی اعلیٰ تربیت یافتہ فوج کے دانت جلد ہی کھٹے کر دیئے تھے۔ چنانچہ اگر خدانخواستہ ہماری فکر اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتی تو ہمیں اپنے انجام سے بے خبر نہیں رہنا چاہیئے۔

یوں بھی بھارت کے مقابلے ہماری کوئی بھی جنگ محض فوجی جنگ نہیں ہونی چاہیئے، وہ قومی جنگ ہو گی تب ہم بھارت کی درندگی سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ہماری حکمتِ عملی کا یہی سنگِ بنیاد ہے کہ اگر اس پر توجہ دی جائے تو بھارت کو اس کے جارحانہ عزائم سے بہر صورت روکا جا سکتا ہے۔ اگر ہم بھارت کو یقین دلا دیں کہ آزاد کشمیر پر حملے کی صورت میں معاملہ وہی ہے جو میں نے کہا ہے، یعنی اس کو لاکھوں کشمیری مجاہدین سے لڑنا پڑے گا تو کسی بھی اندازے کے مطابق بھارت کی پوری فوج یکسو ہو کر بھی آزاد کشمیر پر حملہ کرنے سے پہلے ہزاروں مرتبہ سوچے گی۔ بھارت صرف اسی وقت حملہ کرے گا جب اس کو یقین ہو کہ معاملہ چند دن کا ہے لیکن اگر اسکو یقین ہو جائے کہ بات اس کے برعکس ہے اور پہاڑوں اور جنگلوں میں بسنے والی اس لڑاکا جنگ جو آبادی کے ساتھ مدتوں لڑنا ہو گا تو وہ یہ اقدام ہی کر سکتا ہے نہ اس کا متحمل ہو سکتا ہے۔ ہمارا کیا لگے گا، بھارتی فوج کا ہی اسلحہ، ساز وسامان۔ اور راشن اپنے گھروں سے، پھر چلنے پھرنے کی آسانی جو پہاڑی جنگ میں خود ایک اعلیٰ ہتھیار ہے، ان میں سے ایک بات بھی بھارتی سینا کو میسر نہ ہو گی۔ یہ وہ فوقیت ہے جو قدرت نے ہمیں عطاء کر رکھی ہے، ہاں اگر ہم اس سے استفادہ نہ کر سکیں تو اس بدنصیبی کا کیا علاج؟۔

میں تو یہ کہوں گا کہ اگر بھارت واقعی ہمارے ساتھ پنجہ آزمائی کرنا چاہتا ہے تو اس

کے لیے ہمارے نقطہ نظر سے بھی کشمیر کی سرزمین سے بہتر کوئی مقام نہیں، اس پر ہمیشہ کیلئے ہمارے درمیان معاملات طے ہو جائیں گے، کیا عجب کے بھارتی فوج کو اسی دریائے نیلم میں غرق ہونا پڑے۔

حالت جنگ کا تقاضا:

اس نقطہ نظر سے دیکھئے کہ جب آزاد کشمیر کی تمام آبادی ایک فوج کی حیثیت رکھتی ہے تو کیا اس میں مختلف اور متضاد خیال جماعتوں کا ہونا جائز ہے۔ پھر ہمارا رخ ایک طرف کیسے رہ سکتا ہے جب کہ ہم ایک دوسرے کے شدید مخالف بھی ہوں۔ اسی حقیقت کو سمجھنے میں ہمارے سیاسی زعماء سے شدید غلطی ہوئی ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ اولاً معاملہ اب ختم ہے، اس لیے جو کچھ ہے اسی کی بندر بانٹ میں لگ جاؤ۔ دوسرے یہ کہ اگر کچھ باقی ہے تو وہ پاکستان اور حکومت پاکستان کی ذمہ داری ہے۔ ورنہ اس قسم کا باہمی متضاد سیاسی شغل کیسے شروع ہو سکتا ہے۔

شروع میں ایک عرصہ تک سوچ درست رہی ہے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان کے دور تک تو اس امر کا بھی خیال رکھا جا رہا تھا کہ مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل کے اراکین میں بھی کوئی تبدیلی نہ کی جائے کیونکہ جو مسلم کانفرنس ہمارے دعویٰ کی دلیل ہے، وہی باقی رہنا چاہیے، لیکن ہمارے کچھ اکابرین نے اسی وقت سے انتخابات، جمہوریت اور پارلیمنٹ وغیرہ کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ وہ جس قدر مخلص ہی کیوں نہ ہوں مگر ظاہر ہے کہ بنیادی فکر میں تبدیلی کی غمازی کر رہے تھے۔ بھارت کی منظّم و متحد فوج کے مقابلہ میں اگر ہماری اس مؤثر عوامی فوج کو انتشار و افتراق کا شکار کر دیا جائے، نظریات بدل جائیں، طریقہ بدل جائے اور باہمی تضاد پیدا ہو جائے تو کون نہیں جانتا کہ اس کا نقصان کیا ہے اور کس کو ہے۔ یہ سب بالآخر کس کے فائدے میں ہے، کس کی نیت کتنی خالص اور نیک کیوں نہ ہو مگر اس انتشار کا فائدہ صرف دشمن ہی کو پہنچتا ہے اور نقصان اس پوری وحشت ناک صورت حال میں امیدوار کی ایک کرن جو ہنوز

باقی ہے اور اس تمام خرابی کی راہ میں حائل ہے وہ مسلم کانفرنس کا ہی وجود ہے، ہزار آزمائشوں اور مشکلات کے باوجود اس کے مخلص اور جانباز کارکنوں کا یقین و ایمان کسی صورت میں متزلزل نہیں ہوا۔ اگر وہ تھوڑی سی مزید لگن اور شوق سے محنت کریں اور حکومت پاکستان اس قوت کو شکست دینے کے درپے نہ ہو جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا ہے تو خدا کے فضل و کرم سے تمام غیر اخلاقی نعرے لگانے والے مل کر بھی اس صورتِ حال کو خراب نہیں کر سکتے، کیونکہ عوام الناس تو بہرصورت سچے اور جانباز پاکستانی ہیں اور بھارتی حملہ کی صورت میں آزاد کشمیر کے انچ انچ پہ لڑنے کی صلاحیت اور یقین رکھتے ہیں۔ اگر ہماری حکومتیں ان جنگجو لوگوں کو اقتدار کے چکر میں نہ پھنساتیں اور ان کی حوصلہ شکنی نہ کرتیں تو ان کی یہ بے پناہ قوت بھارت کے سر پر ایک مؤثر تلوار کے طور پر لٹکتی رہتی۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ان صلاحیتوں کو اب بھی بیدار کیا جا سکتا ہے، ابھارا جا سکتا ہے اور منظّم کر کے اس ملک کے دفاع کیلئے موثر طریقہ سے کام میں لایا جا سکتا ہے۔

دفاع کی بات اس لیے زیادہ کرتا ہوں کہ بھارت کو اب ہم سے کسی حملے کا خوف نہیں ہے، بلکہ اب اس کی خواہش اور پوری کوشش یہ ہے کہ جب کبھی وہ ہم پر حملہ کرے تو پاکستان اپنا دفاع نہ کرے نہ دفاع کرنے کا اہل ہو اس لیئے ہمارے لیئے ضروری ہے کہ ہم اپنی دفاعی صلاحیتوں میں اضافہ کریں، ان کو منظّم کریں اور صحیح طریقہ سے بروئے کار لائیں۔ اگر ہم اس پہلو پر توجہ دیں تو ان شاء اللہ وہ صورت نہیں ہو گی جو مشرقی پاکستان میں محض مسلم لیگ کے کمزور اور غیر مؤثر ہونے کی وجہ سے ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں جو ہوا وہ بھارت کا کمال تھا، ہماری غفلت اور نا اہلی کا وبال زیادہ۔

بے جواز جماعت سازی کے نتائج:

اب اس جماعت سازی کی عیاشی کے نتائج پر ذرا غور کیجئیے۔ اس سے انتشار، ناراضگیاں، تلخیاں اور فساد پیدا ہونے کے علاوہ کوئی ادنیٰ سا فائدہ بھی نہیں ہے جس کا ذکر کیا

جا سکے۔ اس سے نہ صرف کہ یہ نظریاتی قافلہ آپس ہی میں لڑتا رہا بلکہ ایک دوسرے کی مذمت، تذلیل اور تحقیر میں لگا رہا۔ اس کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا وہی ہوا۔ ہماری توجہ نہ صرف مقصد ہی سے ہٹ گئی بلکہ وہ بری طرح بٹ گئی۔ ہمارا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا، ہمارے دلوں سے ایک دوسرے کے لیے محبت، مروت اور ہمدردی کے جذبات نہ صرف اُٹھ گئے بلکہ ان کی جگہ منافرت اور دشمنی نے لے لی۔ یہ بات کون نہیں جانتا کہ کشمیر کی آزادی تو بڑی بات ہے، اس انتشار کی موجودگی میں ایک انچ زمین حاصل کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس طرح یہ انتشار تو گویا دشمن کی سلامتی کی ضمانت مہیا کرتا ہے۔

دوسرا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ہماری تحریک کا رُخ سرینگر کی بجائے مخالف اطراف کی جانب ہو گیا، کچھ مظفرآباد کی طرف حکومت حاصل کرنیکی کوشش پر مرکوز ہو گیا اور کچھ اس سے بھی پرے اسلام آباد بلکہ پاکستان سے باہر کی جانب۔ اندازہ کیجئیے کہ جو قوم پہلے ہی تعداد اور اسباب کے لحاظ سے مختصر ہو اور مقابلہ اپنے سے کئی گناہ زیادہ طاقتور دشمن کے ساتھ ہو، وہ خود ہی جب اس طرح تقسیم ہو جائے تو وہ کونسا کارنامہ انجام دے سکتی ہے؟ ابراہام لنکن نے کہا ''باہم متصاد و منقسم گھر قائم نہیں رہ سکتا''۔ آخر ہماری قوت کا سرچشمہ کتنا وسیع ہوسکتا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے بھی دشمنی کریں، ہمارے مابین یہ شدید تفرقہ کسی دشمنی نے نہ بھی پیدا کیا ہو مگر اس کا فائدہ تو سرا سر اسی کو پہنچتا ہے۔

اگر ان تمام سیاسی جماعتوں کا اولین مقصد فی الواقع کشمیر کی آزادی ہے تو پھر کسے معلوم نہیں کہ اس مقصد کیلئے ہمارے اتحاد اور یک جہتی کا کیا مقام ہے۔ ہاں کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ صاحب! طریقہ کار میں اختلاف ہوسکتا ہے، اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں ہے لیکن اس میں بھی ایک خصوصی امر یہ ہے کہ میرے خیال میں کشمیر کی آزادی کے ضمن میں طریقہ کار کا بھی کوئی اختلاف بوجوہ نہیں ہوسکتا، خاص طور پر ان لوگوں میں تو یہ اختلاف ہونہیں سکتا جن کا مقصد ایک ہے یعنی جو لوگ کشمیر کی آزادی کا مقصد اسلام کے نام پر معرض وجود میں آنے والی

مملکت پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا سمجھتے ہیں۔ البتہ جن کا مقصد ہی دوسرا ہے ظاہر ہے کہ ان کا طریقہ کار بھی مختلف ہونا چاہیئے۔ اس کا مفصل ذکر میں اس سے پہلے کر چکا ہوں۔

یہ امر وضاحت طلب ہے کہ طریقہ کار کا اختلاف کیوں نہیں ہوسکتا، میں نے اس پر جتنی گفتگو کی ہے، بحثیں سنی ہیں اور ایک ذمہ دار شخص کی حیثیت سے سوچا ہے، میں ہر بار اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر ہم طریقہ کار میں قابل ذکر تبدیلی کریں تو وہ مقصد کی تبدیلی کے مترادف ہو جاتی ہے۔ یعنی جس طرح قائداعظم نے کسی موقع پر ہندو قیادت کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے اسی قسم کی بات کی تھی۔ تفصیلات کو بھی طے کرنا اس لیے ضروری ہے کہ بعض تفصیلات خود بنیادوں سے ہی متصادم ہو جاتی ہیں، میرا یقین ہے کہ جو شخص بھی نیک نیتی سے مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر ذمہ دارانہ نقطہ نظر سے غور کریگا وہ لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔ ہاں جو خود کوئی ذمہ داری نہیں لینا چاہتے مگر سگریٹ کا کش لگا کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر گپ شپ کے انداز میں بات کرتے ہیں تو وہ ایسی ایسی راہیں بتلا سکتے ہیں کہ شیخ چلی کی روح بھی شرمندہ ہو۔ خدا تعالیٰ جامع المتفرقین ہے اپنے حبیب ﷺ کے صدقہ میں ہمارے دلوں کا تفرقہ دور فرما کر ہمیں متحد فرمائے۔ آمین۔

سیاسی جماعتوں اور شخصیات کی اس رسہ کشی سے ایک اور جو نقصان ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہر بات میں عدم استحکام اور عوام میں بے یقینی کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے، کسی بھی شے میں استحکام کیلئے تسلسل ناگزیر ہے۔ ہمارے ہاں ہر جماعت اور ہر شخص دوسرے کے کام میں اکھاڑ پچھاڑ کرنا ہی اپنا بڑا کمال سمجھتا ہے اس امر کا خیال نہیں رہتا یا کرنا نہیں چاہتے کہ طے شدہ امور میں اکھاڑ پچھاڑ کی وجہ سے کبھی بھی استحکام نہیں ہو گا، جب کہ سب لوگ استحکام کی ضرورت پر زور بھی دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر نظریاتی سرحدات کے بارے میں ردوبدل کو جائز کر لیں ان کے نزدیک ملک کی جغرافیائی سرحدات کا کیا تقدس رہ جاتا ہے۔ کشمیری قوم کس نظریئے کی بنیاد پر اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کرے کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ سکے؟ جو کوئی

بھی اس کا منصفانہ اور اخلاص مندانہ تجزیہ کرے گا وہ یقیناً کسی دوسرے نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔

اس جماعت سازی اور نظریات کے ردوبدل کے جرم میں کشمیری راہنما تنہا نہیں ہیں، حکومت پاکستان بھی برابر کی شریک ہے بلکہ اگر اس کو اس کا موجد قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ورنہ شاید اس قدر افراتفری کی نوبت نہ آتی، لیکن جب کسی خرابی کا آغاز ہو جائے تو پھر اس کو قابو میں رکھنا اور آخرالامر ختم کرنا تو بالکل ناممکن ہو جاتا ہے، اس کی ایک بڑی مثال ایک لبریشن لیگ کا وجود ہے۔ مرکزی حکومت کی کشمیر پالیسی میرے خیال میں کبھی بھی قومی امنگوں کی آئینہ دار نہیں تھی بلکہ قومی سیاسی تقاضوں کے مطابق نہیں تھی، نہ کسی کو اعتماد میں لیا گیا، یہ پالیسی صرف سرکاری ملازمین ہی ترتیب دے رہے ہیں۔ یہی ایک امر اس ملک میں ایسا ہے جس میں استحکام اور تسلسل رہا ہے۔ چنانچہ یہ پالیسی ایک عامیانہ اور پست درجے کی ملازمانہ رہی جس کا مقصد آزادی اور انقلاب کی ان قوتوں کو جو 1947ء میں ابھری تھیں، مربوط اور منظّم کرنے کے بجائے بتدریج فنا کرنا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا سبب جو بھی ہو، خواہ بھارت کے مقابلے میں احساس کمتری ہو، ذہنی شکست و پسپائی ہو، نااہلیت ہو یا بصیرت کا فقدان یا سیاسی قیادت کا بحران ہو لیکن اس پالیسی کا ماحاصل گھر کی شکست و ریخت کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔

اس پالیسی کا آغاز یکم جنوری 1949ء سے ہوگیا تھا جب کہ سیز فائز کے معاً بعد مجاہدین کشمیر کو فوجی تنظیم نو کے بہانے ایسی بے دردی کیساتھ تتر بتر کر دیا گیا کہ جس سے مجاہدین کے نہ صرف حوصلے پست ہوئے بلکہ ان کو یہ بھی شک ہو رہا تھا کہ جو کچھ انھوں نے پندرہ ماہ میں کیا آیا وہ درست بھی تھا یا نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی نے سوچ سمجھ کر اس طرح کیا ہوگا لیکن یہ بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔ ایک اور امر جو جذبہ جہاد کو سرد کرنے بلکہ خود اس مقدس ترین فریضہ کی اہمیت کم کرنے کا باعث ہوا وہ یہ کہ کچھ نیم فوجی اور کم تنخواہ پانے والے عارضی دستوں کا نام مجاہد فورس رکھا گیا، جو سولین لوگ اس خدمت پر مامور کیے جاتے تھے، ان کو

مجاہدین کا نام دیا گیا، حالانکہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ مجاہد کا لفظ کسی احترام کا تقاضا کرتا ہے۔ غرضیکہ ہمارا سارا نظام زندگی ایک طرح کی پسپائی اور فساد کی علامت بن کر رہ گیا ہے۔

مسلم کانفرنس کا لائحہ عمل:

چاہیئے تو یہ تھا کہ سیزفائر کے بعد جو وقت ہمیں میسر آیا ہے اس سے ہم بھرپور استفادہ کرتے، اپنی صفیں درست کرتے، وہ کمزوریاں دُور کرتے جو ہماری راہ میں حائل ہوسکتی ہیں یا دشمن ان سے استفادہ کرسکتا ہے مگر جو کچھ ہُوا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو اس کے بالکل برعکس ہے، اس سے خرابی کی توقع تو کی جا سکتی ہے مگر کوئی اچھائی متوقع نہیں ہے۔ یہ ہے وہ نقار خانہ جس میں مسلم کانفرنس کام کر رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس قدر مایوس کن صورت حال کے باوجود، یقیناً یہ ان عظیم شہیدوں کی پاک روحوں کا دخل ہے جنھوں نے مسلم کانفرنس کے سبز ہلالی پرچم کے سائے میں کشمیر کی آزادی کی خاطر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے اور ان ہی کی عظمت کے صدقے جماعت کے ساتھ لوگوں کا تعاون بڑھتا گیا اور سیاسی کارکن وقت کے تقاضوں کو تیزی کے ساتھ سمجھ رہے ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے تو یہ دوہرا چیلنج ہو گیا ہے، ایک سرحد کے اس پار اور دوسرا اپنے گھر میں۔

قراداد الحاق پاکستان:

کشمیر کی سیاست کا مرکز ومحور قائداعظم کا وہ جملہ ہے جو تاریخی تو بہر حال ہے لیکن اسے الہامی سمجھنے میں مضائقہ نہیں۔ قائداعظمؒ نے فرمایا ''کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے'' جس کو قائداعظمؒ کے ساتھ ادنیٰ سا تعلق بھی ہے اور جو اس عظیم شخصیت کی بصیرت پر کسی قسم کا اعتماد رکھتا ہے، اس کیلئے یہ جملہ اپنے تمام تر معنی ومفہوم میں کامل راہنمائی مہیا کرتا ہے۔ اب دیکھیئے کہ اس جملہ کو عملی صورت میں منتقل کرنے کیلئے کیا عمل کیا گیا ہے، کیا ہوسکتا تھا یا ہوسکتا ہے

اور وہ کون لوگ تھے جنھوں نے 19/جولائی 1947ء کو سرینگر میں اس جملے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے الحاق پاکستان کی قرارداد منظور کی، اس پر 48-1947ء میں پندرہ مہینے جہاد کیا گیا۔ لاکھوں عورتوں، مردوں اور بچوں نے اس پر پروانہ وار اپنی قیمتی جانیں نچھاور کیں اور لاکھوں کی تعداد نے گھر بار اور عزیز و اقارب کو خیر باد کہہ کر مہاجرت کی زندگی اختیار کی۔

بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ اس وقت مسلم کانفرنس نے یہ قرارداد پاس کر کے غلطی کی۔ چاہیئے تھا کہ وہ الحاق ہی کر دیتے۔ ماضی میں کیڑے مکوڑے نکالنے کی عادت کوئی نئی نہیں ہے۔ خود پاکستان کی تخلیق کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ کتنی آراء ہیں لیکن جس میں رتی برابر بھی انصاف ہو گا وہ اس قرارداد کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ کہنا کہ الحاق کر لینا چاہیئے تھا، ایسی بچگانہ بات ہے کہ اس کا کیا جواب دیا جائے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کہا جائے کہ نپولین کو چاہیئے تھا کہ وہ بیس منٹ پہلے اس پہاڑی پر چڑھ جاتا۔ تاریخ کے ساتھ مذاق کرنیوالوں کی کسی زمانے میں بھی کمی نہیں رہی ہے تاہم کچھ سال بعد یعنی 69-1968ء میں اسی مسلم کانفرنس نے اس الحاق پاکستان کی قرارداد کو حالات کے مطابق مزید واضح کرنے کیلئے ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کے زیادہ واضح اور بامقصد نعرے میں منتقل کیا، جس پر اس وقت بھی سواد اعظم کا ایمان ہے۔

''کشمیر بنے گا پاکستان''۔ ایک قومی نعرہ:

1970ء سے 1975ء تک مسلم کانفرنس کی حکومت نے اس نعرے کو سرکاری حیثیت دی اور وقت آیا کہ آزاد کشمیر میں ایک لاکھ سے زیادہ بچے اُٹھ کر منظّم طریقے سے یہ نعرہ لگاتے تھے، جس سے پہاڑوں اور جنگلوں کی شفاف فضاء گونج اُٹھتی تھی۔ قائداعظم کے تاریخی اشارات کے حوالے سے بھی دیکھا جائے تو ''کشمیر بنے گا پاکستان'' اور دوسرے نعروں کی حقیقت اور اہمیت کا پتہ لگانا زیادہ مشکل نہیں۔ اس تجزیہ کی رو سے یہ باقی نعرے اگر دلوں میں چھپے ہوئے کسی چور کی نشاندہی نہیں کرتے تو پھر بلاشبہ مایوسی اور تخریب کاری کی ایجاد ہیں

اور نتیجتاً اس ملت کے شیرازہ بکھیرنے پر لگے ہوئے ہیں۔ جتنی فکری اور جسمانی توانائیاں اس تخریب پر صرف ہو رہی ہیں، کاش وہ اس ملت کی یکجہتی اور تسلسل قائم رکھنے پر صرف ہوتیں۔ اس سے نہ صرف کشمیر کی آزادی میں مدد ملتی بلکہ خود کشمیریوں کی اپنی عزت میں بھی گراں قدر اضافہ ہوتا۔

نظریات و عقائد ہوں یا جماعتیں اور جماعت سازی، ہمارے ہاں سیاسی سوچ کا اپنا انداز ہے۔ ہمارے عوام کی سوچ تو اکثر و بیشتر صحیح سمت پر رہی ہے مگر جوں جوں تعلیم یا خواندگی نے ترقی کی، اس قدر انتشار کی راہیں کھلتی چلی گئیں۔ ہماری جماعتوں میں سوائے مسلم کانفرنس کے، اور اس کی بھی ایک تاریخی وجہ ہے، بعد میں بننے والی تمام جماعتوں میں قائدین کی سوچ وفکر ان کے ساتھ چلنے والے عوام کی سوچ میں بڑا اور نمایاں فرق ہے۔ مسلم کانفرنس کے علاوہ جس قدر سیاسی جماعتیں بنی ہیں، وہ سب کی سب بعد کی پیداوار ہیں بلکہ ابھی تک بنتی چلی جا رہی ہیں، یہ جماعتیں بنانے والے تقریباً تمام سیاسی کارکن یا راہنما مسلم کانفرنسی تھے۔ بعض نے تو جماعت بدل ڈالی یا جماعت بنا لی یا کسی دوسری جماعت میں شریک ہو گئے۔ بعض نے جماعت کے علاوہ نظریات بھی بدل ڈالے۔ جیسے ''لبریشن لیگ'' یا ایک حد تک ''پی پی''۔ ان کا جماعت بنانا تو سمجھ میں آ سکتا ہے، لیکن دوسروں نے جو اس جماعت سے علیحدگی اختیار کی، اس کی کوئی معقول توجیہ سمجھ میں آنا قدرے مشکل ہے۔ سیاسی مرتبے اور اقتدار کی خواہش کے سوا کوئی قومی و ملی وجہ تو ابھی تک معلوم نہیں ہوئی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ شخصیات کا تصادم ہو۔ یہ تصادم بھی ہمارے ہاں جماعت سازی کی ایک بڑی وجہ ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو مسلم لیگ ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوتی اور مسلم لیگ کے اولین راہنما ایک جگہ ہوتے تو نہ مشرقی پاکستان کا المیہ ہوتا نہ سیاست سے اس ملک کے استحکام کو اس قدر نا قابلِ تلافی نقصان پہنچتا۔ مگر غلام قوموں میں یہ شخصی تصادم ایک طرح سے ایک ناگزیر بیماری ہے جس سے آسانی سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ پھر ایسی قوم میں تو یہ مرض اور بھی زیادہ ہوتا ہے جس کو کسی حادثے

سے آزادی مل گئی ہو، مگر نہ اس نے آزادی کی قیمت ادا کی ہو یعنی اس کیلئے مطلوبہ قربانیاں دی ہوں نہ تربیت پائی ہو، نہ ہی آزادی کے بعد انھوں نے خود کو اس کا اہل بنایا ہو۔ قائداعظم کا وجود بھی میرے خیال میں ایک غیر معمولی اتفاقی امر ہے، ورنہ پاکستان بننے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

سیاسی شخصیات

سردار محمد ابراہیم خان:

اسی کے ساتھ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ چند سیاسی شخصیات اور ان کے بعض اہم کاموں کا بھی تجزیہ کروں تا کہ پوری بات سمجھنے میں مدد مل سکے۔ قابل ذکر سیاسی شخصیات کی تعداد جماعتوں کی طرح زیادہ نہیں ہے۔ خاص کر وہ اشخاص جو حکومت پر فائز رہے ہیں اور ابھی بقید حیات ہیں، میرے علاوہ تین ہی ہیں۔ سردار محمد ابراہیم خان جو تین مرتبہ صدر رہ چکے ہیں۔ میرے خیال میں یہ صرف ان کی ذات کیلئے ہی المیہ نہیں ہے بلکہ ان کی برادری کے لیے بھی اور مجموعی طور پر ہماری پوری سیاست کیلئے بھی۔ کیونکہ ایسی شخصیات نہ تو روز روز پیدا ہوتی ہیں اور نہ کوئی ان کو بنانے کی قدرت رکھتا ہے۔ برادری کا ذکر محض اس لیے آ گیا ہے کہ وہ ایک بڑی اور جری برادری ہے جو ماضی کی خدمات کے علاوہ کشمیر کی آزدای اور اسلام کیلئے بے پناہ خدمت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ مناسب قیادت کے بغیر تشنہ رہتی ہے۔

خورشید الحسن خورشید:

دوسری شخصیت محترم خورشید صاحب ہیں، ان کے ساتھ ہزاروں اختلاف ہوں لیکن ان کی بعض صلاحیتوں سے انکار نہیں ہوسکتا۔ وہ بھی ہماری قومی زندگی میں ایسے شخص ہیں، جو

روز روز پیدا نہیں ہوتے، نہ کوئی ادارہ ایسے افراد پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ ان کو کچھ لمحے قائداعظمؒ کی رفاقت میں گزارنے کا موقعہ بھی ملا ہے اور ایک ذہین شخص کی حیثیت سے انہوں نے پورے برصغیر کی سیاست کو آغاز ہی سے دیکھنا شروع کیا تھا۔ اس لیے ان کا دائرہ واقفیت بھی وسیع ہے، ذہن بھی ایسا ہے مگر بدقسمتی سے وہ سوچ وفکر کی کسی ایسی گھاٹی یا دلدل میں دھنس گئے ہیں کہ ان کی تمام صلاحیتیں کسی مثبت کام پر لگانے کی بجائے منفیت کا شکار ہو کر رہ گئی ہیں۔فکر کی بعض لغزشیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان میں زیادہ تر ذہین لوگ ہی پھنستے ہیں اور جو لوگ ان میں پھنس جاتے ہیں، ان کے مقابلہ میں کم ذہانت والے لوگ زندگی میں بہتر کام کر جاتے ہیں۔ ہماری اپنی سیاست میں اکثر کئی مثالیں ہیں۔

وبال جان ذہانت:

پھر ذہین لوگوں کا ایک المیہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر وہ یقین کی دولت سے محروم ہوں تو ذہانت وبال بن جاتی ہے کیونکہ ذہانت کی خوفناک گھاٹیوں سے نکلنے کا راستہ صرف اور صرف یقین ہی بتاتا ہے۔ میں اکثر کہتا رہتا ہوں پختہ یقین کے بغیر ذہانت، ہمارے پنجابی کے مشہور محاورے کے مطابق ''چوہڑیاں دا چھرا'' ہوتی ہے، جو دونوں حلال وحرام پر یکساں چلتا ہے بلکہ زیادہ تر حرام پر ہی چلتا ہے۔ یہ المیہ اس لیے بھی ہوتا ہے کہ ذہانت خود کسی نظم وضبط سے آشنا نہیں ہوتی بلکہ اسی سے بغاوت پر آمادہ رہتی ہے جب کہ نظم وضبط کے بغیر ذہانت اور عمل دونوں بے مقصد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ خواہ اس کے پیچھے کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو۔ قائداعظم جو نظم وضبت پر زور دیتے رہے تو یہی حقیقت ان کے پیشِ نظر تھی۔ خورشید صاحب کی اس کیفیت کا کچھ اندازہ ایک دو بنیادی باتوں سے ہو سکے گا۔

مسلم کانفرنس سے علیحدگی:

پہلی مرتبہ جب ان کے صدر بننے کا وقت آیا تو یہ میری ذاتی معلومات میں ہے کہ

صرف قائد ملت چوہدری غلام عباس صاحب مرحوم کی تائید وحمایت سے ہوا۔ لیکن صدر بننے کے بعد پہلا کام جو خورشید صاحب نے کیا وہ چوہدری صاحب کے مقابلہ میں بلکہ ملی مقاصد و مفادات کیلئے اور خود خورشید صاحب کے لیے بھی مضر تھا، پھر انھوں نے ایک وزیرِ خارجہ شیخ منظور قادر کے ساتھ ملکر مسلم کانفرنس کے مقابلہ میں جماعت ہی علیحدہ بنالی اور اس کا منشور بھی سرے سے مختلف طے کیا۔ یعنی اس میں الحاق پاکستان کی بجائے آزاد کشمیر کو الگ مکمل خودمختار مملکت تسلیم کروانے کا نعرہ دے دیا اور اس کے منطقی نتیجے کے طور پر مسلم کانفرنس کی بیخ کنی کرنے پر لگ گئے۔ وہ چونکہ صدر حکومت بھی تھے اور ان کو صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم اور ان کی حکومت کی تائید وحمایت بھی حاصل تھی اس لیے اس نعرے کو کافی حد تک پذیرائی ہوئی۔ اگر چوھدری صاحب مرحوم اس وقت زندہ نہ ہوتے تو الحاق پاکستان کا نظریہ عملاً دفن ہو جاتا اور پھر وہی ہوتا اور جلد ہوتا جو مشرقی پاکستان میں ہوا۔

محسن کشی اور نظریہ پاکستان کی مخالفت:

اس سے بڑھ کر خورشید صاحب نے یہ کیا کہ نظریہ الحاق پاکستان پر آخری ضرب لگانے کیلئے رئیس الاحرار چوہدری غلام عباس مرحوم کو ایبڈو ''EBDO'' کر دیا۔ یعنی سیاست کے لیے نااہل قرار دے دیا یہ اخلاقی، سیاسی اور شرافت ہر لحاظ سے اتنا ناقابل تلافی جرم ہے جس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ ہندوستان کی تاریخ نے بڑے بڑے جعفر و صادق پیدا کیے مگر وہ بھی اس فعل پر شاید حیرت زدہ ہوں۔ چوہدری غلام عباس مرحوم حکومت وغیرہ کی خواہش سے ہمیشہ بالاتر رہے ہیں۔ جس کا دوسرے دوستوں کے علاوہ میں بھی عینی شاہد ہوں۔ بلکہ ایک پیش کش تو خود میرے ذریعے بھی کی گئی تھی جس کو قائد ملت نے مسترد کر دیا تھا۔ جو شخص تحریک پاکستان، کشمیر کی آزادی اور الحاق پاکستان کا مظہر اور قائداعظم کا ایسا معتمد ہو کہ انھوں نے جو دو شخص اپنے جانشین نامزد کیے تھے۔ ان میں ایک نوجوان راہنما یہ بھی تھے۔ کسی بھی

حکومت کا ان کو سیاست سے نااہل قرار دینا اس ملک کے کس مفاد کے ساتھ وفاداری تھی یہ تاریخ ہی بتائے گی۔ یہ سب کچھ بالآخر کس مقصد کے لیے ہو رہا تھا، پاکستان اور اسکے مفادات کے ساتھ اس سے بڑا ظلم کیا ہوسکتا ہے؟ کشمیریوں کی تحریک آزادی کیلئے اس سے بڑی آفت کیا ہوسکتی ہے اور تحریک الحاق پاکستان کو اس سے زیادہ کیسے متاثر کیا جا سکتا ہے؟ پھر چوہدری صاحب کے ساتھ خورشید صاحب کی نسبت بھی اس قدر چھوٹی ہے کہ یہ فعل ویسے بھی بے حیائی اور ڈھٹائی کا شاہکار تھا۔ یہی نہیں خورشید صاحب نے کئی دوسرے محبّ وطن اور بااثر شخصیات کے علاوہ میرے خلاف بھی ایبڈو لگایا لیکن جج لطیف شاہ صاحب نے مجھے تمام الزامات سے بری قرار دیتے ہوئے حضرت علامہ کے اس شعر سے فیصلے کا آغاز کیا: ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مرد کوہستانی

مگر رئیس الاحرار کیلئے یہ کسی صورت ممکن نہیں تھا کہ وہ اس قسم کے اوچھے سیاسی ہتھکنڈے کو تسلیم کرتے اور خود کو اس عدالت کے سپرد کر دیتے اس لیے جج صاحب کو فیصلہ یک طرفہ کرنا پڑا۔ جب کہ ان کی بڑی خواہش تھی کہ وہ قائد ملت کے بارے میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے۔ اس سیاہ کاری میں ہماری سیاست کے بڑے نامور محبّ وطن اور مخلص حضرات کو رسوا کیا گیا۔ غور فرمائیے کہ ایک طرف بھارت کے ساتھ ہماری سرد جنگ ہر محاذ پر جاری ہے تو دوسری طرف ہم اپنے گھر میں قیامت برپا کرتے رہے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے اور ہم کس طرح فرض کر لیں کہ اس کا کوئی اثر تحریکِ آزادی اور الحاقِ پاکستان پر نہیں پڑے گا اور دشمن اس سے فائدہ نہیں اُٹھائے گا۔ ان واقعات کی روشنی میں اگر ہم اپنا جائزہ لیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ہم ابھی تک زندہ کیوں ہیں۔ اس لیے یہ یقین ہونا چاہیئے کہ مشیت ایزدی کا دست کرم ہماری تمام لغزشوں حماقتوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہماری حمایت کر رہا ہے۔

خورشید صاحب نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ میر واعظ کشمیر مولانا محمد یوسف صاحب کو عدالت میں پیش ہونے سے مستثنیٰ قرار دے کر ان کی برات کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا جو بظاہر ان کا اچھا کام تھا۔ میر واعظ مرحوم اس کے بالکل مستحق تھے کیونکہ وہ بھی ہماری چند ایسی نادر شخصیات میں تھے جن کا کوئی بدل نہیں مگر اس میں بھی دو باتیں مدنظر ہیں ایک تو یہ دیکھیئے کہ ان حضرات کے ساتھ خورشید صاحب کی کوئی نسبت ایسی نہ تھی، اگر میرواعظ اور چوہدری صاحب کے درمیان بات ہوئی ہوتی تو وہ سمجھ میں آ سکتی تھی لیکن خورشید صاحب اور ہم لوگ تو ابھی ان بزرگ حضرات کی جوتیاں سیدھی کرنے کے مرحلہ میں تھے ہم میں سے کسی کی بھی طرف سے ان کو نااہل قرار دینا یا اہل قرار دینا دونوں ہی اخلاقی اور سیاسی جرم ہیں۔

اس کے علاوہ جو لوگ کشمیر کی سیاست کے اندرون سے کماحقہ، واقف ہیں، وہی جان سکتے ہیں کہ یہ تفریق کیوں کی گئی اور اس کا صحیح پس منظر کیا تھا؟ یہی وہ علاقوں اور زبانوں کا بدترین تعصب ہے جو خورشید صاحب کی سیاست کی بنیاد ہے اور جو آگے چل کر علیحدہ قومیت پر جا پہنچتا ہے۔

یہ سیاہ واقعہ نہ صرف خورشید صاحب کے اندروں میں پوشیدہ مرض کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ یہ اس تعصب کی دلیل ہے جو دوسروں کو بھی مجبور کرنے کا طریقہ سکھاتا ہے۔ اس کے علاوہ خورشید صاحب کو حکومت پاکستان نے صریح اور واضح دھاندلی کے ذریعہ ووٹوں کی آخری گنتی کیے بغیر ہی صدر بنا دیا اور ان کے ساتھ ایک کونسل بھی قائم کی تو اس کونسل نے جو پہلی قرارداد پاس کی وہ ''خودمختار کشمیر'' کے لیے تھی اور بعد ازاں بھٹو صاحب کے دور میں انھوں نے نہ صرف اپنی پارٹی پی پی پی میں مدغم کر دی بلکہ مسلم کانفرنس کی جمہوری اور آئینی حکومت کو غیر جمہوری اور ناجائز طریقہ سے ختم کرنے کے اس بھونڈے ڈرامے میں ہیرو کا کردار ادا کیا اور پھر آزاد کشمیر میں جو ڈھونگ رچایا گیا جس کو بعد میں اعلیٰ سطح کے ٹربیونل نے بھی دھاندلی قرار دے دیا خورشید صاحب اس ڈرامے میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے بلکہ خود بھی

اسی انتخابات میں شریک ہو کر اسمبلی ممبر بن گئے۔

حکومت نے تو جو کیا سو کیا، مگر خورشید صاحب نے اپنے لیے جو طریقہ کار پسند کیا وہ غور طلب ہے۔ ان اقدامات سے خورشید صاحب کی سوچ کے بعض اندرونی گوشوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی آزادی پسندی، جمہوریت پسندی اور قائداعظمؒ اور ان کے پاکستان سے محبت اور عقیدے کی کیا بات ہے۔ ان واقعات کی جو بھی توجیہ کی جائے وہ ایک طفل تسلی کے سوا کچھ نہیں۔

سیاسی زندگی کا آغاز:

خورشید صاحب نے اپنی سیاست کا آغاز قائداعظمؒ کی خدمت میں کیا تھا۔ سرینگر سے وہ ان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ظاہر ہے کہ قائداعظمؒ اس وقت سے ہی کشمیر کے ساتھ مستقبل کے رشتہ کی بنیاد رکھنا چاہتے ہوں گے۔ ورنہ متحدہ ہندوستان میں کس صلاحیت اور قابلیت کی کمی تھی جو ان کو حاصل نہ ہوسکتی تھی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ چوہدری غلام عباس مرحوم نے ہی خورشید صاحب کو قائداعظم کے سپرد کیا تھا۔ تاہم یہ رفاقت کوئی سیاسی نوعیت کی نہیں تھی۔ قائداعظم کی وفات کے بعد محترمہ فاطمہ جناح نے بھی خورشید صاحب کی پوری دیکھ بھال کی۔ یہ تو خیر کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔

ایک اہم ''کارنامہ'':

کشمیری سیاست میں خورشید صاحب کا اولین کارنامہ یہ بتایا جاتا ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں۔ نہ یہ خدانخواستہ الزام تراشی ہے کہ جولائی 1947ء میں قائدملت چوہدری غلام عباس جب جیل میں تھے اور ریاست کی سیاست ایک آخری اور فیصلہ کن موڑ پر تھی۔ اس وقت خورشید صاحب نے قائداعظم کے لیٹر پیڈ پر چوہدری صاحب کے نام ایک خط لکھا جس کا مفہوم یہ بتایا جاتا ہے کہ مسلم کانفرنس کو چاہیئے کہ وہ ریاست کو خودمختار

رکھنے کی قراداد پاس کرے۔انُ نہی دنوں مسلم کانفرانس کی جنزل کونسل کا اجلاس بھی ہو رہا تھا وہ خط اگلے روز یعنی 18/جولائی کو مجلس عاملہ میں پیش ہوا اور اس کو قائداعظم کا آخری حکم سمجھ کر مجلس عاملہ نے اپنی سفارش کے ساتھ دوسرے روز 19/جولائی 1947ء کو جنرل کونسل میں پیش کیا۔مگر وہ کتنے صاحب بصیرت لوگ تھے ان میں سے کچھ ابھی بقید حیات ہیں کہ انھوں نے اس خط کو کلیتہً مسترد کر کے الحاق پاکستان کی تاریخی قرارداد پاس کر دی جو آگے چل کر اس جہاد آزادی کا سبب بنی جس کے نتیجہ میں بتیس ہزار مربع میل کا علاقہ مجاہدین نے آزاد کرا لیا جو شمالی علاقہ جات اور آزاد کشمیر پر مشتمل ہے، اور اسی قرارداد کی بنیاد پر پاکستان کو یہ حق ملا کہ وہ اپنی شہ رگ پر دعویٰ کر سکے ورنہ مہا راجہ نے بھارت کے ساتھ جو الحاق کیا تھا تو بات ختم ہو گئی تھی کیونکہ نیشنل کانفرنس اور شیخ محمد عبداللہ مرحوم بھی اس وقت اس الحاق کی حمایت میں تھے۔

ان باتوں کا ذکر دو وجہ سے کرنا پڑا ایک تو اس لیے کہ خورشید صاحب محترم کی سیاسی فکر کے بارے میں صحیح اندازہ ہو سکے کہ ان کی سوچ شروع سے ہی پاکستان کے ضمن میں کیسی تھی، ابتداء میں تو چلیئے عمر اور تجربے کا لحاظ بھی رکھا جانا چاہیئے، مگر بدقسمتی سے ان کی اس سوچ میں آج بھی وہی خرابی موجود ہے۔ اس پر نہ صرف وہ اصرار کرتے ہیں بلکہ اس زہر قاتل پر قائداعظم کے ساتھ اپنی رفاقت اور سیاسی تجربات کی مٹھاس چڑھا کر اس وقت ملت کو کھلانا چاہتے ہیں۔ اب وقت یہ آ گیا ہے کہ اچھی بات کو برا تو کہا جا سکتا ہے، بلکہ اس پر داد ملتی ہے لیکن بری بات کی نشاندہی کی جائے تو وہ شخص سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ بکرم الرجل مخافته شره۔ (آدمی کا احترام اس کے شر سے بچنے کے لیے کیا جاتا ہے)۔

بیرونِ ملک دورے اور ان کا اثر:

دوسری وجہ یہ ہے کہ خورشید صاحب محترم حال ہی میں امریکہ اور انگلینڈ کا دورہ کر کے واپس آئے ہیں۔ آتے ہی آزاد کشمیر کا دورہ کر رہے ہیں۔ دورہ کے دوران انھوں نے عام

جلسوں میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ ہر محبِّ وطن کے لیے لمحہ فکر یہ ہے۔ ایک المیہ تو وہ خیالات ہیں جن کا انھوں نے پوری بے باکی سے اظہار کیا تو دوسرا المیہ اخبارات میں شائع شدہ ان کی تقریروں کا مواد ہے۔ جلسوں میں انھوں نے جو زہر اگلا ہے، اخبارات میں بات اس کے بالکل برعکس چھپتی ہے تاکہ حقیقت پر پردہ رہے، تاہم آزاد کشمیر میں بالعموم اور دھیر کوٹ اور باغ کے تاریخی مقامات پر بالخصوص جو کچھ انھوں نے ارشاد فرمایا وہ قابل توجہ ہے۔ ایک عام آدمی تو یقین بھی نہیں کر سکتا کہ ہماری سیاسی صفوں میں ایسا بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ معلوم نہیں کہ بیرونِ ملک ان کے حالیہ دورے نے کسی مہمیز کا کام کیا ہے یا کوئی اور وجہ ہے۔ کیونکہ ماضی قریب میں ہمارے ایک اور معروف دانشور ایک عرصہ کے بعد امریکہ سے واپس آئے تو آتے ہی ریاست ہائے متحدہ پاکستان کی بات کرنا شروع کر دی۔

''ڈاکو، لٹیرے اور فراڈ'' کے شرمناک خطابات:

بہر حال دھیر کوٹ اور باغ کے جلسوں میں انھوں نے مسلم کانفرنس اور خاص طور پر سردار عبدالقیوم کو جو سنائیں تو وہ ان کو مبارک ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سیاست میں کافی ترقی کر لی ہے۔ لیکن قومی سطح کے معاملات میں جو کچھ فرمایا، وہ یہ ہے کہ 1948/1947 میں جو کچھ ہوا وہ جہاد نہیں تھا بلکہ وہ سب لوگ لٹیرے اور ڈاکو تھے۔ لاحول و لاقوۃ الا باللہ۔ یہی وہ زبان ہے جو ہندو حکومت ہمارے بارے میں اب تک استعمال کرتی رہی ہے۔ خواہ کشمیر کے مجاہدین ہوں یا ہمارے پٹھان بھائی ہوں۔ بھارتی حکمرانوں کا یہی موقف رہا ہے۔ لیکن کسی نیک بخت کو آزاد کشمیر میں ان تمام شہیدوں اور غازیوں کو ان الفاظ سے یاد کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔

خورشید صاحب کو خدا نے آزادی کی تحریک میں کسی بھی خدمت سے محروم رکھا اور اس جہاد میں بھی شرکت کی سعادت سے محروم رکھا۔ اس محرومی پر ندامت کی بجائے وہ اب ہم سب کو ڈاکو اور لٹیرے قرار دے رہے ہیں۔ انسانی قدروں کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ اللہ معاف

کرے، اور سیاسی مخالفت کا یہ عالم ہو رہا ہے کہ ان کے بازو میں بیٹھے ہوئے چند لوگ جن کو شاید جبراً ہی خدا نے اس جہاد میں شرکت کی سعادت دی تھی مزے سے اس سٹرٹیفکیٹ پر شاید خوش ہو رہے ہیں۔ اگر یہ سیاسی مخالفت کی بات نہ ہوتی تو اُنہی جلسوں میں کتنے ایسے لوگ بھی ہوں گے جو خود بھی جہاد میں شریک تھے یا ان کے بزرگ غازی یا شہید ہوئے ہوں گے۔ مگر اس مخالفت کی سیاہ پٹی نے ان کو بھی یہ توہین برداشت کرنے پر مجبور کیا۔ ہندو کی آنکھ سے اگر دیکھا جائے تو وہ جہاد واقعی کوئی اچھی بات نہیں تھی اور وہ وہی کہے گا جو کہتا ہے۔

مجھے ان حضرات کے اس جذبے سے یاد آیا کہ ہمارے علاقے سے جانے والے ایسے سینکڑوں ہندو اور سکھ ابھی زندہ ہوں گے جو آج ہمارے اس جہاد اور جذبے کی پاکیزگی کی قسم کھا سکتے ہیں لیکن دیکھئے کہ ہمارا ہی ایک سیاست دان ان شہیدوں، غازیوں اور مجاہدین کو کیا سٹرٹیفکیٹ دے رہا ہے۔ وہ سٹرٹیفکیٹ تو اپنی جگہ مگر اس پوری تحریک کی جو نفی مراد ہے جس نے پاکستان کیلئے بتیس ہزار مربع میل کا دفاعی علاقہ مہیا کیا ورنہ، بالکل درست کہا راجہ ظفر الحق نے کہ بھارتی لیڈروں کے پاکستان کو ختم کرنے کے منصوبے میں کوئی دوسری رکاوٹ نہ رہتی۔ مجاہدین کی اس تحریک سے یہ تکلیف آخر کیوں ہے اور یہ پہلی بار نہیں ہے کہ انھوں نے اس کی نفی کی بلکہ وہ اپنی صدارت کے دوران بھی ایک آدھ مرتبہ اسی طرح بلاواسطہ طور پر اس جہاد کی مخالفت کر چکے ہیں۔ جیسا کہ اس وقت ان کے ایک جلسہ کے بارے میں ہم نے سنا تھا۔ البتہ اس بار وہ ترجمانی کیلئے اپنے دل کی گہرائی سے صحیح الفاظ تلاش کر کے لائے ہیں۔

دوسری بات جو انھوں نے زور دے کر کہی وہ یہ تھی کہ 19/جولائی 1947ء کی جو الحاق پاکستان کی قرارداد ہے وہ فراڈ تھا، حماقت تھی اور اس کی اہمیت ایک ردی کے ٹکڑے کے برابر ہے۔ بلکہ چاہیئے تھا کہ نیشنل کانفرنس اور مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا جاتا۔ غور کیجئے کہ یہ کیسی سیاسی سوچ ہے۔ اس کا بنیادی نتیجہ تو اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ نہ وہ قرارداد ہوتی نہ وہ جہاد ہوتا اور نہ خدانخواستہ پاکستان ہوتا، اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ شاید کوئی

سیاسی افلاطون ہی کچھ بتا سکے۔ ہم لوگ تو یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اگر اس قوم کو اس دور میں پلوں اور سڑکوں کے دھوکے میں نہ پھنسایا گیا ہوتا اور ان کی اپنی اصل منزل انھیں یاد رہی ہوتی تو یقیناً اس سرزمین پر ایسی بات کرنا ناممکن ہوتا، پھر یہ باتیں اس وقت آزاد کشمیر میں کی جا رہی ہیں جس وقت بھارتی حکومت اپنے تمام وسائل اور تیاریوں کے ساتھ آزاد کشمیر اور اس کے ذریعے بالواسطہ پاکستان کی سلامتی اور بقاء پر ایک آخری وار کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

یارب العالمین! آپ ہی اس ملک کو جو آپ کے حبیب ﷺ کے نام پر معرض وجود میں آیا ہے، ان شازشوں سے نجات دلا سکتے ہیں۔ آمین!

خورشید صاحب کی صلاحیتیں اگر مثبت اور تعمیری فکر پر لگی رہتیں تو ہماری صفوں میں کتنا اتحاد ہوتا اور ہم لوگ مل کر اس ملت کی بھلائی کیلئے کیا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا کوئی غلطی نہ ہو گی کہ اگر سردار محمد ابراہیم خان صاحب کی سیاست بھی نظریاتی ہوتی اور خورشید صاحب اور چوہدری نورحسین صاحب بھی ساتھ ہوتے تو ہم لوگ مل کر نہ صرف کشمیر کیلئے بلکہ خود پاکستان کیلئے کتنی بلند پایہ خدمات انجام دے سکتے تھے۔ کشمیری مسلمان کیلئے اور آزادی کی اس تحریک کیلئے کتنا بلند مقام مل سکتا تھا اور خود کشمیر کی آزادی کی منزل بھی شاید چند قدم سے زیادہ نہ ہوتی۔

محمد حیات خان:

اس دور کی بدنصیبی کی علامت ہمارے تیسرے شخص جو حکومت پر فائز رہے ہیں، وہ بریگیڈیئر اب (ریٹائرڈ میجر جنرل محمد حیات خان صاحب) ہیں ان کا دورِ حکومت تو گویا تمام برائیوں کا تکملہ معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف ہم ہی سے بے قصور انتقام لیا بلکہ آزاد کشمیر کے عوام اور پاکستان کو بھی معاف نہیں کیا۔ اس کی تفصیلات پر علیحدہ دستاویز کی ضرورت ہے جو شاید کسی وقت مرتب ہو سکے۔ مگر مختصراً چند باتوں پر ہی اکتفا کرنا ہو گا۔

طوفان بدتمیزی:

محمد حیات خان کی حکومت تو ایک طوفان بدتمیزی تھا۔ انھوں نے پی پی والوں کو بھی معاملات میں مات کر دیا۔ ان کی حکومت کی چند باتیں ملاحظہ ہوں۔عوام کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کے ضمیر خریدے جاتے رہے۔ مسائل حل کرنے کی ایک بنیاد یہ تھی کہ لوگ مسلم کانفرنس چھوڑ دیں بلکہ جماعت کی مخالفت بھی کریں۔ اسی حکومت کے نزدیک سب سے پسندیدہ کام اور سب سے پسندیدہ شخص وہ سمجھا جاتا تھا اور اسے تمام سرکاری مراعات کا اولین مستحق سمجھا جاتا تھا جو سیاست دانوں کو بالعموم اور سردار محمد ابراہیم خان اور مجھے بالخصوص عام جلسوں میں برا بھلا کہتا رہا ہو۔ انھوں نے ایسے اشخاص کا ایک طرح کا سکوارڈ بنا رکھا تھا۔ تمام انتظامی مشینری ان لوگوں کے اشارہ ابرو کی منتظر رہتی تھی جو انتقامی کاروائیاں اس دور میں ہوئیں۔ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

تعمیراتی ترقی کا ڈھنڈورا:

اسی طرح تعمیر و ترقی کا وہ آج کل ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، اس کی بھی ایک طویل داستان ہے۔ انھوں نے تعمیر و ترقی کے نام پر جو قومی خزانہ برباد کیا ہے شاید کوئی وقت ایسا بھی آ جائے کہ اس کا حساب لیا جائے۔ وہ اپنی جگہ لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ پانچ سال حکومت کر چکنے اور تعمیر و ترقی کا بے پناہ چرچا کرنے کے باوجود حیات خان صاحب ابھی تک تعمیر و ترقی کے مفہوم سے نابلد ہیں۔ وہ اس میں اکیلے ہی نہیں ہیں، جو کچھ وہ کرتے رہے اسی سے اس امر کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی اہلیت کیا تھی اور ان کے پاس اس بارے میں علم کتنا تھا؟ البتہ انھوں نے مرکزی حکومت کو خوب مغالطے میں رکھا حتیٰ کہ ڈاکٹر محبوب الحق جیسا آدمی بھی آنکھیں ہی ملتا رہ گیا اور اسے توصیفی سند جاری کیے بغیر نہ بنی۔ حالانکہ اگر وہ ہمارے ساتھ بھی بات کرتے تو ہم لوگ ان کو بتاتے کہ حیات خان کی حکومت نے کس طرح تعمیر و ترقی کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا ہے اور اس طرح برباد کیا ہے کہ کروڑوں

روپیہ اب تو محض اس لیے چاہیئے کہ اس خرابی کو درست کیا جائے۔

صرف دو مثالوں پر غور کریں۔ رابطہ سڑکیں اس طرح بنوائیں کہ نہ ان کا سروے ہے نہ وہ مکمل ہیں، نہ کوئی ان کی دیکھ بھال کر رہا ہے اور یہ سڑکیں جو حیات خان صاحب کے ذاتی حکم یا اجازت سے نکالی گئیں ان کا اس وقت کم از کم ایک کروڑ روپیہ سے زائد بقایا ہے، کیونکہ نہ کوئی منصوبہ تھا نہ کوئی اجازت تھی۔ صرف پونچھ کے ضلع میں دوسرے محکموں کے بقایا جات چھوڑ کر محض اس ایک مد میں عوام کا پچاس لاکھ سے زیادہ روپیہ حکومت کے ذمہ ہے۔ کئی لوگوں نے قرض لیکر سڑکیں نکالیں اور کئی ایک نے سعودی عرب کی ساری کمائی اسی پر لگا دی۔ امید یہ تھی کہ ایک تو گاؤں تک سڑک آجائے گی دوسرے حکومت اپنے وعدے کے مطابق رقم بھی ادا کرے گی۔ کئی پراجیکٹ ڈیلر ایسے ہیں جنھوں نے مال مویشی بیچ کر مزدوروں کو پیسے ادا کیے۔ پھر دیکھئے کہ حیات صاحب نے اور کیا کیا۔ اگر رقم دس میل سڑک نکالنے کیلئے تھی تو صدر صاحب نے سو میل سڑکوں کی کھدائی کی اجازت دے دی اور وہی دس میل کی رقم تھوڑی کر کے محض لالچ کے طور پر جگہ جگہ تقسیم کر دی۔ ادھر پراپیگنڈا شروع کروا دیا کہ سو میل سڑکیں نکالی جا رہی ہیں۔ ادھر صدر پاکستان کو بتایا کہ دیکھئے جناب! آپ نے جو رقم دی تھی وہ اگرچہ دس میل کیلئے تھی مگر میں آپ کو ایک سو میل سڑکیں بنوا دوں گا۔ ظاہر ہے کہ صدر پاکستان کو اس سے زیادہ خوشی کیا ہوتی کہ اتنی قلیل رقم میں اتنا بڑا کام ہو جائے گا۔ چنانچہ محمد حیات خان صاحب ایک تیر سے کئی شکار کرتے رہے۔ لطف یہ ہے کہ اب جب کہ وہ کام سب ادھورے پڑے ہیں اور لوگ پوچھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا۔ کیا دھوکا ہوا ان کے حامی کہتے پھرتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔ یا تو موجودہ بلدیاتی اداروں نے رقم کاٹ لی ہے یا منصوبہ بند کر دیا ہے۔ اس طرح مسلم کانفرنس کے چیئرمینوں اور ممبروں کو بھی بدنام کرنے اور عوام کو ان سے بدظن کرنے کا کام بھی ساتھ ہو رہا ہے۔

بدترین سیاسی انتظام:

دوسری مثال یہ ہے کہ بجلی کا بہت چرچا تھا اور جیسا کہ ہم سنتے ہیں صدر پاکستان کو بھی رپورٹ دی جاتی تھی کہ اتنے سو گاؤں میں بجلی لگ گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر عملاً جو کچھ ہوا وہ اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر کہا گیا کہ فلاں دس گاؤں کو بجلی مل گئی ہے تو عملاً صرف اتنا ہوا کہ چھ سات گاؤں کے اوپر سے تاریں گزار کر کہا آخری گاؤں کو بجلی مل گئی ہے۔ ایسے ہی کئی گاؤں ہیں کہ فائلوں میں تو وہاں بجلی مکمل ہو گئی ہے مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان میں سے کئی ایک میں تو سرے سے ایک کھمبا بھی نہیں لگایا گیا۔ چنانچہ اس وقت ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف اسی ایک خاص شعبہ کی خامی کو درست کرنے کیلئے کم از کم ایک ارب روپیہ درکار ہے۔ پھر ستم ظریفی یہ کہ جس گاؤں میں کوئی مسلم کانفرنسی رہتا ہے وہاں ابھی تک بجلی نہیں لگی۔ اگر کسی ایسے گاؤں میں بجلی گئی ہے تو وہ بھی کسی مسلم کانفرنسی کی مخالفت میں لگوائی ہو گی یا بعض افسروں کی انصاف پسندی ہو گی مگر وہ بھی پردے میں، ورنہ اس افسر کی نوکری بچنا مشکل تھا۔ ان کی عمدہ فکر کا اندازہ اس سے لگایئے کہ میرے گاؤں سے کئی میل آگے تک بجلی لگائی گئی۔ لیکن بشمول میرے گاؤں کے کئی ایک کو ایک طرف چھوڑ دیا گیا حالانکہ یہ سب راستہ ہی میں تھے۔ بعد میں غالباً حکومت پاکستان نے کسی سے کہا کہ ایسی زیادتی نہ کرو۔ آگے سے پھر پیچھے کی طرف کھمبے لگوا کر میرے گھر تک بجلی لگوائی گئی جیسا کہ مجھے حیات خان صاحب سے ملاقات کرنے والے ایک وفد نے جو ہمارے قریب کے رہنے والے تھے بتایا کہ ملنے پر پہلی بات صدر صاحب نے یہ پوچھی ''کیا سردار عبدالقیوم کے گھر بجلی آ گئی ہے؟'' کسی نے کہا: ہاں! آ گئی ہے تو فرمانے لگے اس نے میری بجلی کیسے لے لی؟ ذرا غور کیجئے، یہ لفظ ''میری بجلی'' کتنا جامع اور معنی خیز ہے۔ یہ تھی وہ بلند و بالا فکر جو ہم پر پانچ سال مسلط رہی، بجلی کا گھپلا تو شہرہ آفاق ہے۔ اس میں بعض لوگ کروڑوں روپے کا غبن بیان کرتے ہیں مگر اخباری بیانات کے باوجود حکومت نے اس کی تحقیقات نہیں کی۔ اور نہ الزام لگانے

والوں ہی سے پوچھا اور اگر حکومت کے علم میں ہے تو پھر ہم سب کا خدا ہی حافظ ہے۔

منصوبہ بندی 75-1971ء کے دوران چونکہ پہلی مرتبہ مسلم کانفرنس کی حکومت نے کی تھی اس لیے اس کو تہس نہس کر دیا گیا۔ اس منصوبہ بندی میں تقریباً ہر شعبے کیلئے کچھ ہدف اور طریق کار متعین تھا جو قومی نوعیت کا تھا لیکن اس کو اس طرح بدل ڈالا گیا کہ کوئی چیز بھی ایک نظم میں باقی نہ رہی۔ اب ترجیحات کا معیار قومی ضرورت کی بجائے مسلم کانفرنس کی مخالفت اور ذاتی پسند و ناپسند رکھا گیا، جس کسی کو ادنیٰ سا شعور بھی ہے وہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ ایسی پالیسی پر جو منصوبہ بندی ہو گی اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ اس کیلئے لفظ منصوبہ بندی کا اطلاق ہی بے محل ہے۔ ہمارے ہاں پہاڑی میں ایک مثل مشہور ہے کہ ''چوری کے کپڑے ڈانگوں کے گز'' چوری کے کپڑے تو سب سمجھتے ہیں۔ ڈانگ ہمارے ہاں دو تین گز لمبے ڈنڈے کو کہتے ہیں جو لڑائی جھگڑے میں لوگ استعمال کرتے ہیں۔ پیسہ حکومت پاکستان کا تھا، اس لیے کسی کی کیا ذمہ داری تھی کہ اس کا مصرف صحیح ہو۔ بدقسمتی سے یہ معاملہ صرف آزاد کشمیر کا ہی نہیں ہے بلکہ پورے ملک میں یہی صورت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو آج ہم اس قدر مقروض نہ ہوتے۔

تعمیراتی منصوبوں کی اصلیت:

اس افراتفری اور تباہی سے ایک نقصان تو یہ ہوا کہ کروڑوں روپیہ برباد ہو گیا۔ البتہ پروپیگنڈہ خوب در خوب ہوا کہ آزاد کشمیر اب تو جنت بن گیا ہے۔ پھر ایسے نہایت ادنیٰ منصوبوں کی رسم افتتاح کیلئے جن کی لاگت چند سینکڑے ہو گی، ہزاروں روپے سفر خرچ، پٹرول اور استقبالیوں پر صرف کیے گئے۔ یہ افتتاح اور تختی لگانے کا شوق اس جنون کی حد تک پہنچا کہ نچلے ملازمین کے بھی وارے نیارے ہو گئے دیکھیئے کیا ہوا، فرضی منصوبے کے محل وقوع کی فوٹو بھی نوائے وقت نے شائع کی تھی۔ اس جنون کا اندازہ لگایئے، آج بھی کئی مقامات پر وہ آویزاں تختیاں اس دور کا ماتم کر رہی ہیں۔ تختی تو ہے مگر وہ منصوبہ موجود نہیں۔ اسی طرح جنرل جمال دار خان ہمارے وزیر امور کشمیر بنے تو ان کے نام کی ایک تختی بھی لگوانی ضروری

تھی۔ چنانچہ ان سے بھی ایک پل کا افتتاح کروایا گیا جس کا افتتاح چند سال قبل میں خود بحیثیت صدر کر چکا تھا۔

حکومت پاکستان کیوں نہ خوش ہوتی اور صد آفرین کہتی جب کہ انھوں نے جس قدر رقم دی تھی ''افتتاح'' کے حساب سے حیات خان صاحب اس رقم سے کئی گنا زیادہ کام کر کے دکھا رہے تھے۔ جب کہ باقی ملک میں بے چارے لوگ اس رقم کے مطابق بھی کام نہ کر سکتے تھے۔مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان اس سے کیسے بے خبر رہی تو جواب وہی ہے کہ جب مخالفت دشمنی بن جائے تو مخالف کی ہر بات کے الٹ ہی کو درست سمجھا جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا سرٹیفکیٹ یہ تھا کہ ہم لوگ چونکہ حیات خان صاحب کی مخالفت کر رہے تھے اس لیے کسی تحقیقات کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔

منصوبہ بندی کو اس بری طرح پامال کرنے سے ایک دوسرا نقصان یہ ہوا کہ جس قدر سرمایہ لگا کر یہ ''ترقی'' کی گئی ہے اب اس سے کئی گنا رقم چاہیئے کہ محض ان خامیوں کو دور کیا جا سکے، ورنہ آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے۔سعودی عرب میں تو ایسا ہوتا ہے اور وہ سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن یہ غریب ملک ہے اور قرض لیکر گزارہ کر رہا ہے۔ اس میں اس قدر مجرمانہ عیاشی کا کیا جواز ہے؟ ہم تو قیامت تک صرف سود ہی نہیں ادا کر سکتے۔مگر یہ تو گویا ہمارے حکمرانوں کی ذمہ داری ہے ہی نہیں۔

اس کا ایک تیسرا اور ناقابل تلافی قومی نقصان یہ ہوا کہ آزاد کشمیر کے بہادر اور جنگجو عوام کے دلوں میں آزادی اور خوداعتمادی کا جذبہ اگر ختم نہیں ہوا تو سرد ضرور پڑ گیا۔ جھوٹے منصوبے اور جھوٹے وعدے اس قدر ہوئے کہ اب اگر کسی کا کام ہو بھی جائے تب بھی اس کو شک ہوتا ہے کہ اس میں بھی کوئی دغا نہ ہو۔ اس پسند و ناپسند کی ترقی و تعمیر کی وجہ سے گاؤں گاؤں اور گھر گھر میں فساد اور مخالفت محض طبعی امر ہے، فلاں کو بجلی کیوں ملی اور فلاں کو کیوں نہیں ملی کا سوال ہر جگہ موجود ہے اور اس کا کوئی ایسا جواب نہیں ہے جو تسلی بخش ہو۔

ہماری حکومت کی منصوبہ بندی کے طریقہ کار کی بنیاد تو ایسی تھی کہ کسی کو کسی سے شکایت کا موقع نہ ملتا۔ کیونکہ ہر ایک کو یقین کے ساتھ علم ہوتا ہے کہ ان کے گاؤں میں کس مہینے اور کس ہفتے بجلی لگوائی جائے گی اور کونسا سکول کس وقت ترقی کرے گا اور کون سی سڑک کب تعمیر ہو گی۔ کسی کو کسی پر شک ہوتا نہ شکایت۔ لیکن اس واہی تباہی میں کسی چیز کا کوئی معیار نہیں رہا، پھر اس سے جو اخلاقی پستی پیدا ہوئی وہ بجائے خود ایک قیامت ہے۔ روپے پیسے کا خرد برد ہوا ہو گا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ سب کچھ ایک تو نااہلیت سے ہوا، دوسرے یہ کہ اس تمام کارروائی کا مقصد بھی ترقی وتعمیر ہرگز نہیں تھا، بلکہ کسی طرح قوم کی توجہ سیاست اور سیاست دانوں سے ہٹا کر بالکل دوسری جانب لگانا تھا۔ یہ بھی ایک فطری امر ہے جس سے اکثر لوگ بے خبر ہیں کہ خدمت کے عمل کے پیچھے اگر جذبہ خدمت نہ ہو تو وہ خدمت نہ صرف اکارت جاتی ہے بلکہ بلائے جان بن جاتی ہے۔ لوگوں پر جلد ہی واضح ہو جاتا ہے کہ اس خدمت سے ان کی بھلائی مقصود نہیں تھی بلکہ وہ تو محض رشوت تھی، اس لیے ان کے دل سے اس خدمت کا اثر اٹھ جاتا ہے۔ ورنہ پروپیگنڈا کے مطابق آزاد کشمیر میں محمد حیات خان صاحب نے جتنا کام کیا ہے اس حساب سے تو آج ہمارے ساتھ کوئی بھی نہ ہوتا۔ میں نے بھی خدمت کی مگر چونکہ اس میں نیت درست تھی اس لیے تھوڑی خدمت کی بہت پذیرائی ہوئی اور اس کا اعتراف نسبتاً زیادہ کیا گیا۔ ویسے بھی مذہباً ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ جو شخص محض مخلوق کی خوشنودی کیلئے کام کرے گا، مخلوق تو اس سے کبھی خوش نہ ہو گی، البتہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی ضرور ہو گی۔ کیونکہ دل تو اس پروردگار کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ ہم نے تو انہیں چند سالوں میں اس کا بڑا مظاہرہ دیکھا ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو یہ اور بات ہے۔

انتظامیہ کی زبوں حالی:

یہ بد اعتمادی جس کا اس وقت پوری قوم شکار ہے اس کی ایک دوسری وجہ بد انتظامی بھی ہے۔ یہ مسئلہ صرف آزاد کشمیر میں ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں ایک وباء بنا ہوا ہے۔ ہر

نئی حکومت کی انتظامیہ کو کسی ڈھب پر چلانے کا مقصد قومی ضروریات نہیں اور نہ ملک کو ایک صاف ستھری انتظامیہ دینا مقصود ہوتا ہے بلکہ اس پورے نظام کو حکمران کی شخصیت کے گرد گھمانے کی خواہش ہوتی ہے جس کا فطری اور طبعی طریقہ بہت معروف ہے کہ انتظامیہ میں اطمینان نہ ہو، وہ بے یقینی کا شکار ہو اور انتظامیہ کے لوگ اپنے آپ کو محض ایک فرد کے رحم و کرم پر سمجھیں۔ ہمارے پورے ملک میں جو خرابیاں اس وقت ہیں، خواہ وہ معاشی ہوں یا اخلاقی یا کسی دوسری نوعیت کی، ان کی سب سے بڑی وجہ انتظامیہ کی یہی حالت ہے۔ یہ موضوع بجائے خود بڑا طویل ہے تاہم حیات خان صاحب کا دور حکومت اس بدنظمی کا بھی شکار ہے۔ سرکاری ملازمین کو نہ صرف اس آئینی ضمانت سے محروم کر دیا گیا ہے جو مسلم کانفرنس کی حکومت نے پہلی بار مہیا کی بلکہ سرکاری ملازمین کو ذاتی ملازمین بنا دیا گیا۔

حیات خان کو گئے اب کچھ عرصہ ہو گیا ہے مگر ملازمین نے اپنی عادات ابھی تک نہیں بدلیں۔ وہ ابھی تک بدستور مسلم کانفرنس کے خلاف شب و روز کام کر رہے ہیں اور حیات خان صاحب کے ساتھ ان کا باقاعدہ رابطہ ہے۔ دوسری طرف حیات خان صاحب اس سے پورا استفادہ کرتے ہیں اور اس پر پردہ ڈالنے کیلئے موجودہ حکومت کو بلیک میل کر رہے ہیں کہ یہ حکومت مسلم کانفرنس کا ساتھ دے رہی ہے۔ تنخواہ سرکاری لے کر سیاست کرنے کا چسکا پڑ جائے تو پھر یہ کافر منہ سے لگی ہوئی کب آسانی سے چھوٹ سکتی ہے۔ ویسے تو سرکاری ملازمین کو ان صلاحیتوں اور ذمہ داریوں سے محروم کرنے کا اصل کام پی پی کی حکومت میں باقاعدہ سوچ سمجھ کر شروع کیا گیا تھا مگر حیات خان صاحب نے اس کو صحیح طور پر مکمل کیا۔ انتظامیہ کا جو معیار مسلم کانفرنس نے قائم کیا تھا، اس وقت تو ملک بھر میں اس کی مثال دی جاتی ہے مگر اب صورت حال پہلے مقام پر آ گئی ہے کہ کوئی کل پرزہ درست نہیں رہا۔ میرے خیال میں اگر باقی سب کچھ فی الواقع بہت اچھا بھی ہو لیکن انتظامیہ اچھی نہ ہو تو باقی سب بیکار محض ہو کر رہ جاتا ہے اور اگر انتظامیہ بہتر ہو تو تنگی کے حالات میں بھی اس ملک کے لوگ خوش حالی کی

زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اس لیے جو حکمران انتظامیہ کو درست نہ کر سکتا ہو بلکہ اس کو مزید خراب کرتا ہو تو گویا اس نے پورے نظام زندگی کو ہی برباد کر دیا۔

مسلم کانفرنس کا دورِ حکومت:

اس کے بعد پھر ہم لوگ ہیں جن کو حکومت کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں براہ راست انتخابات کے ذریعے صدر بنا اور ساڑھے چار سال صدر رہا۔ اس عرصہ میں جو کچھ ہم سے نہیں ہو سکا وہ بھی اگرچہ کافی ہے لیکن جو کچھ ہم نے کیا ہے وہ سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے، اس کی تفصیلات بھی ایک علیحدہ کتاب کا تقاضا کرتی ہیں۔ ہم کوشش تو کریں گے کہ وہ یاد تازہ کرنے کی خاطر ان تمام بنیادی کاموں کو یکجا کر کے مشتہر کر دیا جائے تاہم یہاں اجمالی طور پر چند باتوں کا ذکر کرنا مناسب ہو گا۔

اصلاح احوال اور سیاسی رواداری:

میں نے بہت واضح اکثریت سے کامیاب ہو جانے کے باوجود اپنے دونوں قریبی حریفوں کیساتھ مفاہمت کرنے کی کوشش کی مگر بات صرف سردار محمد ابراہیم خان صاحب کے ساتھ ہی ہوسکی۔ خورشید صاحب سے کسی نہ کسی وجہ سے کوشش کے باوجود بات نہ ہوسکی۔ لیکن یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ان کی یا ان کی پارٹی کے خلاف کسی قسم کی کوئی بھی کاروائی کی ہو، باوجودیکہ انھوں نے اپنے دور حکومت میں آزاد کشمیر کے ریسٹ ہاؤسوں میں بھی ہمارے رہنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ لیکن میں نے ان کی عزت و احترام میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔

نظریہ الحاق پاکستان:

اس کے علاوہ نظریہ الحاق پاکستان کو پہلی بار آئین میں ایک ترمیم کے ذریعے تحفظ

دیا گیا اور تمام ملازمین کیلئے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ نظریہ الحاق پاکستان پر حلف اُٹھائیں۔ تعلیمی اداروں میں ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کا نعرہ بطور خاص روزمرہ کے معمول میں شامل کیا گیا بلکہ اس کو پولیس کی پریڈ کا حصہ بھی بنایا گیا۔ آج جب ہم اپنے حال کو دیکھتے ہیں تو یہ امر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگر نعرہ اس وقت شروع نہ کیا گیا ہوتا تو آج ہماری جواں سال نسل ایک بے مقصد اور آوارہ منزل قافلے کے سوا کچھ نہ ہوتی بلکہ اس سے بھی بدتر اور تخریبی نعرہ بازی میں سبقت لے جانے کی کوشش میں ہوتی۔ بعض دانشوروں کا اندازہ یہی تھا کہ ہمارے مستقبل کا کوئی تعلق ہمارے ماضی کے ساتھ نہ ہوگا مگر یہ صرف اس نعرے کی برکت ہے کہ آج ہمارا ماضی، حال اور مستقبل ایک تسلسل کے رشتہ میں بندھا ہوا ہے۔ ہماری نئی نسل کو اپنے شاندار ماضی اور ماضی کے بے مثال ورثے سے محروم کرنے کے جو سازشیں کی جا رہی ہیں وہ اگر کامیاب نہیں ہو رہی ہیں تو وہ بھی اسی بروقت اقدام کا نتیجہ ہے۔ اس نعرے کی افادیت کا احساس روز بروز بڑھ رہا ہے۔ یہ نعرہ لگانے والوں کا اپنا مستقبل یقینی دکھائی دیتا ہے بلکہ خود کشمیر کی آزادی کی منزل بھی اسی راستہ میں دکھائی دیتی ہے۔

بنیادی انسانی حقوق:

اسکے علاوہ آزاد کشمیر کے لوگوں کو پہلی مرتبہ قانوناً بنیادی حقوق مہیا کیے گئے۔ ہائی کورٹ کے اختیارات بڑھا دیئے گئے اور سپریم کورٹ قائم کی گئی۔ آزاد کشمیر کے سیاسی ڈھانچہ کو جو اس وقت میونسپلٹی سے بھی کم تر درجے پر تھا، اٹھا کر ایک صحیح حکومت بنایا۔ آزاد کشمیر کے ملازمین کا درجہ جو کسی زمرے میں نہیں تھا، اس کو بڑھا کر ملک کے دوسرے حصوں کے برابر کیا جس سے وہ احساس کمتری اور محرومی بھی دور ہو گیا جو ایک طویل عرصے سے پھیلا ہوا تھا اور اس وقت تقریباً اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ آج تو چونکہ فضا بالکل دوسری ہے اسلیے وہ وقت کسی کو یاد نہ ہوگا لیکن مجھے آج بھی اس کے خدوخال صاف دکھائی دیتے ہیں۔ مجھ سے قبل کے صدور صاحبان نے اس پر کیوں توجہ نہ دی، اس کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آ سکتی بعض نے تو اس پر

اکتفا کیا ہوگا کہ وہ صاحب خود جو صدر ہو گئے ہیں تو یہ بات سب کیلئے کافی ہے اور بعض نے شاید اس خیال سے اس پر توجہ نہ دی ہو کہ اچھا ہے اس طرح تلخیوں، بدگمانیوں اور مایوسی کی فضاء میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا رہے گا اور پھر تخریب کاری کیلئے زمین خوب ہموار ہو جائے گی۔

چنانچہ جس وقت میں صدر بنا تو ملازمین کی اکثریت میری مخالف تھی اور دن بھر دفتروں میں بیٹھ کر اپنے احساس محرومی کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ اس کی کئی تاویلیں کرتے تھے، بالآخر سب کا خیال تھا کہ یہ غیر مساویانہ تفریق اور محرومی صرف اس وجہ سے ہے کہ مسلم کانفرنس الحاق پاکستان کا نعرہ لگا رہی ہے ورنہ سب کچھ درست ہو جاتا، یہی حال آزاد کشمیر کی فوج کا تھا۔ سول ملازمین کی طرح ان کی تنخواہیں اور پنشن بھی ملک کے باقی حصوں کی نسبت نصف کے قریب تھی یا اس سے بھی کم۔ اس سے جو احساس محرومی اور اس کا ردعمل ہو رہا ہے، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہ ہوگا۔ فوج کا معاملہ تو خدا کرے یحییٰ خان نے حل کر دیا اور اس کا معاملہ میرے حکم سے یکبارگی طے پایا گیا۔

جو لوگ اس قسم کے حالات میں شکار کرنا چاہتے تھے ان کو تو میرے وجود سے ضرور تکلیف ہونا چاہیئے۔ چنانچہ وہ تفریق مٹا دی گئی تو نفرت، اختلاف اور محرومی کا وہ طوفان خود بخود چھٹ گیا اور انتظامی مشینری کے اندر نہ صرف تخریب کاری کے امکانات ختم ہو گئے بلکہ تعمیری فکر بیدار ہوئی اور اتحاد و یک جہتی کی فضاء پیدا ہوئی۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کسی بھی ملک میں کوئی تخریب کاری اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی نہ پھلتی پھولتی ہے، جب تک وہ انتظامیہ میں موجود نہ ہو یا اسے انتظامیہ کی پشت پناہی حاصل نہ ہو۔ چنانچہ مسلم کانفرنس کی حکومت کے اسی ایک کام کو اگر حب الوطنی کے جذبے اور بصیرت سے دیکھیں تو یہ کارنامہ ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

تعمیراتی منصوبہ بندی:

آزاد کشمیر میں پہلی مرتبہ تعمیر و ترقی کا محکمہ قائم کیا گیا۔ باقاعدہ اور بامقصد منصوبہ

بندی کی گئی جس کا ہم سے پہلے کوئی تصور تھا نہ اب ہے۔ زمین کا لگان (مالیہ) معاف کیا گیا اور کئی عوامی مراعات نافذ کی گئیں۔ ایم اے تک تعلیم مفت کی۔ دفتری زبان کو انگریزی سے بدل کر قومی زبان اردو کو رائج کیا۔ اتوار کی تعطیل کی بجائے جمعہ کی تعطیل کی رسم ہم نے شروع کی۔ فرنگی لباس کو بدل کر قومی لباس شلوار قمیض کو اپنایا۔ جنگلات کے چالیس ہزار مقدمات کا خاتمہ کیا۔ عدالتوں میں قاضیوں کے تقرر کے علاوہ سکولوں میں قاریوں کی بھرتی کی گئی تا کہ ہر مسلمان بچہ کم از کم ناظرہ قرآن کریم تو پڑھ سکے۔ پہلی بار آزاد کشمیر میں یونیسف کو متعارف کروا کر دیہی علاقوں کیلئے آب نوشی اور آب پاشی کے علاوہ تعلیمی درسگاہوں میں طلباء کیلئے خوراک اور کپڑے کی سہولت مہیا کرنے کا پروگرام بنایا۔ پہلی مرتبہ ورلڈ فوڈ والوں کے ساتھ رابطہ پیدا کیا گیا اور ایک سال میں کوئی ایک سو میل کے قریب سڑکیں ان کی مدد سے بنوائیں۔ آج اس کا احساس نہیں ہوسکتا، مگر اس وقت کسی بھی بین الاقوامی ادارے کے ساتھ آزاد کشمیر کی حکومت رابطہ نہیں قائم کر سکتی تھی۔ آزاد کشمیر میں روزگار مہیا کرنے کیلئے کارخانوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ آزاد کشمیر اسمبلی کیلئے باوقار بلڈنگ اور اسمبلی ہاسٹل کی تعمیر شروع کروائی گئی۔ اس طرح بے شمار دوسری اصلاحات کے علاوہ صد سالہ قادیانیوں کا فتنہ ختم کیا گیا۔ ماضی کی حکومتوں کے ذمہ ٹھیکیداروں کے لاکھوں روپے کے واجبات کی ادائیگی کی گئی، سیاست میں تعمیر و ترقی کے علاوہ ہمارے سوا ابھی کوئی نہیں ہے جس نے چور دروازے سے حکومت لینے سے بار بار انکار کیا اور کوئی سودے بازی نہ کی ہو۔ اصولوں پر کبھی بھی کوئی مفاہمت یا سودے بازی نہیں کی اور سیاست کا معیار جو کہ بانی جماعت نے مقرر کیا تھا، خدا کے فضل سے ابھی تک اس پر کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ یہ بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ کسی کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی نہیں کی۔ ہماری سوچ اور فکر کی بنیادوں اور کئی کوششوں سے واقفیت کیلئے یہ امور یقیناً کفایت کریں گے۔

حکومت آزاد کشمیر کی اہمیت

قانونی حیثیت:

آزاد کشمیر کی مختلف حکومتوں کا ذکر آ گیا تو ان ایک دو اصولی باتوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو اس ملک و ملت کے مفادات کے پیش نظر بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ اسطرح ہے کہ آزاد کشمیر کی حکومت کا ایک وجود تو وہ ہے جو ظاہراً دکھائی دیتا ہے۔ اس کا ایک اپنا آئینی ڈھانچہ ہے، ایک تشخص ہے اور ایک حدود اربعہ ہے۔ لیکن اس حکومت کا ایک وجود اور بھی ہے جو ان ظاہری خدوخال کے پیچھے ہے۔ یہی مقام ہے جہاں پر اکثر لوگ ٹھوکر کھاتے ہیں، آزاد کشمیر کو اس ظاہری مقام پر قیاس کیا جائے تو ایسا معلوم ہو گا کہ اتنے بڑے انتظام کی ضرورت کیا ہے مگر جس شخص کی نگاہ اصل حیثیت پر ہو گی اس کا خیال مختلف ہو گا مسلم کانفرنس کی حکومت کی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ وہ اس امر مبہم کا بھی پوری طرح لحاظ رکھے، اور جو شخص بھی ہمارے ساتھ انصاف کرے گا وہ یقیناً تسلیم کرے گا کہ صرف یہی حکومت جو میری سربراہی میں قائم ہوئی وہ واحد حکومت ہے جس نے نہایت التزام کے ساتھ اس حیثیت کے باریک سے باریک گوشے کا بھی خیال رکھا۔

وہ باریک گوشے کیا ہیں ایک مثال پر غور کیجیئے۔ آزاد کشمیر کی حکومت کا سارا نظام مرکزی حکومت کی امداد و اعانت کے ساتھ چل رہا ہے اس لیے آزاد کشمیر کی ہر حکومت کو مرکز کے ساتھ ایک خاص رابطہ رکھنا ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ یہ رابطہ کوئی خاص قواعد وضوابط کی حدود میں متعین نہیں ہے۔ کئی باتیں ہیں جو غیر تحریری قانون (UN WRITTEN LAW) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یوں تو ہر جگہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ تعلقات کا جو حصہ ضبط تحریر میں ہے، اس سے وہ حصہ بڑا ہے جو ضبط تحریر میں نہیں ہے ایسی حالت میں اس امر کا قومی امکان رہتا ہے کہ دونوں میں سے کوئی فریق تجاوز یا زیادتی کر سکتا ہے اور یہ روزمرہ ہوتا بھی رہتا ہے۔ وہ

خط و کتابت جو میرے اور بھٹو صاحب کے مابین ہوتی رہی وہ اس امر کی بہت واضح نشاندہی کرتی ہے۔

صورت حال کی نزاکت:

کہنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ ایسی حالت میں آزاد کشمیر کی حکومت کی حیثیت بے حد نازک ہو جاتی ہے۔ اگر مرکزی حکومت کے بعض نا۸پسندیدہ اقدامات کا ردعمل ہو، تب قومی مفادات متاثر ہوتے ہیں اور اگر خاموشی اختیار کی جائے تو اس سے بتدریج خراب نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ ہم کیا کرتے ہیں، اس نازک اور حساس موقع پر میں نے دیکھا ہے کہ آزاد کشمیر کی حکومت کے سربراہوں کا عمل تقریباً دو قسم کا رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ خاموشی اختیار کی گئی جس کی اپنی کچھ وجوہات ہوسکتی ہیں مگر اس خاموشی کا اثر بھی بوجوہ بے حد مضر ثابت ہوا۔ دوسرے یہ کہ ہر خرابی کیلئے صاف طور پر یا اندرونِ خانہ سرگوشیوں میں سازش کے طور پر یا اپنی بے بسی کے مداوا کے طور پر یا اپنی نااہلیت پر پردہ ڈالنے کے لیے یا اس سے بھی زیادہ کسی بدنیتی کے باعث کہا جاتا رہا ہے کہ جناب ہم کیا کریں، یہ سب حکومت پاکستان کر رہی ہے۔ بظاہر تو یہ کچھ غلط بھی نہیں ہے بلکہ ایک بہت معصومانہ وضاحتی امر ہے۔ لیکن اس کے نتائج و عواقب پر ذرا غور فرمائیے۔ صدر آزاد کشمیر کا لوگوں سے یہ کہنا کی یہ سب حکومت پاکستان کا قصور ہے، صرف ذمہ داریوں کے بدلنے تک ہی نہیں رہتا بلکہ اس کا اثر پاکستان کے ساتھ کشمیریوں کے تعلقات اور پھر براہِ راست نظریہ الحاق پاکستان پر مرتب ہوتا ہے جس کا ہم کافی تجربہ کر چکے ہیں۔ آج بھی ہمارے بعض لوگ جو الحاق پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں، انہی باتوں کو بطور دلیل یا جواز پیش کرتے ہیں۔ غور فرمائیے کہ کتنی معمولی بات کا اثر کتنا زہریلا اور گہرا ہو جاتا ہے۔ آزاد کشمیر حکومت کی ذمہ داریوں میں یہ وہ غیر تحریری ذمہ داری ہے جو دوسری تمام ذمہ داریوں سے بڑھ کر ہے اور اگر کوئی حکومت قومی مفاد کے ان باریک گوشوں کا خیال نہیں رکھتی تو وہ مار آستین ہے۔ اس کی باقی تمام کارکردگی اگر کچھ ہو تو وہ محض دھوکہ ہے،

سراب ہے۔

مرکزی حکومت پر تنقید اور اس کے اثرات:

چنانچہ اس نقطہ نظر سے بھی ہم اپنی حکومت کو دیکھتے ہیں کہ ہم کیا کرتے رہے ہیں۔ میں ذاتی طور پر اس معاملہ میں ہمیشہ حساس تھا البتہ اپنے اور دوسروں کے تجربات نے میرے علم و یقین میں بے حد اضافہ کیا ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ میں خود بھی مرکزی حکومت کی غلطیوں پر شدید نکتہ چینی کرتا تھا اور پھر اپنے زور خطابت سے اس کو وہاں پہنچاتا تھا جہاں مجھے آج محسوس ہوتا ہے کہ میری تقریروں کو اس ملک کے مخالفین ہمارے ہی خلاف استعمال کرنے میں حق بجانب تھے اور مجھے آج بھی یاد آتا ہے کہ وہ لوگ کس طرح میری تقریروں کی تعریف کرتے اور میری حمایت کا دم بھرتے تھے۔ جب کہ آج موثر بہ ماضی کر کے دیکھتا ہوں تو اس قصے کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ میں نے اس کا ذکر اس لیے کیا کہ مجھے اپنے وطن پاکستان کے بارے میں کبھی ایک لمحہ کیلئے بھی کوئی ذہنی تحفظ نہیں تھا، اور میرا تمام روئے سخن حکومت کے اہلکاروں اور مسئولین کی طرف ہوتا تھا مگر اس کا کیا علاج ہے کہ ہمارے مسئولین اپنے آپ کو ملک و ملت سے بھی بالا تر خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔

لیکن جب میں نے اس باریک نقطے کو سمجھ لیا اور اپنا طریقہ بدلنا شروع کیا تو وہ سب میری تعریف کرنے اور ہمدردی کا دم بھرنے والے ایک ایک کر کے غائب ہو گئے ان کی اس ہمدردی کے غالباً دو مقصد تھے اور شاید وہ طبقے بھی دو ہوں، ایک تو وہ جو اس چور دروازے کی تلاش میں تھے، جس کا ذکر میں کر آیا ہوں۔ دوسرے وہ جو نظریہ الحاق پاکستان کے مخالف تھے۔ خود تو کچھ نہ کر سکتے تھے، مجھے اپنی تقریروں کے باعث اس گھٹاؤنے اور ناپاک مقصد کا آلہ کار بنانا چاہتے تھے۔ یہ طریقہ کار کوئی نیا نہیں ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ اُٹھا کر دیکھئے ماضی قریب میں ہی ایسے کتنے لوگ ملیں گے جن کی صلاحیتوں سے خود ان کے ملک کے دشمنوں نے فائدہ اُٹھایا۔ یہ جال جس خوبصورتی سے بچھایا گیا ہے کہ اگر کسی کو اللہ اور اس کے حبیب ﷺ

کی امداد نہ ہو تو وہ کسی صورت اس سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ اس جال کی مشہور کڑیاں تو اتنی جاذب اور پرکشش ہوتی ہیں کہ ان سے بچنا ویسے بھی عام بشری تقاضوں کے بس کی بات نہیں۔ روپیہ پیسہ، خوبرو عورتیں، عیاشی، طرب و نشاط کے سامان اور پھر سب سے بڑھ کر مسند اقتدار، یہ سب کچھ قدموں میں دکھائی دے تو کون ''کافر'' نہیں بن سکتا۔ مجھے بھی اللہ پاک کے کرم اور کسی فیضان نے بچایا، ورنہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ کیا ہوتا؟ دشمنوں کی گود میں ہوتا یا پھانسی کے تختے پر۔ فیصلہ مشکل ہے، مگر تیسری کوئی صورت نہیں تھی، مجیب الرحمٰن بے چارے کو تو دونوں کا مزہ چکھنا پڑا۔ ان ذاتی تجربات کی بھی ایک طویل داستان ہے، کبھی موقع ملا تو ان شاء اللہ قلمبند کروں گا۔

تنقید کا نیا طریقہ کار:

دوسروں کے تجربات کا مطلب یہ ہے کہ جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو میں نے اس ضمن میں اپنے ہم عصروں کے حالات پر بھی غور کرنا شروع کر دیا، پھر تو کوئی پردہ نہ رہا۔ جوتا کہاں کہاں کاٹتا ہے وہ سب آسانی سے دکھائی دینے لگا اور اس راستے کی وہ خطرناک اور تنگ و تاریک گھاٹیاں بخوبی نظر آنے لگیں جو پہلے دکھائی نہ دیتی تھیں۔

چنانچہ جب میں نے بحیثیت صدر کام شروع کیا تو ان امور کا کافی علم اور احساس موجود تھا مگر حالات کی سنگینی کا زیادہ علم نہ تھا۔ وہ بھی اچھا ہوا، ورنہ کون یہ ذمہ داری لیتا۔ کہتے ہیں کہ لاعلمی اور بے خبری بھی ایک نعمت ہے، ورنہ بصورت دیگر بھٹو حکمران ہوتے نہ ضیاء الحق اور نہ کئی دوسرے۔ میرا ایک طریق کار پھر یہ ہو گیا کہ مرکز سے جو خرابی یا کمی واقع ہوتی ہے، اس کیلئے میں مرکزی حکومت کے ساتھ اندر بیٹھ کر لڑتا جھگڑتا اور بہت تلخ خط و کتابت بھی کرتا۔ یہاں تک کہ مرکزی حکومت کو یہ خیال ہو جاتا کہ شاید میں کسی مخالفت کے باعث ایسا کر رہا ہوں۔ لیکن باہر عوام میں ان خرابیوں کی تمام ذمہ داری خود اپنے سر لے لیتا۔ کئی ایسی فاش غلطیاں مرکز سے ہوتی رہیں، جن کے بہت خطرناک نتائج ہو سکتے ہیں، مگر میں ان سب کو

اپنے ذمے لیتا رہا۔ اس کی بڑی وجہ میرا خیال ہے کہ جو غلطی حکومت پاکستان کے ساتھ ہماری طرف سے منسوب ہو گی، وہ پاکستان کے نظریئے کے ساتھ اور پھر نظریہ الحاق پاکستان سے منسوب ہو گی۔ یہ کوئی پوشیدہ امر بھی نہیں ہے۔ کہ ہم آئے دن یہی باتیں سنتے ہیں۔ ہمارے طالب علم نوجوان بالخصوص وہ جو اسلام، پاکستان اور الحاق کے مخالفوں کے ہتھے چڑھتے جاتے ہیں، وہ کس قدر بے باکی سے ہر غلطی اور خرابی کو حالات کے مطابق ان ہی تینوں کے ساتھ منسوب کرتے ہیں یہ بجائے خود ایک لمحہ فکریہ ہے۔ میرے نزدیک تو حب الوطنی، صلاحیت اور سیاسی بصیرت کا تقاضا یہ ہے کہ آزاد کشمیر کا صدر خود تو گالیاں کھا لے اور عوام کے غیظ وغضب کا نشانہ بے شک بن جائے مگر اس کے قول وفعل سے تحریک الحاق پاکستان پر کوئی زد یا آنچ نہیں آنی چاہیئے۔

لنٹ افسر صاحبان کا طرزعمل:

آزاد کشمیر کے صدر کا یہ کام ایک اور وجہ سے بھی مشکل ہے۔ کچھ وجوہات تو اس صورت حال میں اصلی ہیں اور کچھ مصنوعی اور غیر ضروری۔ ان میں سے ایک ہمارے ہاں لنٹ افسروں کا وجود ہے۔ ایک تو ان کے تقرر کا طریقہ کار ہی بے حد غلط، غیر مساویانہ اور ایک طرح سے قانوناً بھی درست نہیں ہے۔ اس سے خوبخود بعض مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن سب سے بڑی مشکل ان افسروں کے طرزعمل کے باعث پیدا ہوتی ہے، ان حضرات کو نہ تو اس خاص مشن کی تربیت دی جاتی ہے نہ ان کی اہلیت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو غلطی ان سے صادر ہوتی ہے اس کا بوجھ بھی مرکزی حکومت پر اور پھر پاکستان اور نظریات، سب ہی پر پڑتا ہے۔ ان میں سے بعض افسر صاحبان کا تو طرزعمل ہی ایسا ہوتا ہے، گویا آزاد کشمیر کے اصل فاتح وہی ہیں اور ریاست کے لوگ سب ان کے غلام ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا ایسے افسران خود تخریب کار ہوتے ہیں اور دانستہ ایسا کرتے ہیں یا بیوقوف اور نا اہل ہوتے ہیں، جس پر پردہ ڈالنے کے لیے لاشعوری طور پر ایسے طرزعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں، کیونکہ علم

النفسیات کا یہ بھی ایک مستقل مسئلہ ہے۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آزاد کشمیر حکومت کے صدر یا وزیرِاعظم کی ذمہ داری کتنی نازک اور مشکل ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ میں نے بھٹو صاحب کے ساتھ ہزار کوشش کی کہ ان کے اور میرے درمیان کوئی تلخی نہ ہو مگر بدقسمتی سے اس ملک میں ایسے لوگ تو بے حساب ہیں جو اپنی نا اہلیت کا بدلہ اس ملک سے لینا چاہتے ہیں لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کو ایسے حالات میں ملک کے مفادات کا خیال رہے۔

ایک دلچسپ واقعہ:

میری بعض تلخیوں کے ایک شاخسانہ کے طور پر ایک واقعہ بہت برمحل ہے جس سے ہماری سیاسی زندگی کے اندرونی گوشوں کا علم ہو سکتا ہے۔ مرحوم جسٹس دین محمد جو پرانے کشمیری بھی تھے، جب چوہدری محمد علی مرحوم کے دور حکومت کے مشیر برائے امور کشمیر ہو گئے تو انہوں نے مجھے ایک بار کراچی بلوایا۔ ان کی ملاقات والے دوسرے کمرے میں ہمارے اور چند کارکن بیٹھے تھے، جو الحاق پاکستان کی مخالفت کرتے رہتے تھے، جب میں دین محمد صاحب سے ملا تو کہنے لگے معلوم ہوا ہے کہ آپ تو خود مختار کشمیر کی بات کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہے کہ ان کا مطلب کیا تھا آیا وہ واقعی ناراض تھے کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں یا تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ میں یہ نیک کام واقعی کر رہا ہوں کہ نہیں، یہ دوسری بات میں نے اس لیے کی کہ ہمارے کئی ایک پرانے کشمیری بھی ایسے ہیں جو اس مخمصے میں پھنسے ہوئے ہیں اور اس تخریبی تحریک کے بعض کارکن دھوکہ دے کر ان حضرات کی سیاسی و سماجی حیثیت کا ناجائز استفادہ کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا ''جج صاحب! آپ گورنر بھی رہے ہیں اگر آپ حضرات کی اطلاعات کا یہ عالم ہے تو خدا اس ملک کی خیر کرے''۔ میں نے کہا ''خواجہ صاحب! اگر میں سمجھوں کہ پاکستان کا مفاد اس بات میں ہے تو آپ سے ڈرتا نہیں ہوں میں۔ میں تو ادھر کراچی میں کھڑا ہو کر اعلان کروں گا کہ یہی بات ہمارے مفاد میں ہے لیکن

بات اس کے بالکل برعکس ہے''۔ یہ کہہ کر میں چلا آیا۔ اس لیے آزاد کشمیر حکومت کی یہ کتنی نازک اور سنگین ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے اعمال اور اقدامات پر پوری توجہ رکھے کہ ان سے کہیں تخریبی افکار کو مدد تو نہیں مل رہی، بلکہ تخریبی اور منفی رجحانات کا مؤثر علاج بھی کرے۔ چنانچہ ہماری حکومت کو اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو اس کی کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔

کشمیری حکومت کے اقدامات کا سرحد پار اثر:

اس کے علاوہ آزاد کشمیر کے کردار میں ایک مخفی امر یہ بھی ہے کہ اس کے اقدامات اور طرز عمل کا سرحد پار کے کشمیر پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ یہ بھی ایک نہایت ہی نازک اور حساس ذمہ داری ہے۔ کہنا یہ ہے کہ جب کرکٹ اور ہاکی کی ٹیم کا اثر وہاں پڑتا ہے تو دوسرے سیاسی امور کا اثر کیوں نہ پڑے گا۔ یہ بھی معلوم ہے اور محتاج تشریح نہیں ہے کہ جس طرح پاکستان کے استحکام اور سیاسی قوت کا بے پناہ اثر مقبوضہ کشمیر پر پڑتا ہے، اسی طرح ہماری کمزوریوں کا اثر بھی لامحالہ مرتب ہوتا ہے۔ اسی طرح یقیناً آزاد کشمیر حکومت کے کردار کا اثر تو وہاں بدر جہا زیادہ مرتب ہونا چاہیئے اور ہوتا بھی ہے بلکہ میں ایک اور بات کہتا ہوں جسے میں اچھی طرح جانتا بھی ہوں کہ اگر آزاد کشمیر کی حکومت کا کردار قومی نقطہ نظر سے درست ہو یعنی پاکستان کے ساتھ رشتہ مضبوط ہو، عوام کے ساتھ یک جہتی بھی ہو اور آزاد کشمیر کے اندرون ترقی و تعمیر بھی ہو رہی ہو تو نہ صرف مقبوضہ کشمیر کے عوام پر اس کا مفید اثر پڑتا ہے، بلکہ بھارتی حکومت کے اخراجات میں بھی اسی تناسب کیساتھ اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا علم حکومت پاکستان کو بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آزاد کشمیر کا یہی کردار ایسا ہے کہ اس کا کوئی بدل نہیں ہے اور بھارت کو پریشان کرنے اور تحریک آزادی کشمیر کو زندہ رکھنے کا یہ بھی ایک مؤثر طریقہ ہے۔ جیسا کہ میں کہہ آیا ہوں یہ کوئی تعلّی نہیں ہے، بلکہ ایک حقیقت ہے کہ آزاد کشمیر میں اس دور میں مسلم کانفرنس کی حکومت ہوتی تو فاروق عبداللہ کو برطرف کرنا اندرا گاندھی کیلئے نہ صرف ممکن نہ ہوتا بلکہ وہ شیخ فاروق کو راضی رکھنے کیلئے اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ مشفقانہ سلوک کرتی۔

اس کردار کے نقطہ نظر سے بھی دیکھیں کہ مسلم کانفرنس کی حکومت کہاں تک کامیاب ہوئی۔ باقی حکومتیں تو اس ضمن میں قابل ذکر ہی نہیں ہیں، البتہ ان کا شمار خرابی کرنے والوں میں ہوسکتا ہے۔تفصیلات کے بغیر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ جو لوگ 1970ء تا 1975ء سرینگر کا ریڈیو سنتے ہوں گے ان کو یاد ہوگا کہ وہی ریڈیو جو اس سے پہلے طعنہ زنی اور طنز کے انداز میں بات کرتا تھا کہ دیکھو یہاں اس قدر ترقی ہوئی ہے مگر آزاد کشمیر میں ایسا ہے، وہی ریڈیو ہمارے دور میں اپنا دفاع کرنے پر لگا رہتا تھا کہ ہاں اگرچہ آزاد کشمیر میں یہ بھی ہے اور وہ بھی ہے مگر ہم بھی یوں کر رہے ہیں۔ہمارے ہاں اس کا علم نہیں ہے کہ جب بھارتی ریڈیو ہماری کمزوری بیان کرتا ہے، تو کشمیری مسلمانوں کو کس طرح ندامت ہوتی ہے، اور سر تو کیا آنکھیں نیچی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے اور علم بھی کہ اس دور میں 1966ء کی طرح لوگ سر اونچا کر کے چلتے اور بھارتیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے۔

اس سے بھی کچھ اندازہ ہوگا کہ ہم لوگ جو کشمیر کی حکومت کی بات کرتے ہیں تو کیا محض حکومت کرنے کا شوق پورا کرنا چاہتے ہیں یا کوئی اور بات ہے جو ہمارے پیش نظر ہے۔

مسلم کانفرنس کے کارکنوں سے خطاب

پختگی شعور کی ضرورت:

میری اس تحریر کے اولین مخاطب تو مسلم کانفرنس کے کارکن حضرات ہیں۔ کیونکہ اگر ان کو ان امور کا کماحقہ علم ہو اور وہ اپنا فریضہ صحیح طور پر ادا کریں تو فضاء بڑی حد تک درست ہو جاتی ہے۔ جماعت کے کارکنوں کا عقیدہ اور نظریہ تو اگرچہ کسی شک و شبہ سے بالا تر ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ ان کے احساس وشعور کو ابھی اور پختہ ہونا چاہیئے ان کو اپنی کوششوں میں مزید اضافہ کرنا چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے نظریہ کے بارے میں نہ صرف خود پورا علم حاصل کیا جائے یعنی اس کے فوائد اور نقصانات یقین کی حد تک معلوم ہوں بلکہ اسی طرح اس نظریئے کے مخالف نظریات سے نئی نسل کو صحیح طریقہ سے آگاہ کیا جائے اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو پھر ماضی اور حال میں کی جانے والی تمام جدوجہد محض تضیع اوقات اور لا حاصل مشق کے سوا کچھ نہیں رہتی۔

نئی نسل کیلئے ایک تو یہ نظریہ ویسے بھی اب پرانا لگ رہا ہوگا جس کو وہ تبدیل کرنا چاہتے ہوں گے جیسے ہمارے بعض جاہل جن کو کسی بھی چیز کا علم نہیں ہوتا کہہ دیتے ہیں کہ اسلام پرانا ہوگیا ہے۔ دوسرے یہ کہ نئی نسل کو اپنے گردوپیش کے حالات کی وجہ سے اور اس وجہ سے بھی کہ نئے نظریات میں ایک طبعی اور فطری کشش دکھائی دینا چاہیئے۔ کیونکہ کوئی چیز خلاء میں تو رہ نہیں سکتی، اگر ہم نے اپنی نئی نسل کو اس عظیم نظریئے اور عقیدے کی تعلیم دینے میں مجرمانہ غفلت اور کوتاہی کی ہے تو مخالف لوگ تو ہمارا انتظار نہیں کر سکتے۔ مسلم کانفرس کے کارکن اس کی طرف پوری توجہ دیں تو یہ کام بڑی تیزی کے ساتھ درست ہوسکتا ہے اور یہ جو ہم نے ایسا نہیں کیا تو اس کی وجہ بدنیتی نہیں بلکہ وہی احساس وشعور کی ناپختگی ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یوں سمجھیں کہ جب ایک شخص نیک نیتی سے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے تو اسی پر نہ

رہے بلکہ بقایا امور کا بھی کماحقہ، اہتمام کرے، احساس وشعور اور احساس کو پختہ کرنا ہے۔ اگر ہمیں اپنے مخالف نظریات کی لغویت اور اہمیت کا کماحقہ علم نہ ہوگا تو کوئی بھی کارکن خود ہی شک میں پڑ کر اپنا کام ترک کرسکتا ہے اور کسی ردعمل کے باعث انتظامی طور پر کوئی دوسرا نظریہ بھی اختیار کرسکتا ہے۔ یہ بات انسانی فطرت کا حصہ ہے مگر جس کا علم درست ہوگا اور تصور پختہ ہوگا وہی آزمائش میں ثابت قدم رہے گا، جہاں کہیں ایسا ہوا ہے اس کے نتائج بہت واضح ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ کئی جگہوں پر کچھ کارکن مقامی طور پر ہمارے کارکنوں سے کسی وجہ سے نالاں ہوکر دوسری جماعتوں میں چلے گئے ہیں، ایک بڑے قومی وملی مقصد کیلئے یہ کوئی بڑی قربانی نہیں ہے کہ ان کو راضی کیا جائے۔

رکن سازی کی مہم اور اسلامی کردار سازی:

تیسرا کام جو ہمارے کارکنوں کو کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ انتظار میں نہ رہیں کہ چونکہ وہ صحیح راستے پر ہیں اور مخلص ہیں، اس لیے ہر شخص ان کے پاس آ کر خود ہی اپنے آپ کو مسلم کانفرنسی بنائے۔ ہمارے کارکن خود لوگوں کے پاس ان کے گھروں میں جا کر اپنا پیغام پہنچائیں۔ یہ بات اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس وقت تو سیاست اور سیاسی جماعتوں کی ایک طرح کی منڈی لگ رہی ہے اور مقابلہ ہو رہا ہے۔ نہ کوئی معیار ہے، نہ اصول، نہ روایات، بلکہ فری سٹائل کشتی کا سا سماں ہے۔ اس لیے خود آگے بڑھ کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً اس وقت صورت حال مختلف ہوتی۔

چوتھی بات جو جماعت کے کارکنوں کیلئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ مصائب و مشکلات پر صبر و ہمت کرنے کے علاوہ اپنے کردار پر بھرپور توجہ دیں تا کہ ہم قول وفعل کے تضاد کا شکار نہ ہوں۔ اگر ہمارے کارکن اپنے آپ کو ایک اسلامی ریاست کے کارکنوں کے مطابق نہیں بنائیں گے تو پھر اسلامی نظام کا کوئی تصور ہوگا، نہ ہی انھیں آزاد کشمیر کے ان غیور اور بہادر عوام کی قیادت کرنے کا حق پہنچتا ہے جو راسخ العقیدہ اور باعمل مسلمان ہیں۔

اس ملک میں سیاست کے اب دو ہی راستے رہ گئے ہیں، کوئی درمیانی راہ نہیں رہی۔ سیاست یا اسلام کی راہ پر ہو گی یا خالص لادینی بلکہ بے دینی کی۔ وہ پہلے والی بات شاید اب مشکل ہو گی کہ اسلام میں تب بھی مسلمان کی سیاست موجود رہے گی۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری سیاست میں سیاستدانوں کے اعتبار سے ابھی ان کا وزن زیادہ ہے جو سیاست کو دین سے علیحدہ رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ اب اس سے چھٹکارا نہیں ہے کہ سیاست کو اسلام کے تابع بنایا جائے۔ اگر سیاست دان اور سیاسی کارکن اس حقیقت کو نہیں سمجھیں گے تو کوئی بھی سنگین حادثہ ہو سکتا ہے۔ یہ کشمکش جتنی جلد ختم ہو اُتنا ہی امن وسکون ہو گا۔

اس موقع پر ضمناً اس بات کا ذکر کرنا بے محل نہ ہو گا کہ ہماری قومی سیاست میں ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو واضح طور پر بغیر کسی لگی لپٹی کے برملا کہتے ہیں کہ اسلامی نظام نہ صرف ایک دقیانوسی خیال ہے بلکہ ہر قسم کے مذاہب محض توہمات ہیں اور انسانیت کو غلط راستے پر ڈالنے کا ذریعہ ہیں۔ اسی قسم کی نہ جانے کیا کیا خرابات کہی جاتی ہوں گی۔ نام اگرچہ بدقسمتی سے ان کے بھی مسلمانوں کے سے ہی ہیں، لیکن قول وفعل ہر دو اعتبار سے اسلام کے مخالف ہیں۔ دوسری طرف وہ طبقہ ہے جو نہ تو کفر قبول کر سکتا ہے اور نہ ہی اسلام کو زندگی کی اجازت دینے کا قائل ہے اور تیسری جانب وہ لوگ ہیں جو محض علم و دین کی بنیاد پر ہی فن سیاست میں مہارت کے دعوے دار ہیں، جب کہ عملاً سیاست کیلئے بے کار ہیں، اسی فضا میں کچھ لوگوں کا زور اس پر ہے کہ خود پاکستان کے وجود ہی کو اسلامی نظام کے ساتھ مشروط کر دیا جائے اور بڑی حد تک وہ اس ''آ بیل مجھے مار'' والے پراپیگنڈے میں مؤثر بھی ہیں، یہ میں اس لیے کہتا رہتا ہوں کہ ہمیں پاکستان کو اپنی نا اہلیت کے ساتھ مشروط نہیں کرنا چاہیئے۔

اگر مشیت ایزدی سے پاکستان باقی رہا تو جب کسی میں اہلیت ہو گی، اسلام بھی نافذ کر دے گا، تب تک ہمیں خود کو اس عظیم کام کیلئے تیار کرنا چاہیئے اگر وہی نہ ہو سکا تو اس سے

اگلی منزل تک کیسے رسائی ہوسکتی ہے۔ اسلامی ریاست بنانے کیلئے دیگر امور کے علاوہ یہ امر بھی ضروری اور بنیادی ہے کہ ان سیاسی کارکنوں کا کردار اور عمل اسلام کے مطابق ہو ورنہ اسلامی سیاست کے تمام دعوے جھوٹے اور خود فریبی کے سوا کچھ نہ ہوں گے۔ اس ضمن میں مسلم کانفرنس کے کارکنوں کی ذمہ داری اس لیے بھی زیادہ ہے کہ ہم اس کام کو ایک مرتبہ عملاً کر چکے ہیں۔ ہمارے لیے اس سے پیچھے ہٹنے کا کوئی تصور نہیں ہوسکتا، اس سے آگے ہی بڑھنا ہو گا۔ وہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ مسلم کانفرنس کے تمام سرکردہ کارکن اپنے آپ کو اس مقصد کی ضروریات اور اس کے تقاضوں سے لیس کر لیں۔ وہ تقاضے کیا ہیں، مختصراً اس کا امر یقین کامل کہ یہی وہ عظیم تر کام ہے جو ہمیں کرنا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کا حتیٰ الامکان علم حاصل کرنا کہ وہ کام درحقیقت ہے کیا، اس کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کام کیسے ہوسکتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اپنے آپ کو اس کام کے قابل بنانا، یعنی اسلامی اقدار پر سختی سے عمل کرنا، اخلاق، عادات، معاملات، عبادات میں پوری دلچسپی لینا، محض اس لیے کہ ان میں سے کوئی ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو وہ عظیم کام کسی صورت نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اسلامی نظام کی بات بھی محض کسی سیاسی، مصلحت کی بناء پر نہ کی جائے بلکہ یہ بات ہمارے قول وفعل سے ثابت ہوتی ہو۔

بات تو ہم اسلامی نظام کی کریں، مگر اخلاق و عادات میں ہم فرنگی کے زمانے میں ہوں۔ جھوٹ بولتے ہوں، دغا کرتے ہوں، خودغرضی کرتے ہوں تو یہ تضاد خود ہی ہمارے قول کی ایک بڑی تردید ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی صریح خلاف ورزی ہے۔

(تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں) بلکہ اگر کسی کارکن یا راہنما کے دل و دماغ میں غلامی کا ادنیٰ سا شائبہ بھی ہو تو اسلام کے نظام کی بات کرنا عبث ہے، کیونکہ اسلام تو انسانی آزادی کے بلند ترین مقام کا نام ہے، مطلب یہ ہے کہ سیاست کو عبادت سمجھ کر لیا جائے نہ کہ محض شوق پورا کرنے یا کسی وقت، مفاد یا کسی دوسری مصلحت کیلئے، جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے، جب مقصد پورا ہو جائے گا تو عادات میں بھی فرق پڑنے لگے گا، ہمارے اعمال اگر

اسلام کے مطابق نہیں ہیں، خواہ وہ سیاست دانوں کے ہوں یا علماء وغیرہ کے تو اس کی اصل وجہ اسلام کی حقیقت پر یقین کی کمی ہے۔ دوسرے انسانی جبلی کمزوریاں بھی ایک حد تک اس کا موجب ہوتی ہیں، لیکن ہمارا یقین درست ہو تو ان کا علاج خود بخود ہوتا رہتا ہے۔

بات لمبی ہو گئی، خلاصہ یہ کہ مسلم کانفرنس کے کارکنوں کو اپنی اصلاح کرنی چاہیئے اور تیزی سے کرنی چاہیئے، ورنہ پاکستان کی افادیت تو ختم نہ ہو گی البتہ مسلم کانفرنس کی افادیت یقیناً باقی نہیں رہے گی، اس لیے کہ "خیر الناس من ینفع الناس" کی حدیث مبارک کے مطابق بقائے انفع کا اصول ساقط ہو جائے گا۔ ہماری تمام تر افادیت ہمارے اعلیٰ مقصد اور اس کے مطابق عمل کی وجہ سے ہے، خیر کائی طرح سے عوام الناس کو فائدہ پہنچ رہا ہے اعلیٰ مقاصد اور فائدہ مند عمل دونوں لازم و ملزوم ہیں، کسی ایک کا ترک دوسرے کی فنا کا موجب ہے ورنہ دوسرے لوگ ہم سے بہتر اور مؤثر کام کریں گے۔ ہماری افادیت نہ رہی تو ہماری ضرورت بھی نہ رہے گی۔ زمانے کا بے رحم ہاتھ ہمارے شاندار ماضی کا ہمیں کوئی معاوضہ نہیں دے گا، یہ نہ بھولیں کہ ہمارے تمام تر مقاصد خواہ وہ کشمیر کی آزادی ہو۔ اسلامی اقدار کا نفاذ ہو، نظریہ الحاق پاکستان ہو، آزاد کشمیر کی آزادی کی بقا ہو یا آزاد کشمیر کے اندرونی معاملات ہوں، ان سب کا دارومدار اسلام کے ساتھ گہری اور ناقابل ترمیم وابستگی پر ہے اس امر کی وضاحت کیلئے دور حاضر کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں تاہم اگر کسی نے اس پر غور کیا تو بات سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہو گا۔

سرکاری ملازمین سے خطاب

ملازمین کا کردار:

میرے اس مقالے کے دوسرے مخاطب جو نتائج کے اعتبار سے نہایت ہی اہم ہیں، سرکاری ملازمین ہیں۔ ان کی اہمیت کی کئی وجوہات ہیں۔ وہ ہمارے ملک کے خاصے پڑھے

لکھے لوگ ہیں بلکہ جسے انگریزی میں ''کریم'' کہتے ہیں، یہ وہ ہیں۔ ملکی معاملات میں ان کا دخل سب سے زیادہ ہے اور سب سے زیادہ مؤثر کردار بھی وہی ادا کرتے ہیں۔ حقیقت میں ہمارے ہاں کوئی خرابی ہو یا اچھائی، اس میں سیاہ سفید کا مالک یہی طبقہ ہے۔ اسی لیے اگر ہماری بات ان کی سمجھ میں آ جائے اور وہ اس ملک کے مفادات کا تحفظ کرنے کی قسم کھا کر کمر بستہ ہو جائیں تو اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ پھر کوئی زیادہ فکر کی بات نہیں رہتی، نہ کوئی خطرہ باقی رہتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہماری سرکاری مشینری بھی خواہ وجہ کچھ بھی ہو، ایک منفی کردار ادا کرتی رہی ہے۔ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ عوام ان کی طرف راہنمائی کے لیے دیکھ رہے ہیں۔ وہ راہنمائی کے لیے سیاستدانوں کی طرف دیکھ رہے ہیں اور سیاستدان ملک سے باہر کسی اور طرف متوجہ ہیں۔ اس طرح گویا ابھی تک اپنی کوئی فکری بنیاد ہی نہیں مہیا کر سکے۔

سرکاری عہدوں کا غلط استعمال:

مشرقی پاکستان کے دردناک المیہ میں بلاشبہ دوسرے محرکات بھی کام کر رہے تھے۔ مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہماری سرکاری مشینری کا کردار بھی اس المیہ کا ایک بنیادی عنصر تھا۔ مختصر یہ کہ یہ مشینری فکری طور پر تقریباً تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک تو وہ جو اپنے عہدے اور مرتبے کو خالصتاً اپنے ذاتی مفاد ہی کا ذریعہ سمجھتا ہے اور عوام کے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ دوسرے وہ جو تخریبی اور منفی رجحانات لے کر اس صف میں داخل ہوتے ہیں اور یہاں بھی وہی کام کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے عہدے، مرتبے اور اثر و رسوخ تمام کا تمام ملک میں تخریبی کام پوری دیدہ دلیری کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ ان حضرات کا رعب اس قدر ہے کہ ان سے اوپر والے بعض ذمہ دار حضرات اس حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود ان سے باز پرس کرنا تو درکنار، وہ اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ انھیں اس کا علم ہے۔ چشم پوشی کا یہ مجرمانہ طرزِ عمل بھی ناقابل فہم ہے۔

ان تخریب کار حضرات کی رسائی زندگی کے ہر گوشے تک ہوتی ہے اس لیے ان کا تبادلہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ ان کو ان کی مرضی کے سٹیشن دے دیئے جاتے ہیں جہاں وہ آسانی سے تخریب کاری کر سکیں۔

باصلاحیت لیکن بے جرأت ملازمین:

ایک تیسرا طبقہ بھی ہے جس کو اس وطن کے ساتھ محبت بھی ہے اور اس کی افادیت کا علم بھی۔ لیکن وہ سوائے اس کے کہ کسی وقت اپنے ڈرائنگ روم میں ہم خیال دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر ایک آہ سرد سے اپنی تشفی کر لیں اور حب الوطنی کا پورا حق ادا شدہ سمجھیں، نہ کوئی مؤثر کام کرتے ہیں نہ جرأت رکھتے ہیں۔ ان حضرات کی صلاحیتوں میں کوئی کمی ہے، نہ ان کے علم و دانش میں، مگر کوئی ایسا حجاب حائل ہو گیا ہے جو اصلاح احوال پر اقدام کی جرأت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ ملازمین کا یہ تیسرا طبقہ تعداد میں تو کافی ہے مگر بے اثر۔

اس لیے میرے خیال میں جب تک وہ ملازمین جو اپنی تعداد اور دوسری صلاحیتوں کے اعتبار سے سب سے مؤثر کردار ادا کرتے ہیں، وہ ان معاملات کو صحیح نقطۂ نظر سے سمجھ کر آگے نہیں بڑھتے، تب تک کسی قسم کی کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ ہم کولہو کے بیل کی طرح اسی جگہ گھومتے رہیں۔

دل برداشتہ اور مایوس ملازمین:

سرکاری ملازمین کے بارے میں ایک امر یہ بھی ہے کہ وہ ملازمین جنھوں نے تحریک پاکستان کو دیکھا اور اس پوری مشق کی اہمیت سے واقف تھے، وہ ویسے ہی کم ہوتے جا رہے ہیں۔ جو باقی ہیں وہ بھی اپنی کوتاہیوں کے سبب اپنی اولادوں کے ہاتھوں بے بس و مجبور ہیں۔ جن میں ابھی زندگی کی کوئی رمق باقی ہے، وہ حکمرانوں کی فکری بے سر و سامانی اور نا اہلیت سے

دل برداشتہ ہیں۔ اب تو ملازمین ایسی بے چینی اور غیر یقینی صورت حال کا شکار ہیں کہ وہ یوں بھی کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتے، مگر اس مایوس کن صورتِ حال کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرکاری ملازمین ہی اس ملک کے معاملات میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر صحیح بات ان کی سمجھ میں آ جائے تو اس کا کافی امکان ہے کہ معاملات درست ہونا شروع ہو جائیں۔

یہ کہنا بھی بے جا نہ ہو گا کہ اس طبقہ کو نظر انداز کر کے ہم کوئی بھی قومی کام نہیں کر سکتے۔ میرا ذاتی تجربہ بھی بالکل یہی ہے۔ جہاں کسی ذمہ دار ملازم کو بات سمجھ میں آئی، وہاں معاملات کو سلجھانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ مسلسل رابطہ نہ رکھا جائے تو ''خانہ خالی'' والی بات ہو جاتی ہے۔ لیکن رابطہ رکھنے میں بھی ایک دوسری مشکل ہے، میں نے دیکھا ہے کہ یہ رابطہ تقریباً یک طرفہ ہوتا ہے سرکاری ملازمین یا حکومت دونوں اس میں پہل کرنے اور اس ضرورت کے احساس کا کوئی مظاہرہ کرنے کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ ان کو خیال ہوتا ہے کہ اس طرح شاید ان کے وقار میں کمی ہو جائے گی اور کسی کمزوری کی نشاندہی ہو گی۔ دیکھیئے کہ ملک کے مفادات کو کس جھوٹی انا پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ سیاستدانوں کیلیئے بھی ایک مشکل ہے، جس کا ہمیں کافی تجربہ ہے ہم میں سے جن حضرات کے ذاتی اغراض ہوں، ان کیلیئے نہ کوئی مشکل ہے نہ عزت نفس کا کوئی سوال ہے۔ غرض مند کی عزت نفس ہوتی بھی کیا ہے۔ لیکن مشکل ان لوگوں کے لیے ہے جو اخلاص مندی سے قومی خدمت کرتے ہیں۔

بہر حال اس تحریر میں ان کو مخاطب کرنے کا مقصد یہی ہے کہ انھیں آزادی کشمیر کی سیاسی صورت حال کی کچھ نہ کچھ واقفیت ہو جائے اور ایک ایک کو ایک ایک بات ہر بار بتانے کی ضرورت نہ رہے۔ یہ سرکاری لوگ اپنی پسند اور ناپسند کی وجہ سے کس طرح سفید کا سیاہ اور سیاہ کا سفید بناتے ہیں، کبھی موقع ملا تو ان تجربات کا ذکر بھی کروں گا۔

نوجوان طلباء سے خطاب

عدم التفات:

اس تحریر کے تیسرے مخاطب ہمارے نوجوان اور عزیز طلبہ ہیں۔ یہ طبقہ بھی ہماری خصوصی توجہ کا محتاج ہے۔ آزادی کے بعد اس پورے دور میں اگر کوئی طبقہ بری طرح نظر انداز ہوا ہے تو وہ ہماری جواں سال نسل ہے۔ حکومتوں نے اور اس نسل کے سرپرستوں نے ان کو صرف لکھنا پڑھنا سکھانے پر ہی بہت زور دیا۔ ان کے باقی معاملات کو حالات کے بے رحم دھارے کے سپرد کر دیا۔ اگر کوئی خوش نصیب اس صورت حال سے بچ نکلا ہے تو وہ ایک استثناء ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو، خدا کی خاص مہربانی ہو، گھریلو ماحول ہو یا بقول مفکر اسلام: ؎

''سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی''

ہو، مگر اس میں یقیناً حکومت، نظام تعلیم اور سرپرستوں کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔

انگریز کی حکمت عملی:

انگریز اس ملک کو ایک خاص سمت لے جا رہا تھا جس کیلئے وہ بڑی چابکدستی اور حکمت کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ اگرچہ اس کا ہاتھ بالواسطہ طور پر اب بھی موجود ہے۔ مگر منظر سے اس کے ہٹ جانے کے بعد ہر چیز گویا بے لگام ہوگئی ہے۔ پوری زندگی بے لگام دکھائی دیتی ہے۔ فطری تقاضا تو یہ تھا کہ آزادی کے بعد نئے تقاضوں کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھالنے کی سرتوڑ کوشش کی جاتی، لیکن نہ تو یہاں کبھی ان تقاضوں کا کوئی حکیمانہ تجزیہ کیا گیا، نہ اس کا احساس۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا حال ایک ویران مکان کا سا ہوگیا۔

اس مشق میں سب سے زیادہ نقصان نئی نسل کا ہوا۔ نئی نسل اور خاص کر طلبہ کئی ایسی تنظیموں میں بٹ گئے جن کے قبلے ہی مختلف اطراف میں ہیں۔ کوئی محل مشترک نہیں ہے۔

جس قوم کی جواں سال نسل اس قدر شدید مخالف سمتوں میں تقسیم ہو جائے، اس قوم کا انجام خدا ہی خیر کرے۔ یہ کچھ مشکل کام نہیں تھا کہ ہم کسی ایک سمت کا رخ اختیار کرتے، نہ ہی یہ ہماری عقل وفکر سے کوئی بالا تر کام تھا۔ محض ہماری سہل پسندی اور اقدام کرنے پر بے جرأتی سے یہ فضا پیدا ہوئی۔ لیکن اگر اس پر توجہ کی جائے تو یہ اب بھی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔

منحرف یا محروم التفات طلباء کے دو گروہ:

گزشتہ چند سالوں میں میں نے ان نوجوانوں کی حیثیت اور کارکردگی کو نہایت ہی قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں تقریباً دو بڑے گروہ ہیں۔ ایک وہ جو قدرے زیادہ صلاحیت والا ہے اور غلط ہاتھوں میں پھنسا ہوا ہے۔ دوسرا محض لاوارثی کی زندگی گزار رہا ہے۔ کیونکہ جس راہنمائی کا وہ بھی محتاج ہے وہ راہنمائی کہیں سے مہیا نہیں ہوسکتی۔ والدین ہوں، استاد ہوں یا حکومت، اس بارے میں سب ہی خاموش ہیں۔ سیاسی راہنما اور جماعتیں بھی بدقسمتی سے مختلف گروہ بندیوں میں الجھ کر رہ گئے اور جواں سال نسل قومی سوچ سے سرے سے محروم ہوگئی ہے۔ اپنی اس نسل کو دیکھتا ہوں تو بالکل ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی نے محنت کر کے بہت اچھی فصل اُگائی ہو اور پھر اس کو درندوں کے سپرد کر دیا ہو۔

پریشان کن صورت حال:

کتنی پریشان کن بات ہے کہ اس ملک میں زیادہ متحرک تنظیمیں سب کی سب ایسی ہیں جن کے فکر وعمل کے کسی گوشے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کا اس ملک کے نظریات کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ خواہ سوشلسٹ ہوں یا مذہبی گروہ، پاکستان کی بات بلاواسطہ کم ہی کرتے ہیں۔ یہ بھی سب پردے میں نہیں ہے کہ ان نظریات کے پس پردہ کیا کیا بیرونی ہاتھ کارفرما ہیں۔ اس پر مزید رنج یہ ہے کہ تقریباً یہ سب بچے ان لوگوں کی اولاد ہیں یا عزیز ہیں، جنھوں نے پاکستان بنایا اور بڑی قربانیاں دیں یا کم از کم خود اس ملک کی سلامتی اور بقاء کے خواہش

مند ہیں۔ مشرقی پاکستان کے المیہ کا بار بار ذکر کرنا پڑتا ہے، وہاں بھی بالکل یہی ہوا کہ تحریک پاکستان کے کارکنوں اور محبّ وطن اور مخلص پاکستانیوں کے بچے اس تخریبی تحریک کی نذر ہو گئے اور سارا ملک ان کی نذر ہو گیا۔ تعلیمی اداروں میں ایک سوچی سمجھی تجویز اور منصوبہ بندی کے تحت ایسا نظام کیا جاری رکھا گیا کہ متوسط اور نچلے طبقے کے بچے نہ تو علم حاصل کر سکیں نہ اپنی روایات کو قائم رکھ سکیں اور نہ اپنے مذہب و اخلاق کو برقرار رکھ سکیں، بلکہ ان کی جسمانی نشوونما کو بھی برباد کرنے کے کئی طریقے روز بروز ترقی پر ہیں۔ اگر اس کو روکا نہ گیا تو ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ محض آوارہ اور ناکارہ قوم کے سوا کچھ بھی نہ ہو گا۔ ملکی مسائل کو حل کرنا تو درکنار وہ تو اس قابل بھی نہیں ہوں گے کہ اپنی آزادی ہی کو برقرار رکھ سکیں۔

مؤثر علاج:

اس کے جو چند علاج ہیں ان میں ایک زیادہ مؤثر علاج یہ ہے کہ طلبہ کو خود اس امر کا احساس ہو جائے، کیونکہ وہ تعلیمی اداروں کے اندر ہی مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس غرض کیلئے پاکستان اور آزاد کشمیر میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کو منظّم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ کسی بڑے معرکہ کا تو ابھی ذکر نہیں کیا جا سکتا مگر اس کوشش میں کافی حد تک کامیابی ہوئی اور خدا کا فضل و کرم ہے کہ کام روز بروز بہتر ہو رہا ہے۔ تاہم یہ کام اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ اس پر اگرچہ تمام لوگوں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے مگر خاص طور پر اس میں خود ہی زیادہ کام کرنا ہے۔ ان کی کوئی امداد کرے نہ کرے، وقت کا تقاضا یہی ہے کہ طلبہ خود ہی اپنے آپ کو اس قیمتی اور بے بدل وراثت کے قابل بنائیں، قبل اس کے کہ یہ سازشیں خود ہماری اس پوری نسل کو اس کی وراثت سے محروم کر دیں۔ اس لیے میرے اس مقالے کے ایک اہم مخاطب ہمارے نوجوان اور خاص کر زیرِ تعلیم نوجوان ہیں۔ اسی سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں اس وقت کیا ہو رہا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی قابل مطالعہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟

تعلیمی اداروں کی موجودہ صورت حال:

اس وقت شاید ہی کوئی ایسا سرکاری تعلیمی ادارہ ہو جو باقاعدگی سے چل رہا ہو، ادارے آئے دن بند کر دیئے جاتے ہیں۔ کھلے رہیں تو فساد اور قتل و غارت، اور بند رہیں تو تعلیم کا نقصان۔ بلکہ وقت، محنت، حکومت کا سرمایہ اور والدین کی کوششیں سب اکارت، بعض تعلیمی ادارے تو اسلحہ خانے بنتے جا رہے ہیں۔ ہماری بڑی بدنصیبی تو یہ ہے کہ کچھ سیاسی جماعتیں بھی اس تخریب کاری کی پشت پناہی کرنے میں کوئی شرم و حیاء محسوس نہیں کرتیں۔ یہ تو صریحاً اس ملک کا نقصان ہے۔کسی حکومت کا حکمرانوں کا تو سرے سے کوئی ذاتی نقصان ہے ہی نہیں۔ یہ تو ہماری جواں سال نسل کی اپنی تباہی ہے۔ اس طرح نہ تو وہ علم حاصل کرسکیں گے نہ ان کی تعمیری اور مثبت فکر کو ترقی اور جلا مل سکے گی۔ بلکہ وہ بچے جن کے جوانی کے قیمتی ایام منفی اور غیر ذمہ دارانہ طرزعمل میں گزریں گے وہ آگے چل کر کون سا تعمیری کام کرسکیں گے۔ گویا اس طرح ہم اس ملک میں اپنے ہی ہاتھوں اپنی آنے والی نسل کو غیر ذمہ دارانہ منفی تربیت دے رہے ہیں اور توقع یہ کرتے ہیں کہ وہ ذمہ دار بھی ہوں اور تعمیر بھی کریں۔

تعلیمی اداروں میں اسلحہ کا عام اور آزادانہ استعمال اب ایک معمول بنتا جا رہا ہے اس سے مجھے اپنے بچپن کا ایک سبق آموز واقعہ یاد آیا۔ میں والدمحترم کے ہمراہ اپنے علاقے میں ایک صاحب کے ہاں گیا جو بڑائی کی ہر صفت کے لائق تھے۔منجملہ اور باتوں کے انھوں نے میرے والد صاحب کو مخاطب کر کے کہا: ''اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ بچہ تعلیم حاصل کرے تو اسے بندوق کو ہاتھ نہ لگانے دینا''۔ مجھے اس وقت تو ان کی بات بری لگی۔مگر جوں جوں زندگی گزرتی گئی اور تجربات و مشاہدات حاصل ہوتے رہے، مجھے ان بزرگوں کے کلمات کی حکمت سمجھ میں آتی چلی گئی۔ وہ کتنی حکیمانہ بات تھی۔مشکل اس لیے تھی کہ ہمارے گھر میں کچھ نہ کچھ اسلحہ ہر وقت موجود رہتا۔ آج بھی وہ بات کتنی واضح حقیقت ہے، جو طالب علم تعلیمی اداروں میں اسلحہ کا شوق کرتے ہیں ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو گا جوعلم حاصل کر سکا ہو۔

ڈگریاں بھی اب اسلحہ کے ذریعہ ہی حاصل ہو جاتی ہیں۔مگر علم بہر حال علم ہے۔ اس کے تقاضے مختلف ہیں۔

اس کے علاوہ ان اداروں میں اخلاق کی بربادی کا تو خاص اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اس پورے قضیے میں سب سے زیادہ نقصان متوسط اور نچلے درجے کے لوگوں کی اولاد کا ہو رہا ہے۔مگر بامر مجبوری یا دیکھا دیکھی چونکہ ایک رسم چل نکلی ہے وہ بھی اس پوری مشق میں شریک ہو جاتے ہیں۔ متوسط اور نچلے درجے کے بچوں کا نقصان اس لیے زیادہ ہے کہ ان کو اگر تعلیم حاصل کرنا ہے تو وہ ان ہی اداروں میں پڑھ سکتے ہیں۔ جبکہ امیروں کے بچے ملک سے باہر بھی جا سکتے ہیں اور ملک کے اندر بھی وہ قیمتی اداروں میں تعلیم کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں۔ اسی طرح بڑے لوگوں کے بچوں کو تعلیم اور کم قابلیت پر بھی ملازمتیں اور کاروبار کا ملنا مشکل نہیں ہے، جبکہ غریب لوگوں کے بچوں کو تعلیم اور قابلیت کے باوجود حصول روزگار میں آسانی نہیں ہے، تو اس طرح گویا ہمارے نوجوانوں کی اکثریت پڑھ لکھ کر اپنے لیے، والدین کیلئے اور اس معاشرے کیلئے محض ایک بوجھ بن سکتے ہیں۔ اس سے پھر مزید خرابیاں لامحالہ جنم لیتی ہیں وہ سمجھ والوں کے لیے تشریح کی محتاج نہیں ہیں۔ اس کو روکنے کی ذمہ داری کوئی بھی لینے کو تیار نہیں ہے۔

اس کے علاج کا ایک مؤثر طریقہ خود طالب علموں کے ہاتھ میں ہے۔جب تک ان تعلیمی اداروں کے اندر طلبہ کی اپنی ایک ایسی مضبوط اور مؤثر تنظیم نہ ہو گی، جو اس مرض کا علاج کرنا چاہے تو باہر سے اس کا علاج کم از کم مجھے نظر نہیں آتا۔ چنانچہ میرے خیال میں وہ تنظیم نہ صرف نام کے اعتبار سے بلکہ اپنے ماضی کے رشتہ میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن ہی ہو سکتی ہے۔ دوسری کوئی تنظیم اس مقصد کے لیے کام نہیں آ سکتی اس لیے کہ باقی تمام تنظیمیں تفرقہ پھیلا سکتی ہیں مگر وہ بنیاد فراہم نہیں کر سکتیں، جس پر استحکام یک جہتی اور ماضی کے ساتھ وابستگی کی عمارت تعمیر کی جا سکے۔ جو درد اور دلچسپی مالک مکان کو ہو گی، وہ کسی مسافر یا کرایہ دار کو

ہرگز نہیں ہوسکتی۔ ماضی کے رشتہ کے اعتبار اور کئی دوسری وجوہات سے یہی وہ تنظیم ہے جو گھر کی اصل مالک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی تنظیم کیلئے کوشاں ہیں۔ اس سے ہماری وہ غرض ہرگز نہیں ہے جو دوسری جماعتوں کی اپنی ہم خیال تنظیموں سے ہے۔ وہ تو عام طور پر طلبہ سے ایک خاص قسم کا وقتی مفاد چاہتے ہیں اور ان کو اس کا آلہ کار بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ بعض جماعتیں طلبہ کو اپنی سیاسی اغراض کیلئے استعمال کرتی ہیں جب کہ ہماری سوچ بالکل مختلف ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ تعلق رکھنے والے طلبہ تعلیمی اداروں میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں اور ہم سے جو امداد چاہیں ہم ان کیلئے مہیا کریں۔ ہماری یہ خواہش بھی ہے کہ ہمارے بچے اس ذمہ داری کے علاوہ ہماری وراثت کے بھی اہل بن جائیں تاکہ اس قیمتی ورثہ کی حفاظت کرسکیں۔ خدا کے فضل و کرم سے ابھی وہ مقام نہیں آیا کہ ہم لوگ بھی عادات، اخلاق اور ان کی پوری زندگی کو داؤ پر لگا کر ان کی قیمت پر سیاست کریں۔

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا نظریاتی رول:

ایم۔ایس۔ایف کی بنیاد قائداعظم نے رکھی تھی اور یہ نوجوان تحریک پاکستان کا ہر اول دستہ ثابت ہوئی۔ پاکستان کی تحریک سے ان نوجوانوں کی خدمات کو نکال دیا جائے تو قائداعظمؒ کی ذات کے سوا کچھ بھی نہیں رہتا۔ مگر وہ چونکہ تحریکی دور تھا، اس لیے اس کے تقاضے بھی فوری اور اپنی مخصوص نوعیت کے تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ پاکستان کی بقاء و ترقی اور سلامتی کے تقاضوں کے مطابق اس نسل کی تربیت کی جاتی، لیکن نہ صرف یہ کہ ایسا نہ ہوا بلکہ اس امر کو سرے سے ہی نظر انداز کر دیا گیا۔ اگر قائداعظم زندہ رہتے تو جیسا کہ ان کے خیالات اور وقتاً فوقتاً ان کے ارشادات سے پتہ چلتا ہے، وہ پوری قوم کی ایک خاص تربیت کرنا چاہتے تھے جس کا لب لباب اور مقصود و مطلوب تین کلمات ہیں، یقین، اتحاد اور نظم و ضبط۔ یہی وہ تین اجزاء ہیں جو تحریک پاکستان کو دوام عطا کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی بھی افلاطون ذرا برابر اضافہ نہیں کرسکتا۔ مگر جیسا پروردگار عالم کو منظور تھا وہی ہوا۔ قائداعظم کی زندگی نے وفا نہ

کی اور جیسا وہ کچھ سوچتے تھے ایسا نہ ہوا۔

بعد میں آنے والے حضرات میں نہ تو فکر موجود تھی نہ ان کو فرصت ملی۔ ساتھ ہی قائداعظم کی آنکھ بند ہوتے ہی وہ تمام فتنے اُٹھ کھڑے ہوئے جو قائداعظم اورتحریک پاکستان کے جذبہ اور جوش کے پہاڑ تلے دبے ہوئے تھے یعنی یہ قوم اپنے اصل کی طرف فوراً لوٹ آئی۔ مستزاد یہ کہ پاکستان کے وجود کے خلاف بھارت اور انگریز کی ملی بھگت نے نت نئے جھگڑے کھڑے کر دیئے۔ چنانچہ آج ہم وہاں ہیں جہاں ہمیں وقت نے کھڑا کر دیا ہے۔ اس لیے کسی بھی اعتبار سے دیکھا جائے تو جب تک ہماری نئی نسل کو اس ذمہ داری کے قابل نہیں بنایا جاتا، اس وقت تک اس ملک کی سلامتی و بقاء اور استحکام محل نظر ہیں۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے اور یہی نقطہ نظر درست ہے تو پھر اس تحریک کو زندہ کرنا ہوگا جس کو قائداعظم نے منظم کیا تھا، جسے ''ایم۔ایس۔ایف'' کہتے ہیں۔

قیام پاکستان میں تنظیم کا کردار:

نوجوانوں کی دوسری کسی تنظیم کا پاکستان کے ساتھ وہ ذہنی وفکری رشتہ ہو ہی نہیں سکتا، جو اس قدر گہر اور بالواسطہ ہو جتنا کہ ایم ایس ایف کا ہوسکتا ہے۔ ایم ایس ایف کے اس تعلق کی بحالی بالکل ایسی ہے جیسے کسی یتیم کو عرصہ دراز کے بعد اپنی کھوئی ہوئی قیمتی وراثت مل جائے۔ طلبہ کی یہی وہ تنظیم ہے جو اس ملک کی صحیح وارث ہے۔ میں نے دیکھا کہ ایم۔ایس۔ایف میں شامل ہونے کے ساتھ ہی نوجوانوں کے اپنے ماضی کے ساتھ تمام ذہنی و فکری اور جسمانی رشتے بحال ہو جاتے ہیں۔ وہ ٹوٹی ہوئی کڑیاں پھر سے جڑ جاتی ہیں۔ دوسری تنظیموں میں نئے نئے افکار کا پرچار ہوتا ہے اور بڑے دور کے واسطے سے پاکستان کی بات آتی ہے، بسا اوقات وہ اتنے واسطوں سے کی جاتی ہے کہ وہ گورکھ دھندا نوجوانوں کی سمجھ میں آنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دوسری تنظیموں میں پاکستان کی بات کھل کر نہیں ہوتی بلکہ ایک بنیادی افسوس ناک وجہ یہ بھی ہے کہ طلبہ کی دوسری تنظیموں کا تعلق جن سیاسی

جماعتوں کے ساتھ ہے، وہ قائداعظم کو تو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتیں، اور جو قائداعظمؒ کو نہیں مانتا اس کیلئے پاکستان مال غنیمت کے سوا کچھ نہیں۔ قائداعظمؒ کا انکار تو پاکستان کے انکار سے کم نہیں ہے۔

ایم۔ایس۔ایف کا نام آتے ہی قائداعظم اور پاکستان کے ساتھ تمام رشتے خود بخود بحال ہو جاتے ہیں۔ اس لیے میرے نزدیک وہ تمام زیرِ تعلیم نوجوان جو خود کو پاکستانی جانتے ہیں اور صحیح معنوں میں پاکستانی بننا چاہتے ہیں، ان کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ وہ ایم۔ایس۔ایف میں شامل ہوں اور اس کو مضبوط کریں۔ ایم۔ایس۔ایف کے طلبہ کو دوسری تنظیموں کی طرح نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ بھی مال غنیمت میں شریک ایک تنظیم ہے بلکہ یہ اس عظیم وراثت کی اصل مالک ہے۔ خدا نہ کرے کہ اس قیمتی اور بے مثال وراثت کے اصل مالکوں کو اس کا احساس نہ رہے اور کوئی غاصب اسے ان سے چھین لے اور اس کے نزدیک بھی نہ آنے دے۔

متاع کارواں اور احساس زیاں:

طلبہ کے بارے میں بھی بات اچھی طرح وضاحت کے ساتھ ہونی چاہیئے تھی، مگر پھر وہی خوف طوالت حائل ہے۔ ایک آخری بات یہ کہتا ہوں کہ ہمارے طلبہ کیلئے دو بنیادی امور غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ وراثت ہے کیا؟ آیا واقعی یہ ہمارے نوجوانوں ہی کی وراثت ہے۔ یعنی کیا واقعی یہی لوگ ہیں جو اس کے اصل مالک ہیں، اور دوسرے یہ کہ وہ کس طرح اپنے آپ کو اس کا اہل بنا سکتے ہیں۔ میں نے اس پر ملک بھر میں متعدد مقامات پر ایم۔ایس۔ایف کے نوجوانوں کے ساتھ گفتگو کی ہے اور اس کا کچھ نہ کچھ اثر بھی ضرور ہوا ہے، لیکن میں اپنا شعور اور احساس ان کے ذہنوں میں کماحقہ، منتقل نہیں کر سکا۔ تاہم کوشش جاری رہے گی، نتیجہ اللہ کے ہاتھ ہے۔

ہمارے ان صحیح وارثوں کی ایک بڑی مشکل یہ ہوگئی کہ بڑی نسل میں سے کوئی بھی ان کو بات بناتا ہے نہ حمایت کرتا ہے۔ یہ کتنا المیہ ہے کہ پاکستان بنانے والوں یعنی تحریک پاکستان کے کارکنوں اور دوسرے محبِّ وطن لوگوں کے بچے اور بچیاں تعلیمی اداروں میں ایسی تنظیموں کے ساتھ منسلک ہیں جن کا تعلق پاکستان کے ساتھ ایک طرح سے مشروط ہے اور اس وجہ سے کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ وہ شرطیں بھی ایسی ہیں کہ ان کا فوراً پورا ہونا یقینی امر نہیں ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ سرخ ہو تو باقی رہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ سبز ہو تو باقی رہے کسی کے ہاں اس ملک کی بقاء کو کسی فرقے کے ساتھ مشروط ہونا چاہیئے۔ کوئی جماعت سے مشروط کرنا چاہتا ہے اور کوئی اس سے بھی چار قدم آگے ہے کہ فلاں فرد کے ساتھ مشروط ہو۔ غرض یہ کہ اندر سے ہم اس بری طرح تقسیم ہو گئے ہیں کہ سب کچھ غیر یقینی ہونے لگا ہے۔ نوجوانوں کی کوئی ایسی تنظیم ہو جو خود کو ملک کے لیے سمجھے جب کہ سب ہی اس کو تقسیم کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے محبِّ وطن پاکستانیوں کی اولاد مالِ غنیمت ہے یا کوئی پنیری ہے جسے ہر باغ میں لگایا جائے، اور تو اور سرکاری ملازمین جو اس ملک سے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور اگر خدانخواستہ یہ ملک نہ ہوتا تو وہ کسی ہندو کے آگے ہاتھ باندھ کر نمسکار پکارتے، وہ بھی اپنے بچوں کو اس سے باز نہیں رکھ سکتے۔ جب سرکاری ملازمین اور دوسرے بااثر لوگوں کے بچے محض حیرانی کا ہی شکار ہو سکتے ہیں یا ان کے چلنے پر مجبور۔

چنانچہ طلباء کی ایک صحیح تنظیم اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور وہ تنظیم ایم۔ایس۔ایف ہی ہو سکتی ہے، لیکن کوئی سیاسی تنظیم طلباء کی فی الواقع حمایت و امداد نہیں کر رہی ہے۔ حکومتیں بھی اس میں عجیب وغریب ناقابلِ فہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ سیاسی تنظیموں کے علاوہ دوسرے بااثر حضرات بھی اس قومی ضرورت سے غافل ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب خود اپنے برے انجام کی جانب کھنچے جا رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے تو اپنے بچوں کو ابھی سے اپنا بزرگوار بنا لیا ہے کہ ان کے سامنے اونچی آواز سے بات کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

اس طرح ان بچوں کی باگ ڈور کسی دشمن کے ہاتھ میں جا رہی ہے۔ یہ کتنا بڑا سانحہ ہے اور ہم سب یہ کہتے ہیں کہ جی اس ملک میں یہ کیوں نہیں ہوتا اور وہ کیوں نہیں ہوتا۔ حالات کے تجزیے سے تو حیرت ہوتی ہے کہ ہم ابھی تک کیوں باقی ہیں۔ خدا کرے کسی حادثے کے بغیر ہی اس قوم کے بااثر اور سرکردہ افراد کو اس امر کا شعور اور احساس ہو جائے۔

طلباء اور نوجوان لوگ خود کو کسی طرح اس کا اہل بنائیں۔ یہ امر بھی نہایت ہی سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے۔ تاہم میرے خیال میں اجمالی طور پر ہماری نئی نسل کو دو کام کرنا چاہئیں، ایک تو یہ کہ راہنمائی اور امداد کیلئے بزرگوں کی طرف دیکھنے کی بجائے خود ہی اس کمی کو پورا کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارنا چاہئیں۔ یہ کچھ بعید از قیاس امر بھی نہیں ہے، پوری انسانی تاریخ اس پر شاہد ہے بلکہ تاریخ سازی انہی لوگوں نے کی ہے جو آگے بڑھ کر اقدام کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے نوجوان قائداعظمؒ کے بنائے ہوئے اس اصول پر سختی سے عمل کرنے کی کوشش کریں، یقین اتحاد اور نظم و ضبط۔ اگر ہمارے کارکن ان الفاظ کا مفہوم سمجھنے لگیں اور اس پر کسی نہ کسی درجہ عمل کی کوشش کریں تو اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ یہ لوگ اپنے آپ کو اس بے مثال وراثت کا صحیح معنوں میں حقدار اور اس کا اہل ثابت کر سکتے ہیں۔

دانشوروں کا فرض:

میں اپنے ملک کے دانشوروں سے بھی گزارش کروں گا جو قائداعظم کے پیروکار اور ملک پاکستان کی سلامتی و بقاء پر ایمان رکھتے ہیں کہ اپنی اس نئی نسل کو جو اس وقت دوراہے کیا چوراہے بلکہ چھ راہے پر کھڑی ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے اور کسی راہنمائی کی تلاش میں ہے، اس کیلئے اگر صرف ان ہی تین کلمات کی تشریح کر دیں تو یہ بڑا کارنامہ ہوگا۔ اگر بے ادبی نہ سمجھی جائے تو یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اس پورے معاشرے میں ایسے کتنے لوگ ہیں جن کو ان کلمات کا کچھ مفہوم آتا ہو یا کبھی ان کا خیال بھی آتا ہو۔ حالانکہ ایک فرد کی زندگی ہو

تب بھی یہی اصول کامیابی کی ضمانت ہیں اور ایک قوم ہو تو اس کا کہنا ہی کیا اگر کامیابی کے اصولوں کا قرآن و حدیث کے حوالے سے ذکر کیا جائے تب بھی یہی تین اجزاء ہیں بلکہ ان میں سے ایک ایک جزو بھی کامیابی کے کسی نہ کسی درجے کیلئے مفید کیا تریاق ہے۔ ہماری جواں نسل کیلئے یہ جاننا بھی بے حد ضروری ہے کہ ان کیلئے خاص طور پر تعلیمی اداروں کے اندر جو چیلنج ہے وہ اصولاً کیا ہے اور اس کے مقابلے کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیئے؟ چاہیئے تو یہ تھا کہ حکومت بھی اپنے دانشوروں کو تکلیف دیتی کہ وہ بھی کچھ نہ کچھ حق نمک ادا کریں اور اس بارے میں اپنا فرض ادا کریں، کیونکہ یہ کام وہ نہایت ہی سہولت کے ساتھ کر سکتے ہیں، خدا کرے۔

تاہم باقی حضرات کو بھی اپنے فرض کی ادائیگی میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ ہماری نئ نسل ہماری اولین توجہ کی مستحق ہے اور ابھی وقت ہے۔ جب بوجھ بڑھ جائے گا تب واپسی محال نہ سہی، مشکل ضرور ہو گی۔

عوام......''ایک بے بس اکثریت''

اس مضمون کے چوتھے مخاطب ہمارے باقی لوگ ہیں جو اپنے وزن کے اعتبار سے فیصلہ کن حیثیت کے مالک ہیں۔ دراصل قوموں کے فیصلے زیادہ تر اسی واسطے سے ہوتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی مثال ہی دینا پھر درست ہو گی، وہاں اگر یہ ''بے بس اکثریت'' اپنا وزن مجیب الرحمان کے پلڑے میں نہ ڈالتی تو ان کی تقدیر کا فیصلہ مختلف ہوتا۔ یہ کتنی دلچسپ بات ہے کہ جہاں خدائے تعالیٰ کے ہاں باقی تمام معاملات طے کرنے کا ایک اصول ہے، وہاں قوموں کے معاملات کو طے کرنے کا ایک دوسرا ضابطہ ہے۔قوموں کے معاملے میں تو فرمایا: ''ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیرو اما بانفسھم'' گویا قوموں کو اختیار دے دیا کہ وہ خود ہی اپنی حالت کو جیسے چاہیں بنا لیں، خدائے تعالیٰ بھی اسی پر اپنی مہر لگا دیتے ہیں۔ اس لیے ہماری ذمہ داری یہ بھی ہے کہ ہم ان تمام حضرات کو بھی صحیح صورت حال سے آگاہ کریں، پھر اس کے بعد اگر کوئی غلط فیصلہ کرتا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟

قومی تقاضے:

ایک ضروری امر جو سب سے پہلے سمجھ میں آنا چاہیئے، وہ یہ ہے کہ اس وقت بات محض سیاسی جماعتوں کی رسہ کشی کی نہیں ہے، بلکہ معاملہ اس سے بدر جہا مختلف ہے۔ ہم رفتہ رفتہ اپنے بارے میں کسی فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہونے والے اللہ تعالیٰ ہماری راہنمائی فرمائے اور صحیح سمت میں عمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آنا چاہیئے کہ کون سی سیاسی جماعت چاہتی کیا ہے؟ ایک تو یہ کہ ان جماعتوں کے لوگ کھلم کھلا کیا بات کرتے ہیں؟ تفصیل میں جانے کے بغیر صرف اتنا کہوں گا کہ ہمارے قومی تقاضے یہ ہیں کہ ہمارا تعلق پاکستان کے ساتھ مضبوط ہو، کیونکہ وہی مستقبل کی ضمانت ہے۔ ہم اپنی اس آزادی کی قیمتی دولت کو جسے برسوں کی سیاسی

جدوجہد کے علاوہ ہم نے پندرہ مہینے لگاتار جہاد کر کے اور جان و مال قربان کر کے حاصل کیا، برقرار رکھ سکیں، اور اپنے آپ کو اس کا اہل بنا سکیں کہ کشمیر کی آزادی کو جو فرض ہمارے ذمہ ہے اس کو ادا کر سکیں۔ ایک چوتھا امر یہ بھی کہ آزاد کشمیر کا خطہ جو تحریک آزادی کا بیس کیمپ ہے، مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کی امید ہے۔ پاکستان کے دفاع کا آخری قلعہ ہے اور اسلامی نظام کی ابتداء کرنے والا ہے، اس کو اندرونی طور پر اس حیثیت کے شایانِ شان بنا کر دوسروں کیلئے ایک مثالی نمونہ بنایا جائے۔ آزاد کشمیر کی ترقی و تعمیر صحیح طریقہ پر ہو، لوگوں میں پیار و محبت اور یک جہتی ہو، نوجوانوں میں زندگی کا جذبہ اور شوق ہو اور وہ بھارت کے سر پر ایک خوں آشام لٹکتی تلوار ہو۔ اس سے قبل کہ ہمارے لوگ اپنے آپ کو کسی جماعت کے ساتھ وابستہ، کریں میرے خیال میں یہ ہیں وہ چند بنیادی خدوخال جو ہمارے ہر مرد و زن کے ذہن میں ہونے چاہئیں۔ اس تعلق کی بنیاد مضبوط اور صحیح ہو گی، تب عمارت بھی صحیح ہو گی۔ اگر اس تعلق کی بنیاد علاقوں، زبانوں، قبیلوں، طبقوں، رشتوں، ناطوں اور فرقوں کے برے اور قابل نفرت مرض پر ہو گی تو دیکھ لیجیے اس کا انجام کیا ہو گا؟

صحیح سمت کا تعین:

میں نے جلسوں کے دوران کئی جگہ کہا کہ عوام و خواص اگر محض زمین پر سفر کرتے وقت اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں کہ ان کی منزل کس طرف ہے کون سی گاڑی اس منزل کی طرف جاتی ہے، تو یہ کتنا افسوس ناک امر ہو گا کہ وہ زندگی کا یہ اہم ترین سفر کرتے وقت قرآن کریم کی قوموں کے بارے میں جو آیت اتری ہے اس کا خیال نہ رکھیں، نہ دیکھیں کہ منزل مشرق میں ہے یا مغرب میں۔ اور اس کی پرواہ نہ کریں کہ جس گاڑی میں وہ بیٹھے ہیں وہ کس منزل کی طرف جا رہی ہے۔ مسافر کی منزل مکۃ المکرّمہ ہو اور بیٹھ جائے اس گاڑی میں جو جاپان جا رہی ہو تو وہ بے چارہ بے شک اپنے خیال میں عمرہ کی تیاری کر رہا ہو اور لبیک اللّٰھم لبیک پڑھ رہا ہو مگر پہنچے گا ٹوکیو، مکہ نہیں جا سکتا۔ کیونکہ بقول سعدی:

ے ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی

ایں رہ کہ تو میروی بترکستان است

اس وقت ہمارے ہاں بے شمار لوگوں کا یہی حال ہے، اس کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ ''وللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم''

یہاں پہنچ کر میں محسوس کرتا ہوں کہ نہ صرف آزاد کشمیر بلکہ پاکستان ہو یا بھارت اور اسی طرح کئی دوسرے ممالک میں بھی لوگ ایک فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو گئے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے ساتھ وابستگی بھی ایک اہم امر ہے کیونکہ سیاست کا کوئی تصور جماعتوں کے بغیر موجود نہیں ہے۔ اس لیے جماعتیں اختیار کرتے وقت سوجھ بوجھ سے کام لینا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے یہ شعور ابھی پیدا نہیں ہوا، لیکن یہ بات کوئی قابل قبول عذر نہیں ہے، زمانہ اپنی رفتار روک کر یا سانس بند کر کے ہمارا انتظار نہیں کرسکتا۔

انتخابات۔ ایک اہم مرحلہ:

اسی طرح عوام و خواص کیلئے ایک دوسرا اہم مرحلہ ہمارے ہاں انتخابات ہیں۔ اس وقت انتخابات کے فلسفے پر تو بات نہیں ہوسکتی۔ میرے پیش نظر اس کا فوری پہلو ہے۔ یہ جو میں نے قوموں کی قسمت کے فیصلے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا حوالہ دیا جس کا بالکل لفظ بہ لفظ ترجمہ اس شعر سے ہوتا ہے۔ آیت ''ان اللہ لا یغیر بقوم حتی یغیرو اما بانفسھم''

ے خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

تو میرا خیال ہے کہ ہمارے ہاں اس فیصلہ کا وقت انتخابات ہیں۔ جو فیصلہ انتخابات میں ہوگا وہی ہمارے حق میں اچھا یا برا ثابت ہوگا۔ اس بات کی کوئی معافی نہ ہوگی کہ جناب

ہم نے تو یوں ہی بے خیالی اور لاعلمی میں ایسا کر دیا تھا۔ جو کچھ ہم ان انتخابات میں کریں، وہی ہماری قسمت کا فیصلہ ہو گا۔

دشمن ملک کی اچھی مثال:

اس امر کو مزید واضح کرنے کیلئے میں قارئین کی توجہ ماضی قریب کے ایک دو تاریخی واقعات کی طرف دلانا چاہتا ہوں، تا کہ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جائے۔ ہمارے پڑوس، یعنی بھارت سے ہمیں ابھی کسی اچھائی کی امید نہیں ہے، جب بھی ان کا بس چلے گا، وہ پاکستان پر وار کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اللہ محفوظ رکھے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں جس شخص میں بھی کوئی غیرت وحمیت ہے اور کچھ بھی عقل ہے اس کیلئے بھارت کے حالیہ انتخابات درس عبرت اور سبق آموز ہیں۔

ہوا کیا؟ بھارت کے عوام کو جب یہ احساس ہو گیا کہ ان کے ملک کو توڑنے کی شازشیں ہو رہی ہیں اور خطرہ ہے کہ اندرا گاندھی کے بعد ملک ٹوٹ جائے گا، تو دیکھیئے ان لوگوں نے کس جذبے، شوق اور سیاسی شعور کا مظاہرہ کیا۔ ہزار اختلاف سہی، مگر کون ہے جس کے دل میں بھارتی عوام کیلئے عزت پیدا نہ ہوئی ہو۔ بھارت میں غربت و افلاس تو ضرب المثل ہے۔ تعلیم کا تناسب بھی ابھی بہت کم ہے لیکن ملک کے بچانے کے جذبہ اور شعور کا کتنا وافر مظاہرہ کیا گیا ہے۔ عوام نے ایسے شخص کو بھرپور تائید وحمایت مہیا کی جس کی عمر و تجربہ بھارت جیسے بڑے حجم والے اور پیچیدہ مسائل میں الجھے ہوئے ملک کے مقابلے میں کہیں کم ہے اور ابھی کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیسا وزیرِاعظم ثابت ہو گا۔

کون نہیں جانتا کہ وہ خطرات جن کا احساس بھارتی عوام کو ہوا، وہی خطرات ہمارے ہاں بدر جہا موجود ہیں اور زیادہ واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن کیا ہمیں ان بھوکے ننگے اور سینکڑوں خداؤں کی پوجا کرنے والے لوگوں کی نسبت ان خطرات کا کچھ بھی شعور اور احساس ہے؟ جب کہ ہمارے ہاں غربت بھی ویسی نہیں، تعلیمی تناسب بھی بہتر ہے اور

زندگی کی آسائشیں تو شاید اب ہر دروازے پر دستک دے رہی ہوں۔

یہ تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہاں بھارت میں سیاسی عمل جاری رہا اور جمہوریت قائم رہی، مگر ملک کی سلامتی کے احساس کیلئے محض جمہوریت اور سیاسی عمل ہی تو کوئی واحد سبب نہیں ہیں۔ اگر ایک عنصر نہیں تو اس سے بہتر دوسرے عناصر موجود ہیں۔ خدا ایک، رسولﷺ ایک، مذہب و ملت ایک، نفع و نقصان ایک اور پھر دشمنوں کی نظروں میں ہم سب ایک۔ مگر خدا جانے وہ کیا مرض ہے جو لا دوا ہوتا ہے اور ہم بدستور ان خطرات کے احساس و شعور سے محروم ہیں۔

یہ بھی ضمناً ذکر آ گیا کہ آنجہانی اندرا گاندھی کا اپنا وزن بھارت کے برابر تھا، اس لیے ان کی موجودگی میں بھارت کی شکست و ریخت کا احساس شاید زیادہ نہ ہوگا۔ لیکن جوں ہی ان کو قتل کر دیا گیا تو وہ احساس یکبارگی پیدا ہو گیا۔ مسٹر راجیو گاندھی نے اگر سیاست میں صحیح راستہ اختیار کیا تو نہ صرف بھارت محفوظ رہے گا بلکہ جنوب مشرقی ایشیاء کا پورا خطہ امن و سلامتی کی توقع کر سکتا ہے۔ وہ صحیح راستہ صرف یہ ہے کہ بھارت اپنے پڑوسی ممالک کے ساتھ دشمنی اور زیادتی کی کارروائیاں ختم کر کے دوستی اور افہام وتفہیم کی فضا پیدا کرے۔ بھارتی حکمرانوں کو جو یہ فرضی خیال ہو گیا ہے کہ بھارت اپنے پڑوسی ممالک کے ساتھ دشمنی اور زیادتی کی کاروائیاں ختم کر کے دوستی اور افہام وتفہیم کی فضا پیدا کرے۔ بھارتی حکمرانوں کو جو یہ فرضی خیال ہو گیا ہے کہ بھارت کو پڑوسی ملکوں سے خطرہ ہے خاص کر پاکستان سے، تو یہ نہ صرف وہم ہے بلکہ ایک مصنوعی کیفیت ہے، جو دونوں کے دشمنوں نے منصوبہ بندی سے پیدا کی ہو گی، کیونکہ ان کا مفاد اسی میں ہے اور اگر ایسا نہیں تو پھر یہ خود بھارتی حکمرانوں کی نیت کی خرابی اور غاصبانہ عزائم کی غمازی کرتی ہے یا دونوں باتیں ہوسکتی ہیں۔

مشرقی پاکستان کے انتخابات:

یہ تو بھارت کا انتخاب تھا، ایک اور انتخاب کی مثالیں لیجیے۔ مشرقی پاکستان؟ وہاں بھی تو لوگوں نے ووٹ دیئے اور بڑھ چڑھ کر دیئے، مگر دیکھیئے اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ اس کی وجہ

اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دونوں حضرات یعنی عوام اور خواص کی نیت خراب تھی اور ایک منفی اور تخریبی عمل کے لیے انھوں نے ووٹ ڈالے تھے۔ چنانچہ نتیجہ فرمان خداوندی کے عین مطابق ہوا۔ آج پاکستان کی ہاکی ٹیم کو گلے لگانے سے تو کیا، لاکھوں جانیں دے کر بھی اس غلطی کا ازالہ ممکن نہیں۔

ایک انتخابات میں مسلمانوں نے قائداعظم کا ساتھ دیا تھا، اس کے نتیجے میں ایک ایسا ملک معرض وجود میں آیا جو مسلمانوں کے تشخص کا آئینہ دار اور امین ہے۔ اگر خدانخواستہ وہی لوگ کسی وقت کوئی منفی فیصلہ کر دیں تو قانون خداوندی تو تبدیل نہیں ہوگا۔

آزاد کشمیر کے انتخابات:

اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ آزاد کشمیر کا آنے والا انتخاب بھی ایک آزمائشی اور فیصلہ کن مرحلہ ثابت ہوسکتا ہے۔ سوچ کر یا ویسے ہی رواداری میں اگر منفی اور تخریبی عناصر کا ساتھ دیا گیا، تو پھر جو سزا ہمارے انتظار میں ہے اسے کون روک سکتا ہے اور اگر ہمارے لوگوں نے بھارت سے سبق لیا اور تعمیری، مثبت اندازفکر کا بھرپور ساتھ دیا تو اس سے نہ صرف ہماری سلامتی یقینی ہے بلکہ اس سے ہماری عزت و آبرو میں اضافہ ہوگا اور ہمارے مستقبل کیلئے ترقی کی نئی راہیں بھی خدا کے فضل و کرم سے ہموار ہوتی جائیں گی۔ بقول علامہ اقبال:

؎ فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

ہم تو ان شاء اللہ مقدور بھر اپنی کوششیں جاری رکھیں گے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق دے اور ہم سے وہ کام لے جو اس کے حبیب ﷺ کی امت کے مفاد میں ہو اور ہمارے دشمنوں کو ہم پر ہنسنے کا موقع نہ دے۔ آمین۔

تعمیر و ترقی کے اصول

یہ جو قومی ترقی و تعمیر کی منصوبہ بندی کے مفہوم کا ذکر کرتا ہوں، کچھ اس بارے میں گزارش کروں کہ میرے خیال میں کیا ہے۔ ترقی و تعمیر کا تصور اور منصوبہ بندی تقریباً دو طرح کی ہوسکتی ہیں۔ ایک ملازمانہ یعنی جن کو سرکاری ملازمین تیار کریں، دوسری قائدانہ جس کو سیاسی راہنما ترتیب دیں۔ ان دونوں میں مشرق و مغرب کا فاصلہ ہے، لیکن ہمارے ہاں ملک بھر میں چونکہ اول الذکر ہی کا رواج ہے اور وہی معروف اور آسان بھی ہے، اس لیے دوسری بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ سیاست کے طالب علموں کے لیے چونکہ یہ دلچسپی کا باعث ہو گا، اس لیے میں اس کا بھی اجمالی ذکر کیے دیتا ہوں۔ اجمالی اس لیے کہ ایک تو میں اپنے دوروں کے دوران کچھ وقت نکال کر یہ مضمون لکھ رہا ہوں اور دوسرے اس لیے کہ اگر اس پر مفصل اور واضح طور پر لکھا جائے تو اس کیلئے بجائے خود ایک علیحدہ کتاب لکھنے کی ضرورت ہو گی۔

تعمیراتی صورت حال:

ترقی و تعمیر اور اس کی منصوبہ بندی صرف آزاد کشمیر ہی میں خراب نہیں ہوئی بلکہ پورے ملک میں یہی صورت حال ہے۔ یہ خرابی کیوں ہے، میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جس کے ذمہ جو کام ہے، وہ اسے نہیں کر رہا ہے۔ یہ کام بنیادی طور پر سیاستدانوں کا تھا مگر انھوں نے بالکل نہیں کیا نہ، اس کے کوئی آئندہ آثار دکھائی دیتے ہیں۔ جن کو موقع نہیں ملا وہ تو چلیئے کہہ سکتے ہیں کہ انھیں موقع نہیں ملا مگر جن کو موقع ملا وہ بھی کوئی کم درجے کے حضرات نہیں تھے اور ان کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ کوئی ایک تو کچھ کر جاتا۔ مگر بدقسمتی سے اس کی ایک مثال بھی نہیں دی جا سکتی۔

ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ سیاستدانوں کی تمام تر کوششیں صرف ایک امر پر مرکوز

ہوتی ہیں کہ وہ کسی طرح حکومت تک پہنچ جائیں۔ جب وہاں چلے جائیں گے تو باقی سب کام خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ گویا وہ ملکی معاملات کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ذہنی طور پر تیار ہونا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ ہمارے جس قدر منشور مرتب ہوتے ہیں وہ محض انتخابات کے نقطہ نظر سے ہوتے ہیں ان میں وہی عارضی اور وقتی تقاضے مدنظر ہوتے ہیں۔ ان کے پس منظر میں کوئی پختہ یقین یا سوچ شاید ہی ہو، البتہ تخریبی اور منفی سوچ والے حضرات اپنے کام میں راسخ العقیدہ ہوتے ہیں۔ انتخابی منشور میں ہر شخص زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی فکر میں ہوتا ہے، خواہ حکومت کے دوران اس کے عشر عشیر پر بھی عمل نہ کر سکے، بلکہ اس پر عمل کرنے کی خواہش بھی محل نظر ہوتی ہے۔

سیاست دانوں میں جامعیت کا فقدان:

وہ جامعیت جو ہمارے جیسے ملک کے سیاستدانوں میں مطلوب ہے اس کا بھی کوئی مظاہرہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ مثلاً یہ کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ سیاستدانوں کا ملک کی معیشت، انتظامیہ، دفاع و بیرونی تعلقات اور نظریات کے بارے میں یقین کامل اور بنیادی امور کا صحیح علم اور ان کا شعور بہر صورت ہونا چاہیئے، لیکن اس کا کوئی مظاہرہ کسی وقت بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ مجھے تو اس حالت سے ہمیشہ ایسا محسوس ہوا جس طرح کوئی شخص یومیہ مزدوری کرتا ہے اور دن گزر گیا تو کافی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملکی مفادات شتر بے مہار کی مانند چلتے رہتے ہیں، کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ اسی لیے استحکام کی کوئی صورت کسی وقت بھی نہیں بن پڑی۔ اس میں دوسری قباحت یہ ہوتی ہے کہ ایسی کیفیت میں جب سیاستدانوں کو حکومت کا موقع ملتا ہے تو وہ سرکاری ملازمین کو ہی اس کام کیلئے مکلّف کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ملازمین ہی ان تمام ملکی معاملات میں منصوبہ بندی بھی کریں، اس پر عمل بھی کریں اور زندہ باد حکومت کی ہو۔ گویا وہی گھوڑا، وہی سوار۔ اس کا جو نتیجہ ہوسکتا ہے وہ معلوم کرنا مشکل نہیں۔

منصوبہ بندی اور عمل درآمد کی ذمہ داری:

اب یہ دیکھیئے کہ سرکاری ملازمین اگر اس کام کو کریں تو اس میں قباحت کیا ہے، آخر وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں اور اس ملک کا سب سے بڑا مفاد بھی انہی کو پہنچتا ہے۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے بننے کی اصل غرض و غایت ہی سرکاری ملازمین تھے، ورنہ ایک علیحدہ ملک کی ضرورت ہی کیا تھی۔ قباحت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ملازمت کا طریقہ کار انگریز سرکار نے مرتب کیا تھا، منصوبہ بندی وہ خود کرتا تھا، بلکہ وہ زیادہ تر انگلستان میں ہوتی تھی، یہاں صرف اس پر عمل ہوتا تھا۔ اس طرح نظام ٹھیک سے چلتا رہا۔ انگریز کے جانے کے بعد جو لوگ برسراقتدار آئے ان کو ہمارئے ملازمین کے نزدیک انگریز سرکار کے قائم مقام سمجھا جانا ایک فطری امر تھا لیکن بہت جلد یہ ثابت ہو گیا کہ جو نئی سرکار آتی ہے وہ اپنے ملازمین کو ہی انگریز سرکار سمجھتی ہے۔ یعنی ملازم ان سے راہنمائی کے طالب نہیں بلکہ وہ خود ملازمین سے راہنمائی کے طالب ہیں۔ اس سے ایک تو یہ ہوا جو لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں ہی مل کر ہر بات کیلئے ملک سے باہر والوں کی طرف دیکھتے رہے۔ ان کو کیا پڑی تھی کہ پہلے وہ ہمارے مفادات دریافت کرتے، پھر ہمارے حکمرانوں کو ان سے آگاہ کرتے۔

غیر ملکی ماہرین کی ''خدمات'':

اس میں یہ دقت بھی پیش نظر رہے کہ کوئی شخص بھی جو ایک غیر ملک کا رہنے والا ہو، ایک خاص طرز کی بود و باش رکھتا ہو اور اس نے ایک خاص طریقہ پر تعلیم و تربیت حاصل کی ہو، وہ دوسروں کی ضرورت کا صحیح تعین کر سکتا ہے نہ اس کے مطابق ان کو پڑھا سکتا ہے۔ وہ تو اپنے طریقہ پر ہی کرے گا جو کرے گا، وہ طریقہ اس کے گھر کیلئے تو موزوں ہو سکتا ہے لیکن بالکل دوسری طرز کے گھر کیلئے کسی صورت موزوں نہیں۔ ہمارے اکثر و بیشتر لیڈر صاحبان بھی اس ملک کیلئے اجنبی سے کم نہیں ہوتے کیونکہ ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش اول تو ملک سے باہر ہوتی ہے اور گھر میں کسی حد تک ہوتی ہے تو وہ بھی انگلستان یا امریکہ وغیرہ جیسے ماحول

میں، ان کو ملک اور اس کے عوام کی ضروریات کا سرے سے علم ہی نہیں ہو سکتا، بالکل وہی حال ہمارے ملازمین کا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کو ابتداء میں یہ ماحول میسر نہیں ہوتا۔ لیکن وہ ملازم یا لیڈر بن کر اس کو مہیا کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف پوری قوم احساس کمتری میں مبتلا ہے تو دوسری جانب اپنے اصل سے ہنوز اسی طرح نا آشنا۔ کہتے ہیں کہ کرگسوں میں پلا ہوا شاہین یا بھیڑوں میں پلا ہوا شیر بھی جب کبھی اپنے ہم جنس سے ملتا ہے تو اس کی اصل لوٹ آتی ہے۔ اگرچہ ہم آزاد لوگوں کی جنس میں شامل ہو چکے ہیں مگر پرانی تربیت کا اتنا اثر ہے کہ ہم ابھی تک شک و تردد میں ہیں کہ ہماری جنس وہ تھی یا یہ ہے۔ ایسے میں ترقی و تعمیر اور منصوبہ بندی کے تقاضے کون اور کیسے پورا کرے گا۔

ملکی ماہرین کی کیفیت:

ملازمین حضرات کے علم و فضل سے یا ان کی صلاحیتوں سے انکار نہیں ہے۔ مگر ایک عرصہ دراز تک بعض باتیں ان کے بس کا روگ نہیں، تاوقتیکہ امریکہ کی طرح ہر چیز کمپیوٹر میں نہ ڈال دی جائے ملازمین اگر خود ہی منصوبہ بندی کریں گے، جیسے کہ وہ کر رہے ہیں تو کاغذات اور فائلوں میں تو ایک جنت دکھائی دے گی، مگر زمین پر اس کے دوسرے آثار دکھائی دیں گے۔ جو کوئی بھی فائلوں کو دیکھتا ہے، عش عش کر اٹھتا ہے، کیا کمال ہو گیا ہے! جیسا کہ میں نے پہلے کہا، حتیٰ کہ ڈاکٹر محبوب الحق نے آزاد کشمیر کی اس ترقی و تعمیر کو جو قومی سرمایہ کی بربادی اور عوام کی پریشانی کا ایک طوفان تھا، اتنا عمدہ سرٹیفکیٹ دیا۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کی صلاحیت اور دیانت سے کس کو انکار ہے، مگر بات وہی ہے کہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان کو فائلوں میں اور نقشوں میں جو دکھایا گیا ہے اس پر وہ تو کیا میں بھی وہی سٹرٹفکیٹ جاری کرتا۔ میرا یقین ہے کہ ان کو اب تک بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو گا کہ میرا (سردار محمد عبدالقیوم خان کا) اعتراض کیا ہے، کیونکہ وہ یہ بات تو مان ہی نہیں سکتے کہ فائل میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ زمین پر سرے سے ہے ہی نہیں۔ مگر عملاً ہوتا یہی ہے۔

یہ فائلوں کی بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ہمارے ایک مرکزی وزیر جو اپنے علم وفضل کے باوجود ملازمانہ ذہن رکھتے تھے، میری ان کے ساتھ ایک معاملہ میں تلخی ہو رہی تھی۔ میں کہتا تھا کہ ان کی اطلاعات درست نہیں ہیں، ان کی تحقیقات کرانے کی ضرورت ہے۔مگر انھوں نے آخر میں ایک فائل کی طرف اشارہ کر کے کہا ''مجھے حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، میرے لیے تو جو کچھ اس فائل میں ہے، وہی حتمی ہے''۔

ملازمین کے ہاتھوں منصوبہ بندی:

پھر ایک فرق یہ بھی ہونا چاہیئے کہ ملازمین کی سوچ، ان کی تعلیم و تربیت کے دائرے کے اندر ہی ہو، جب کہ سیاست دانوں یا لیڈروں کی سوچ کے تقاضے اور حدود بدر جہا زیادہ وسیع ہوں اور یہی ملک کے مفادات کا تقاضا ہے۔ ملازمین کا کسی ملک کی منصوبہ بندی کرنا اس طرح ہے۔ گویا ایک محدود کو وسیع پر نافذ کیا جائے۔ اس میں یہ قباحت بھی ناگزیر ہے کہ جب ملازمین خود ہی اصل کی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور اس پر عملدار آمد بھی خود ہی کرتے ہیں اور وہ لامحالہ انھوں نے ہی کرنا ہوتا ہے تو پھر نگرانی اور محاسبہ جو کسی بھی بہتر نتیجے کیلئے ناگزیر امر ہے، سرے سے مفقود ہو جاتا ہے اور من مانی کرنا روزمرہ کا معمول ہو جاتا ہے، جس کی مثال اس دور سے زیادہ شاید کبھی میسر آئے۔ جب ایسا دور شروع ہو جائے تو پھر ایسے ملک میں جہاں ایک طرف تیزی سے ملازموں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور دوسری طرف ان لوگوں کی صحیح تربیت کا نہ تو کوئی بندوبست ہے نہ اس کی ضرورت ہی کا احساس، تو یہ من مانی جو خود بھی ایک خطرناک فعل ہے، ان حضرات کے ہاتھ آ جاتی ہے جن کا علم و تربیت سب ہی کچھ ناقص ہوتے ہیں۔ اندازہ کر لیجیئے کہ اس نقارخانے میں ترتیب دی ہوئی منصوبہ بندی کیا ہو گی اور اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ ویسے بھی اگر یہ سب معاملات درست بھی ہوں تب بھی سرکاری ملازمین اس کام کو کسی صورت بھی کما حقہ نہیں کر سکتے، لیکن اس پر مزید افراتفری بھی ہو تو یہ اور بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

غیر ملکی ماہرین کی منصوبہ بندی کی حیثیت:

اس میں ایک آخری اور سب سے خطرناک قباحت یہ ہے کہ ہمیں ہر بات میں غیر ملکی ماہرین کی اعانت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ یہ غیر ملکی ماہرین اولاً تو ہماری ضروریات سے واقف ہی نہیں ہوتے، نہ یہ ان کا دردسر ہے۔ لیکن اس سے بدتر یہ کہ اکثر و بیشتر ماہرین کو باقاعدہ طور پر تربیت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے فن سے کس طرح مسلمانوں کی تباہی اور اپنے ملک کا فائدہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ ایک خاص شعبے میں منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی تباہی کی منصوبہ بندی کرنے میں بھی ماہر ہوتے ہیں۔ ہر کام میں اسی مقصد کو بہر صورت سامنے رکھتے ہیں۔ چنانچہ جگہ جگہ اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسی مسلمان ریاستیں موجود ہیں جو غیر ملکی ماہرین کی منصوبہ بندی کے نتیجے میں دیوالیہ ہوگئیں۔ جس کی ایک واضح مثال یوں سمجھیں کہ شارجہ کے سلطان نے غیر ملکی ماہرین کو منصوبہ بندی کیلئے بلوایا، انھوں نے بڑی بڑی کئی منزل عمارتیں تجویز کیں اور بنوا دیں۔ لیکن نہ صرف وہی اب تک بیکار پڑی خراب ہو رہی ہیں بلکہ الٹا مرمت کیلئے کروڑوں روپے کی محتاج ہیں۔ اس طرح ان ماہرین نے شارجہ کے سلطان کو دیوالیہ کر دیا اور وہ اپنے ہمسائے کے پاس کچھ علاقہ فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ خود سعودی عرب جیسی ریاست محض اس لیے ابھی چل رہی ہے کہ اس کے پاس پیسہ وافر ہے، جس کو یہ ماہرین ابھی تک ختم نہیں کر سکے۔ اس غلط منصوبہ بندی کی وجہ سے سعودی عرب میں جو روپیہ محض ضائع ہو رہا ہے اور جس کو ایک سرسری نظر سے ہی دیکھا جا سکتا ہے، اس سے ایک پورے ملک کا نظام چل سکتا ہے۔ خود اب تو ہمارے اپنے ماہرین بھی خدا کے فضل سے انہی غیر ملکی ماہرین کے جانشین ہیں، اگر چہ نیتیں شاید سب کی وہ نہیں ہیں مگر تربیت و تعلیم انہی لوگوں کے ذریعے ملی ہے۔ اس تمام منصوبہ بندی کو جو ''نقد'' فائدہ ہوا، وہ یہ کہ ہم روز بروز قرضوں کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں۔ اگر محض حادثہ سے بعض علاقوں میں تیل نہ نکل آتا تو ہمارا جو حشر ہوتا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

صحیح اندازِ فکر:

ترقی و تعمیر کا اصل موضوع تو درحقیقت علم ہے، خود پروردگار عالم نے بھی سیدنا آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد علم سے ہی ان کو نوازا۔ اگرچہ وہ بہت وضاحت طلب ہے کسی چیز کا علم، کس درجے کا علم وغیرہ۔ تاہم اس وقت ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کے حوالے سے ملکی و قومی ترقی و تعمیر کا معاملہ دو بنیادی امور سے شروع ہوتا ہے، ضروریات کا تعین، اور ان کے حصول کیلئے مناسب منصوبہ بندی۔ اس کے ساتھ اور دو امور بھی اہم ہیں اہداف اور ترجیحات۔ یہی وہ چار امور ہیں جن پر ترقی و تعمیر کا پورا انحصار ہے، اگر ان میں سے ایک بھی ساقط ہو جائے یا آگے پیچھے ہو جائے تو تعمیر و ترقی کے نام پر کی جانیوالی تمام مشق محض ایک کباڑ خانہ بن کر رہ جاتی ہے، جیسا کہ ہم اپنے ملک میں دیکھ رہے ہیں۔ اس کا دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ضائع ہونے والی رقم اور محنت دونوں کا ہی تناسب بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ترقی و تعمیر کا یہ عمل ناکارہ اور بے نتیجہ (Counter Productive) ہو کر بالکل غیر مفید ہو جاتا ہے، اس کو قائم رکھا جا سکتا ہے نہ ترک کیا جا سکتا ہے۔

ضروریات کا تعین و ترجیحات:

اس پورے عمل کا دارومدار چونکہ ضروریات کے تعین پر ہے، اس لیے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون کرے۔ یہی وہ تنگ گھاٹی ہے، جہاں پہنچ کر ہم دم بخود ہو جاتے ہیں۔ اس کا تعین کرنے کیلئے تین فریق ہو سکتے ہیں، سیاست دان، ملازمین اور غیر ملکی ماہرین۔ ملازمین اور غیر ملکی ماہرین جو کرتے ہیں اور جو کر رہے ہیں اس کا اجمالی سا ذکر میں کر چکا ہوں۔ سیاست دان بھی بدقسمتی سے اس ضمن میں مکمل طور پر ناکام رہے ہیں، بلکہ میری معلومات کی حد تک تو ہماری سوچ ہی سرے سے اس طرف نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو وہ بعض سیاسی مصلحتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے کی غماز ہے، اگر ہماری ملکی سیاست اور اس کے تقاضے محض حصول اقتدار کے گرد گھومتے ہوں تو اس طرح گویا ملک اور عوام دونوں ہی اس سیاسی مشق کے

تختہ مشق بن جاتے ہیں۔

ضروریات کا تعین کوئی معمولی کام نہیں ہے، دراصل سب سے بڑا کام یہی ہے۔ سب سے زیادہ محنت اور فکر کا طلب گار بھی یہی ہے، لیکن اس پر سب سے کم محنت کی جاتی ہے۔ میں نے ملک بھر میں گھوم پھر کر دیکھا ہے کہ ہم حالات کے دھارے پر بے مہار بہے جا رہے ہیں، زندگی کے کسی شعبے میں ضروریات کا تعین ہے نہ منصوبہ بندی۔ ضروریات کا تعین ظاہر ہے کہ ملک کے اپنے حالات اور تقاضوں کے مطابق ہو گا، یعنی اس تعین کا کلی دارومدار اس ایک اہم ترین امر پر ہے کہ اس ملک کے عوام کی موجودہ حالت اصل میں کیا ہے اور اس میں کیا تبدیلی مطلوب ہے۔ یہ کام کوئی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ سرکاری ملازم کبھی بھی نہیں کر سکتا، خاص طور پر ایسے ماحول میں جہاں ملازمت کا مقصد محض منفعت حاصل کرنا ہو اور مشنری جذبہ سرے سے مفقود ہو۔

جو ملک مدتوں سے آزاد چلے آ رہے ہیں ان کے مقابلے میں وہ ملک جو غلامی سے آزاد ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں، ان کی بعض بنیادی ضروریات زائد ہیں اور مختلف بھی، لیکن ہمارے ہاں جو لوگ ان کی ضروریات کو متعین کرنے والے سمجھے جاتے ہیں، ان کی تعلیم و تربیت آزاد ملکوں میں ہوئی ہوتی ہے اور وہ وہی سہانے خواب دیکھ رہے ہوتے ہیں جو کبھی پورے نہیں ہو پاتے۔ ہمارے سیاست دان بھی اکثر و بیشتر وہی حضرات ہیں کہ ان کے اور عوام کے مابین زمین و آسمان کا فرق ہے۔ انگریز تو دور رہ کر بھی قریب تھا مگر ہمارے راہنما قریب رہ کر بھی دور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کروڑوں اور اربوں روپے جو ترقی کے نام پر صرف ہوتے ہیں، ان سے اطمینان کی بجائے بے اطمینانی بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ اس مصرف کا تعین عوام کی ضروریات کے مطابق نہیں ہے۔ جو امریکہ ہو آتا ہے، وہ اپنے ہاں امریکہ بنانا چاہتا ہے، وہ بھی امریکہ کا کوئی گاؤں نہیں، بلکہ نیویارک اور واشنگٹن، جو لندن سے ہو آتا ہے، وہ یہاں بھی لندن بنانا چاہتا ہے۔ اگر محض سرکاری عمارتوں کو ہی لے لیں جن پر

اربوں روپے اس غریب اور ترقی پذیر ملک کے صرف ہو رہے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ہم یہ کیا کر رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے، محض اس لیے کہ ضرورت کا صحیح تعین کرنے والا نہ کوئی فرد ہے نہ ہی کوئی ادارہ۔

حکومت جب کسی انجینئر سے کہے گی کہ کوئی عمارت تعمیر کرنا ہے تو وہ امریکہ یا یورپ سے تعلیم یافتہ آرکیٹیکٹ سے دریافت کرے گا، پھر اگر اس کا بس لگا تو وہ کسی عزیز کو تلاش کرے گا خواہ اسے اس کا سرے سے کچھ علم نہ ہو، وہ نہ ہوا تو پھر مفادات میں اشتراک کرے گا۔ اس طرح سب سے قیمتی لیکن بے مقصد منصوبہ بنا لائے گا اور غلامانہ ذہنیت اسے صرف قیمتی سمجھ کر قبول کر لے گی۔ بالکل وہی کچھ جو آج کل مارکیٹ میں ہو رہا ہے، وہی چیز جو عام بازار میں سستی ملتی ہے وہ چھوڑ کر ہمارے لوگ اپنی جھوٹی اور غلامانہ انا کی تسکین کیلئے کسی دوسری جگہ سے اس کو کئی گنا قیمت پر خوشی سے خرید لیتے ہیں، خاص طور پر ہماری خواتین تو اس معاملہ میں لاثانی ہیں۔ کئی دکانداروں سے پوچھا کہ آپ لوگ یہ ظلم کیوں کرتے ہیں تو انھوں نے صاف طور پر یہ کہا کہ صاحب! آپ دیکھ لیں کہ یہی چیز سستی تھی تو خریداری کم تھی، اسی کو ہم نے مہنگا کر دیا تو آپ دیکھیں کہ کیسے زوروں پر فروخت ہو رہی ہے۔

یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ جب عمارت ہماری ضروریات کے تقاضوں اور دوسرے جغرافیائی اور موسمی تقاضوں کے مطابق نہیں ہوتی تو وہ محض سفید ہاتھی بن کر رہ جاتے ہیں، اس پر زندگی بھر اضافی صرف کیے بغیر چارہ ہی نہیں رہتا، جب کی اس کی افادیت اس اضافی مصرف کی بہ نسبت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ اس طرح ہمارے ہاں لاگت اور افادیت میں کوئی تناسب موجود ہے نہ اس کا تعین کرنے والا کوئی ہے۔

ہمارے ملک کی تعمیر و ترقی کی ضروریات کیا ہیں؟ ان کا تعین کرنے کیلئے ہمیں سب سے پہلے تو اس امر کا جائزہ لینا چاہیئے کہ وہ کیا نقائص ہیں جو غلامی نے چھوڑے ہیں جن کو دور کیے بغیر ہم ایک آزاد قوم ہرگز نہیں بن سکتے۔ یہی ایک جائزہ نہایت مشکل کام ہے اور کوئی

سرکاری ملازم جو سابقہ مالک کے ترتیب دیئے ہوئے نظم پر چل رہا ہے، یہ کام کرنا تو درکنار سوچ بھی نہیں سکتا۔ تعمیر و ترقی محض سڑکیں اور پل بننے کا کام نہیں ہے، یہ تو ایک قوم بنانے کا کام ہے۔ غلامی بجائے خود کچھ خرابیاں اپنے اندر رکھتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں تو انگریز نے بڑے حکمیانہ طریقے سے ایسی خرابیاں پیدا کی ہیں جو ہماری قومی زندگی میں گوشت پوست بن گئی ہیں اور نسل در نسل منتقل ہو رہی ہیں۔ ہمارے اخلاق، عادات اور معاملات سب کے سب اس زہر قاتل سے مسموم ہیں اور اب چالیس سال ہونے کو ہیں، مگر ہم اپنے قومی تشخص کے کہیں قریب بھی نہیں ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ ہماری قومی زندگی کی خرابیاں کیا ہیں جو ہمیں ورثہ میں ملی ہیں اور ہماری قومی زندگی کیسی ہونی چاہیئے، اس کا کوئی واضح تعین ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔

غلامی کی لعنتیں اور قومی ضرورتیں:

میں نے اپنی صدارت کے دور میں کوشش کی تھی کہ اساتذہ کو بالخصوص اور طلبہ کو بالعموم یہ سوچنے پر لگایا جائے کہ ہمیں اپنی قومی زندگی میں اولین ضرورت کس بات کی ہے؟ لیکن اس کا وقت نہ مل سکا۔ مجھے بھٹو صاحب کے ساتھ بھی اس معاملہ میں تفصیلی گفتگو کا موقع ملا تھا۔ غلامی کی لعنتیں کوئی ایک دو نہیں، مگر ان میں بڑی بڑی تقریباً یہ ہیں:

خود اعتمادی کا فقدان، جھوٹ، فریب، مجرمانہ خود غرضی، آقا کی بری عادتوں کی نقل، بڑائی کا معیار روپیہ پیسہ اور مرتبہ، معاملات میں دھوکہ، زر و مال و مرتبہ کی بے لگام اندھا دھند ہوس اور ہمارے ہاں مذہبی معاملات کو ذاتی اور شخصی امر سمجھنا۔ آج ہماری قوم کس طرح ان سب کا شکار ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ جب تک ان خرابیوں کو ضروری حد تک دور نہیں کیا جاتا، جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہ بالآخر ہمارے لیے وبال جان ہی بن سکتا ہے، ہم بلا واسطہ نہ سہی بالواسطہ غلام ہی رہیں گے۔ ان خرابیوں کے باعث ہمارے ہاں نہ صرف اپنا قومی سرمایہ بھاری قرضوں کے سود میں ضائع ہو رہا ہے، سرمایہ اور وقت شاید ہی کسی دوسری جگہ اس قدر ضائع ہوتے ہیں۔

ضروریات کے تعین کے بارے میں یہ چند جملے محض نشاندہی کے لیے لکھے ہیں۔

قومی ضروریات کے تعین میں ان مذکورہ بالا امور کے علاوہ ایک اور بڑی ہی بنیادی ضرورت ہے قومی وملی یک جہتی، یہ ضرورت اس لیے بے حد اہم ہے کہ ایک تو ہماری جغرافیائی اور ثقافتی ترکیب ایسی ہے کہ یہ معاملہ ہماری قومی زندگی کا ایک مستقل حل طلب مسئلہ ہے، ابن خلدوں نے بھی اپنے مقدمہ میں ایسے ملک کی ان مشکلات کا ذکر کیا ہے جو متفرق ومختلف زبانوں، ثقافتوں اور تمدنوں پر مشتمل ہو، دوسرے اس لیے بھی اہم ہے کہ انگریز نے بڑی حکمت عملی کے ساتھ اس تفریق کو مزید تقویت دی ہے۔ یوں بھی تقسیم تک ہی نہیں چھوڑا بلکہ ہمارے مذہبی اور فقہی اختلاف کو بھی حتی المقدور ہوا دی۔ اس پر بھی اکتفا کیا بلکہ ایک نیا مذہب ہی پیدا کر دیا، اس لیے ہمارے ہاں قومی یک جہتی کا مسئلہ ہماری زندگی کا اولین مسئلہ ہے۔

قومی یک جہتی:

بدنصیبی دیکھیئے کہ یہی وہ مسئلہ ہے جس پر اس قدر اہمیت کے باوجود ہماری کوئی توجہ ہے نہ کوئی باقاعدہ منصوبہ بندی۔ چنانچہ آج ہم انتشار کی جس حالت میں ہیں، اس کا بڑا سبب یہی ہے۔ ہماری اندرونی کمزوری میں جہاں سیاسی انتشار کا بڑا ہاتھ ہے وہاں قومی یک جہتی کا نہ ہونا بھی اہم سبب ہے۔ اگر کوئی شخص، جماعت یا حکومت اس کو فرض اولین سمجھ کر اس پر کارروائی کرے گی تو اسے ان تمام عوامل اور عناصر کا احاطہ کرنا ہوگا جو اس مشق میں شریک بلکہ اس کے فریق ہیں۔ اس لیے یہ موضوع خود ایک پورے مقالے بلکہ کئی مقالوں کا تقاضا کرتا ہے۔ اس میں قومی وملی زندگی کا ہر شعبہ شامل ہے اور ہر ایک سمت درست کرنے کی ضرورت ہے اس وقت تو محض ایک بنیادی امر کی نشاندہی ہی مقصود ہے، تفصیل اور تشریح نہیں۔

کچھ عرصہ پہلے ہمارے ایک نامور، صحافی الطاف حسن صاحب نے قومی یک جہتی کے نام سے لاہور میں ایک سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ وہ اگرچہ ایک ابتدائی کوشش تھی، مگر اس سے اس موضوع کو سمجھنے میں کافی مدد ملی۔ اس کام کیلئے تو حکومت کی سطح پر کسی ایسے مستقل

ادارے کی ضرورت ہے جو ملک کے سب سے اعلیٰ دل و دماغ رکھنے والے حضرات پر مشتمل ہو اور ہمہ وقت اسی کام کیلئے وقف ہو، تب کہیں برسہا برس کی محنت سے اس میں کوئی قابل ذکر کامیابی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

قومی تقاضے اور منصوبہ بندی:

اب اسی طرح چند جملے منصوبہ بندی کے بارے میں بھی گوش گزار ہیں۔ منصوبہ بندی سے مختصراً مراد یہ ہے کہ ان ضروریات کو جن کا تعین کر دیا گیا ہو، ایک ترتیب اور ترجیحات کے مطابق پورا کرنے کا طریقہ کار طے کیا جائے۔ اب اس کام میں بھی وہی دو طبقے ہیں، ملازمین اور سیاست دان۔ ملازمین کو منصوبہ بندی کا کام جب بھی سپرد ہو گا، وہ صرف اپنے اپنے شعبوں اور محکموں پر ہی کارروائی کریں گے اور ریسرچ افسروں کی رپورٹوں پر پورے ملک کی، منصوبہ بندی کی جائے اور اگر ان تمام محکموں کا کارروائی میں قومی و ملکی نظر سے ربط اور توازن نہ ہو گا تو یہ سب کارروائی ایک مقام پر پہنچ کر بے قابو ہو جائے گی اور بجائے ایک رخ اختیار کرنے کے ہر ایک کا رخ دوسری طرف ہو گا۔

میں کچھ عرصہ پہلے کوئٹہ گیا تو معلوم ہوا کہ لاکھوں روپے کی لاگت سے شہر میں ایک سرکاری پولٹری فارم بن رہا ہے۔ یہ پولٹری فارم خسارہ کا منصوبہ ہے اور بالآخر سرکاری ملازمین کو سستے داموں انڈے مرغی مہیا کرنے کے سوا اس کا کچھ کام نہیں ہے۔ جب کہ قومی ضرورت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بے شمار دوسرے ایسے منصوبے ہیں، جو عوامی مفاد میں ہیں اور اس روپے سے ان کو شروع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سرکاری ملازمین کی تو یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ مجموعی مفاد کیا ہے، وہ تو اپنے محکمہ سے متعلق امور پر ہی کام کریں گے۔ اسی طرح ہمارے محکمہ تعمیرات عامہ کو کسی عمارت، پل یا سڑک کے بارے میں کہا جائے گا تو وہ ایسی منصوبہ بندی کریں گے جس میں اولاً تو اس بات کا خاص خیال رکھا جائے گا کہ جو رقم محکمہ کے ملازمین کا پیدائشی حق ہے اس کا تناسب کس طرح زیادہ سے زیادہ ہو اور وہ آسانی سے نکل سکتی ہو۔ میں

ملک بھر میں گھومتا پھرتا رہتا ہوں۔ مجھے ابھی ایسی عمارت وغیرہ دیکھنا ہے جو ملک کے عوام کی ضروریات اور ملکی آب و ہوا اور ماحول کے مطابق ہو۔ مگر یہ ان انجینئروں کا ہی قصور نہیں ہے، ان کو تو کوئی بتانے والا ہے ہی نہیں کہ کیا کریں؟

اس کی ایک بہت واضح مثال یہ دیکھئے کہ ہمارے ہاں آزاد کشمیر میں بعض انتہائی سرد اور برفانی علاقوں میں بھی پتھر اور سیمنٹ اور ٹین کی چادروں ہی سے تمام سرکاری عمارتیں بنائی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب اجزاء سردی میں اضافہ کرتے ہیں اور نا قابل استعمال ہو جاتے ہیں، لیکن اگر کسی انجینئر یا حکمران کو احساس کمتری نہ ہوتا تو وہاں کے اصل رہنے سہنے والوں کا اندازہ لگا کر کم قیمت پر صحیح کام ہوسکتا ہے۔ اسی رقم میں جو ایک عمارت پر صرف ہوتی ہے اور عمارت بھی بے کار ہو جاتی ہے، زیادہ نہیں تو دو عمارتیں بھی بن سکتی ہیں، دیکھئے کیسے بجائے پکے پتھر اور سیمنٹ کے اگر کچا پتھر اور گارا استعمال کیا جائے اور اوپر ٹین ڈال دی جائے تو نہ صرف قیمت کم صرف ہوتی ہے بلکہ وہ عمارت سردی گرمی دونوں میں بلا تکلف استعمال ہو سکتی ہے۔ پھر سیمنٹ مہیا کرنا اور پہاڑوں پر لے جانا جس قدر خرچ کا محتاج ہے، اس کا اندازہ کیجئے۔

اسی طرح سکولوں کی عمارتوں کیلئے آزاد حکومت نے رقم کا ایک میعار مقرر کر رکھا ہے۔ مڈل سکول کیلئے اتنی رقم اور ہائی سکول کیلئے اتنی رقم، لیکن کمال دیکھئے کہ جو سکول مظفر آباد یا دوسرے ضلعی ہیڈ کوارٹروں کے قریب ہیں اور شاہراہ عام پر یا ویسے لب سڑک ہیں ان کی لاگت بھی وہی ہے اور جو ضلعی ہیڈ کوارٹر سے میلوں دور ہیں بلکہ سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہیں، ان کی لاگت بھی وہی ہے۔ کوئی اندازہ کر سکتا ہے ایسی منصوبہ بندی کا، بعض مقامات پر صرف سیمنٹ ریت اور چادروں کی ڈھلائی پر ہی نصف سے زائد رقم خرچ ہو جاتی ہے، مگر حکومت اس میں کوئی ردوبدل نہیں کر سکتی، وہ بے چاری سکھا شاہی یوں ہی بد نام تھی۔ اس کا نتیجہ؟ وہ عمارتیں بن تو جاتی ہیں مگر کون نہیں جانتا کہ وہ نہ بننے سے بھی بدتر ہوں گی، ان کی

مرمت اور خرابی دور کرنے پر پوری عمر لگے گی۔ جب مسئولین یہ دیکھتے ہیں تو اس گناہ پر چشم پوشی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ چشم پوشی پھر رشوت ستانی اور بدیانتی کو خودبخود جنم دیتی ہے۔ یہی حشر ہر محکمہ کی منصوبہ بندی کا ہے۔ اگر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ہر محکمہ کا رخ ایک دوسرے کی مخالف سمت میں ہے اور کبھی بھی کوئی مرکزی مقام یا نقطہ اتصال نہیں آئے گا اور اگر ایسا نہیں ہو گا تو یہ محکمے بجائے ایک کل کے اجزاء ہونے کے خودبخود ایک کل اور علیحدہ مملکت خداداد بن جائیں گے۔ نہ ملک کا تصور نا قوم کا۔

ماہرین اور قومی نقصان:

ہمارے ہاں یہ مرض بھی لادوا ہوتا جا رہا ہے کہ فلاں بات چونکہ ایک ماہر نے کہی ہے، اس لیے باقی قوم پر لازم ہے کہ وہ احمقوں کی طرح آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر لے، گویا الہامی حکم ہے۔ ہمارے ہاں الہامی احکام میں تو میخ نکالنا جائز ہے، مگر ایک ماہر کی بات پر اعتراض نہیں ہوسکتا، خاص کر وہ ماہر جو یورپ کے کسی ملک سے آیا ہو۔ کئی معاملات میں تو ماہرین بھی ہنستے ہوں گے کہ یہ کیسی احمق قوم ہمیں ملی ہے۔ میرے اپنے تجربے کی مثالوں سے دو مثالیں دیکھیئے۔ انتخابی مہم کے دوران میں نے ایک پل کا وعدہ کیا تھا، جب وہ لگ گیا تو وہ صرف چھوٹی گاڑی کے لیے مفید تھا، اس لیے اس کی صحیح افادیت نہیں تھی اور وعدہ بھی پورا نہ ہوتا تھا، میں نے خود اس پُل کو دیکھا اور اندازہ کیا کہ کیا کیا جائے، میرے خیال میں اس پُل کو مزید تقویت دے کر بڑی گاڑیوں کے لیے تیار کیا جا سکتا تھا۔ میں نے انجینئر سے پوچھا تو اس کے خیال میں ایسا کرنا ممکن نہیں تھا، بلکہ اس پل کو اکھاڑ کر نیا بنانا ہو گا۔ جس پر اتنی لاگت آئے گی وغیرہ۔ بالکل وہی نو من تیل اور رادھا والی بات تھی۔ میں نے ان صاحب کو کہا ''پندرہ دن کے اندر آ کر بتاؤ کہ یہی پل ٹھیک ہوسکتا ہے کہ نہیں، اگر نہیں ہوسکتا تو آپ اپنا استعفیٰ ساتھ لائیں میں کسی دوسرے انجینئر سے درست کراؤں گا''۔ وہی صاحب دس دن بعد آئے اور کہنے لگے یہی درست ہوسکتا ہے۔ چنانچہ معمولی سے خرچ سے اسی کو تقویت دی گئی

اور وہ پل بفضلہٖ الٰہی آج تک کام کر رہا ہے۔

دوسری بات دیکھیے۔ ہماری ایک بڑی سڑک ایک جگہ سے بہہ گئی، انجینئر صاحبان نے کہا کہ اس متاثرہ مقام کو کسی صورت درست نہیں کیا جا سکتا، اس لیے متبادل راستہ بنایا جائے۔ چنانچہ کافی لمبا راستہ بنایا گیا جس کی وجہ سے زرخیز زمینیں تباہ ہوئیں اور بے شمار روپیہ معاوضہ کی صورت میں علیحدہ ادا کرنا پڑا، مگر جلد ہی وہ سڑک بھی اسی سلائیڈ سے متاثر ہونے لگی۔ پھر ایک دوسرے انجینئر نے بتایا کہ اس کا علاج وہی پرانا راستہ ہے جس کے بارے میں پہلا انجینئر ناممکنات کا فتویٰ دے چکا تھا۔ چنانچہ معمولی سے خرچ کے بعد اسی پرانے راستہ کو درست کیا گیا، جو آج تک چل رہا ہے، جبکہ وہ متبادل راستہ سرے سے ہی ختم ہی ہو گیا۔ یہ کئی کروڑ روپے کا اس غریب ملک کا نقصان اس لیے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ ایک ماہر نے جو رائے دی تھی۔ اگر سیاستدان کسی کو سو روپیہ کی امداد دے دیں تو وہ قومی مجرم ٹھہرائے جاتے ہیں۔ ان ماہرین نے اس ملک کو تباہ کر دیا مگر وہ بدستور قابل اعتماد ماہر کے ماہر ہی رہے۔

سرکاری اہلکاروں کی خیانت:

ضمناً ایک اور تجربہ بھی عرض کر دوں۔ ہماری منتخب حکومت اور اس کے منشور کی وجہ سے بجٹ میں کافی رقم مزید درکار تھی، مگر اس کا کوئی فوری ذریعہ نہیں تھا۔ میں نے انکم ٹیکس وغیرہ کے انچارج کو بلایا اور وصولی میں اضافہ کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ پورا زور لگائیں گے تو محض پانچ دس ہزار روپے کا اضافہ کر سکتے ہیں، میرا مطالبہ لاکھوں میں تھا۔ جب بات ان کی سمجھ میں نہ آئی تو میں نے کہا ''دیکھیے میں امریکہ سے نہیں آیا، اسی ملک کا رہنے والا ہوں۔ میرے اندازے میں آپ کا محکمہ کم از کم دو کروڑ روپے سالانہ خود کھا جاتا ہے۔ اس سال آپ کو نصف کھانے کی اجازت ہے، نصف مجھے دیں''۔ چنانچہ اس سال ہمیں ایک کروڑ روپیہ زیادہ ملا، اور کسی ٹیکس دہندہ پر مزید کوئی بوجھ نہیں پڑا۔ پھر دوسرے سال اس کا نصف اور تیسرے سال میں خود ہی صدر نہ رہا۔

بعض لوگ جن کی ذمہ داری کچھ نہیں، وہ یہ جملے پڑھ کر فوراً فتوی دیں گے کہ دیکھیئے سردار عبدالقیوم نے اس محکمہ کو ایک کروڑ روپیہ خرد برد کرنے کی اجازت دے دی، یہ کتنا بڑا جرم ہے۔ بات دراصل ہماری یہ ہے کہ ہمارے ملکی معاملات میں بھی ایک باریک انتظامی نکتہ ہے جس پر کسی نہ کسی وجہ سے توجہ نہیں دی جاتی یا اسے سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا جاتا، مثلاً یہ کہ حکمران کبھی تسلیم نہیں کریں گے کہ ان کی حکومت میں اس طرح کی کوئی خامی ہے اول تو ان کو کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا، اس لیے وہ انکار کرنے میں سچے ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر معلوم ہو بھی تو علاج میں بے بسی اور نا اہلی پر بہر حال انکار ہی کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔

اس میں تنہا ہم لوگ ہی نہیں، کئی دوسری اقوام اور ممالک بھی ایسے ہیں کہ جو کچھ بیماریوں کا علاج کرنے سے عاجز آ گئے تو ان بیماریوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ ہمارے ہاں بھی بعض بیماریاں ایسی ہیں جن کا علاج شاید ممکن نہیں ہے۔ ہم محض خیالی دنیا میں یہ سمجھتے رہیں کہ علاج نہیں ہو سکتا یا سرے سے بیماری ہی کو تسلیم نہ کریں، تو یہ خود فریبی ہے اور اس سے مرض بڑھتا جائے گا۔ میرے لیے دو ہی راستے تھے، میں محکمہ میں سختی کرتا اور بالآخر تلخی اور پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا، ہمارے کام بھی سب ادھورے پڑے رہتے یا میں یہ راستہ اختیار کرتا جس سے ڈیڑھ کروڑ روپے کی خطیر رقم تو حاصل ہو گئی۔ عقلمند لوگوں نے کہا کہ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی یا ایک اور برمحل محاورہ ہے کہ ''جب سارا دھن جاتا دیکھیئے تو آدھا دیجیئے بانٹ''۔ لیکن میں تو اس طریقہ سے ان شاء اللہ سارا دھن ہی وصول کر لیتا، ورنہ اس کی کوئی دوسری صورت نہیں تھی۔

آج پاکستان میں جس قدر سمگلنگ ہوتی ہے اور جس قدر خرد برد کرتے ہیں وہ رقم کسی صورت بھی ملک کی مجموعی آمدنی سے کئی گنا زیادہ ہے، کم نہیں ہے، لیکن اس کی وصولی یا برآمدگی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ جس کا دوسرا برا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت اس خسارے کو پورا کرنے کیلئے غریب عوام پر ٹیکس کا بوجھ بڑھاتی رہتی ہے اور پورے ملک کی معیشت متاثر ہوتی

ہے۔

رہائشی سہولتوں میں ناروا تفاوت:

منصوبہ بندی کا ایک اور نقص دیکھیئے کہ ملازمین کیلئے جو سرکاری عمارتیں ہیں ان کا اصول یہ ہے کہ جتنا بڑا ملازم ہے اس کیلئے اتنا ہی بڑا اور قیمتی مکان بنایا جاتا ہے۔ غیر ملکی حکمرانوں کی اگر یہ ضرورت تھی تو سمجھ میں آ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی فوقیت ہر معاملہ میں قائم رکھنا چاہتے تھے اور فوقیت کا معیار اور امتیاز بھی وہی تھا، مکان بڑا، بڑی گاڑی اور کروفر ہو۔ لیکن اب تو یہ معیار بھی بدل جانا چاہیئے تھا۔ گویا ہمارے ہاں ضرورت اس بات کی ہے جس کی جس قدر جائز ضرورت ہے اس کے مطابق مکانیت مہیا کی جائے۔ اتفاق یہ ہے کہ جتنا چھوٹا ملازم ہے اسکی بیوی بچے بھی اتنے ہی زیادہ ہیں اور مکانیت کی اس کی ضرورت بھی اسی قدر زیادہ ہے۔ چاہیئے تو یہ کہ چھوٹے ملازمین کو بڑے مکان ملیں، کیونکہ ایک تو ان کی تنخواہ کم ہوتی ہے، دوسرے ان کی ضرورت زیادہ۔ تیسرے یہ کہ یہ فرق آخر مذہبی ہے، انسانی ہے، کیا ہے؟ کہ اب بھی اس کو اس ملک میں روا رکھا جائے۔ خدائے پاک نے اللہ کے حبیب ﷺ نے اس میں کیا معیار مقرر کیا ہے، اگر بدنصیبی سے وہ بھی مدنظر نہ ہو تو کم از کم گردوپیش کے حالات اور طبقاتی کشمکش جو روز بروز ناگزیر ہوتی جا رہی ہے، اس کا لحاظ بھی تو اسی امر کا تقاضا کرتا ہے۔ تاہم اگر چھوٹے ملازمین کو بڑے مکان نہ بھی ملیں تو سب کیلئے یکساں مکانیت تو ہر لحاظ سے ایک قومی ضرورت ہے۔ اس سے نہ صرف طبقاتی کشمکش کو کم کرنے میں مدد ملے گی بلکہ تھوڑے اخراجات سے زیادہ مکانیت مہیا ہو گی اور یہ بات ہمارے جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے ویسے بھی نعمت ہے۔

لیکن جیسا کہ میں کہہ آیا ہوں، یہ بات جس مقام سے ہوسکتی ہے وہیں سے ہوسکتی ہے۔ اگر ملازمین اس کو ترتیب دیں گے تو ظاہر ہے وہ سب سے زیادہ اپنا لحاظ رکھیں گے۔ اس لیے جو منصوبہ بھی ملازمین کے سپرد ہو گا اس کا وہی حشر ہو گا۔ جب تک اوپر بیٹھے ہوئے

افراد کی اپنی سوچ نہیں ہوگی اور وہ سوچ محض واہی تباہی کی نہیں بلکہ با مقصد اور معقول ہو تب تک ملازمین کی برتری سے کوئی چھٹکارا نہیں ہوگا اور اسکے برے نتائج سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

سرکاری افسروں کا احساس کمتری:

یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب میں نے سب ملازمین کیلئے قومی لباس قمیض شلوار کا تعین کیا، جو ان کے مشورے سے کیا تھا، تو بعض بڑے ملازمین نے کہا ''شلوار قمیض پہن کر ہم ڈرائیور اور چپڑاسی دکھائی دیں گے'' میں نے کہا ''اس کا علاج تو آسان ہے۔ آپ شلوار قمیض پہنیں اور چپڑاسی اور ڈرائیور ڈیوٹی کے دوران کوٹ پتلون پہنیں گے''۔ چنانچہ اسی طرح ہوتا رہا۔

رشوت اور دوسری معاشرتی خرابیاں:

یہ سب واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری منصوبہ بندی میں اصل خرابی کیا ہے اور وہ کیسے دور ہوسکتی ہے؟ اگر اس کو دور نہ کیا گیا تو نہ ہماری ترجیحات درست ہوسکتی ہیں نہ اہداف کا صحیح تعین ہوسکتا ہے اور پھر مستزاد یہ کہ رشوت، بدیانتی، نااہلی اور ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کا رجحان روز بروز بڑھتا رہے گا۔

اسی منصوبہ بندی میں مثلاً ایک اہم مرض، جس کا علاج اولین ضرورت ہے، اور جو اپنے علاوہ کئی دوسرے مہلک امراض کو بھی جنم دیتا رہتا ہے وہ رشوت ستانی ہے۔ ہر حکومت نے بظاہر اس کو دور کرنے کی کوشش کی، لیکن مصیبت وہی ہے کہ سرکاری ملازمین جو رشوت ستانی کے مرتکب ہوتے ہیں، ان ہی سے علاج کی توقع کی جاتی ہے۔'' میر بیمار ہوئے جس کے سبب، اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں'' والی بات ہے۔ چنانچہ انھوں نے انسداد رشوت ستانی کا محکمہ قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ جو لاکھوں روپے کے صرف سے قائم کر دیا گیا،

لیکن ''وہی قاتل، وہی شاہد، وہی منصف ٹھہرے'' والی بات ہو گئی۔

رشوت ستانی نہ صرف کئی گنا بڑھ گئی بلکہ اس کو قانونی تحفظ بھی مہیا ہو گیا۔ ایک اضافہ یہ ہو گیا کہ پہلے تو صرف عوام ہی رشوت دیتے تھے، اب خود ملازمین کو بھی رشوت دینا پڑتی ہے۔ اس کا علاج ہر زمانے میں ایک ہی تھا، خواہ وہ خلافت راشدہ کا دور مبارک ہو یا کسی غیر مسلم کا اچھا دور حکومت ہو، اور وہ محض یہ ہے کہ عوام الناس ہی کو بالواسطہ یا بلا واسطہ حکمران سمجھا جائے۔ ہمارے ہاں عوام الناس کو محکوم سمجھا جاتا ہے جس طرح انگریز کے دور میں تھا، کسی کالے کی شکایت گورے کے خلاف نہیں سنی جا سکتی تھی، اسی طرح آج بھی ہماری نوکر شاہی کے نظام میں عوام الناس کو حق نہیں ہے کہ وہ کسی افسر کے خلاف شکایت کریں۔ الغرض یہ کہ اگر رشوت ستانی کی ناسور اور سرطان کا علاج کرنا ہے تو پھر عوامی قوت محاسبہ واحد علاج ہے، دوسرے تمام علاج اس مرض کو مزید تقویت پہنچاتے ہیں۔

نظام احتساب:

عوامی قوت محاسبہ کے فلسفہ پر بھی سرکاری ملازمین خود عمل نہیں کر سکتے، بلکہ اس پر عمل کرنے کیلئے بھی صحیح عوامی نمائندہ چاہیئے اور وہ طریقہ کار چاہیئے جس پر چل کر عوام الناس کی برتری اور ایک قسم کی حاکمیت کو تسلیم کیا جائے، جس طرح سیدنا عمرؓ کی قمیض کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اگر اس جلیل القدر خلیفہ کا محاسبہ ہو سکتا تھا تو پھر کون ایسا ماتحت ہو گا جو خود کو اس سے بری الذمہ سمجھے اور جو جی چاہے کرے۔ اس کے بغیر ہمارے جیسے ملک میں اس مرض کا علاج ممکن نہیں ہے۔ اگر پوری قوم میں اخلاق کا معیار بہت بلند بھی ہو جائے بلکہ ہم فرشتے بھی ہو جائیں تو ہاروت، ماروت کا قصہ بھی معلوم ہے۔ کوئی برائی خود بخود ختم نہیں ہو سکتی، جب تک اسکو ختم کرنے کا مؤثر اور صحیح طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اسلام کے نظام کی خوبیاں گنواتے ہیں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ عوامی قوت محاسبہ کا جتنا اہتمام اس وقت تھا، انسانی تاریخ میں کبھی بھی ایسا نہ تھا۔ یہی خوبی اسلامی نظام کا ایسا طرہ امتیاز تھا جو کسی

دوسرے نظام میں موجود ہی نہیں ہے۔ اسلامی نظام کے دوسرے امتیازات بھی کچھ کم نہ تھے، مگر یہ وہ بنیادی امر ہے جس کو ایک طرح کا نچوڑ اور خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔

عوامی قوت محاسبہ صرف اسی حالت میں بروئے کار لایا جا سکتا ہے کہ حکمران یا سیاست دان دو باتوں پر یقین کامل رکھتے ہوں، ایک تو یہ کہ وہ اپنے ہر عمل کیلئے عوام الناس کے سامنے جواب دہ ہیں، اور یہ جوابدہی محض خیالی نہ ہو، نہ محض اپنے بنائے ہوئے قانون سے بچ نکلنے کے اصول پر ہو بلکہ حقیقی جوابدہی سمجھی جائے۔ اس کا عملی مطلب یہ ہو گا کہ حکومت لوگوں کی خادم ہے، حاکم نہیں ہے۔ یعنی اگر عوام کا کوئی ایک کمزور سے کمزور فرد بھی بڑے سے بڑے ملازم کے خلاف شکایت کرے تو حکومت اس شکایت کنندہ کی حامی ہو، نہ کہ اس ملازم کی، جیسا کہ اس زمانہ میں ہو رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حکمران ان تمام معاملات کیلئے جن کا تعلق کارحکومت سے ہے، اپنے آپ کو مالک حقیقی کے سامنے جوابدہ سمجھے۔ یہ دونوں ہوں تو ''نورٌ علیٰ نورٌ'' لیکن ان کے بغیر عوامی محاسبہ کا تصور نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح پھر ترجیحات اور اہداف کا معاملہ ہے کہ ان کو کیسے طے کیا جائے اور کون کرے۔ یہ بھی ایک پوری سائنس ہے۔ لیکن اول الذکر دو امور اگر اچھی طرح سمجھ آجائیں تو ان دو کا سمجھنا بھی زیادہ مشکل نہیں ہونا چاہیئے۔ سارا ملک اس وقت ایک مصنوعی معاشی خوشحالی سے گزر رہا ہے لیکن جب اصل بات سامنے آئی تو جانے کیا قیامت ہو گی۔

ترجیحی بنیادوں پر منصوبہ بندی:

مسلم کانفرنس کی حکومت کے دوران میں نے کچھ کوشش کی کہ آزاد کشمیر کے لیے ان مذکورہ بالا اصولوں کی بنیاد پر منصوبہ بندی کر دیں اور ایک حد تک مؤثر کام کیا گیا۔ اگر کچھ خارجی مشکلات حائل نہ ہوتیں تو یہ کام اور بہتر ہوتا، اور بعد میں آنے والی حکومتوں کیلئے سہولت ہوتی بشرطیکہ ان کی سوچ بھی وہی ہوتی۔ ہماری ایک مشکل یہ رہی ہے اور یہ ہماری پوری قوم کی مشکل ہے کہ اس کام میں جو دوسرے ساتھی تھے، ان کے ساتھ فکری اشتراک نہیں تھا۔ البتہ

مخالفت نہ ہونے کی سہولت تھی، مگر اس سے کوئی مثبت امداد نہیں مل سکتی۔ یہ ایک بنیادی مشکل ہے۔ کیونکہ نظریاتی کام کسی ایک کے کرنے کا نہیں ہوتا نہ کسی ایک کے بس کا ہوتا ہے۔ دوسری مشکل تھی ماضی کے ناہنگم حالت کی درستی۔ بعینہ جس طرح نیا مکان بنانا آسان ہے مگر پرانا مکان اکھاڑ کر نئی عمارت تعمیر کرنا کئی گنا زیادہ مشکل اور وقت طلب۔ تیسری مشکل تھی مرکزی حکومت کے ساتھ تال میل اور مفاہمت کی کمی، بلکہ ان کی جانب سے مسلسل رکاوٹیں اور ذہنی اختلافات۔

قومی تشخص:

اس کے باوجود چند کاموں کی بنیاد رکھنے میں ہمیں خاصی کامیابی حاصل ہوئی جن میں سے بعض کا ذکر کر چکا ہوں۔ لیکن یہاں بھی کچھ باتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ مثلاً لباس کی تبدیلی، اس کا ایک خاص مقصد ہے۔ منجملہ ان کے ایک بڑا مقصد قومی تشخص ہے۔ پھر قومی زبان کا تعین، یہ بھی ظاہر ہے کہ علاوہ اور باتوں کے قومی سطح پر ایک سمت تعین کرنے کا اولین ذریعہ ہے۔ محنت کی عظمت بحال کرنے کا کام، اس مقصد کیلئے صدر وزراء اور تمام اعلیٰ افسر وقتاً فوقتاً عام مزدوروں کے ساتھ سڑکوں پر اپنے ہاتھ سے کام کریں، کیونکہ اس کے بغیر ناممکن ہے کہ غلامی سے آزاد ہونے والی قوم کے دلوں میں محنت کی عظمت بحال ہو۔ ہمارا غیر ملکی آقا یہاں ہمارے لیے یہ مثال قائم کر گیا کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنا بڑی عظمت اور عزت کی بات ہے۔ مگر ان باتوں کی حکمت صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس کام چوری کو مرض سمجھیں اور اس کی خرابیوں سے آشنا ہوں۔ اسی طرح ہفتے میں ایک بار سرکاری ملازمین کیلئے اپنی اپنی جگہ خود کام کرنے کا اہتمام ہے، اس میں بھی ایک پوری سائنس کارفرما ہے جو مقصد اس سے حاصل کرنا مقصود ہے وہ دوسرے کسی طریقہ سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ ایسے ہی تمام اسکولوں میں صبح کے وقت نظموں کی بجائے قرآن و حدیث کے کلمات کا بلند آواز سے دہرانے کا اہتمام ہے، یہ بھی کوئی محض کار ثواب کیلئے نہیں بلکہ اس لیے کہ انسانی زندگی میں جو عظمت اور نظم و

ضبط پیدا کرنا مقصود ہے اس کا سب سے مؤثر ذریعہ بھی یہی ہے۔ یہ بھی ایک پوری سائنس ہے۔ اس کا صحیح مطلب وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو قرآنی عبارات کے معجزات پر یقین رکھتے ہیں اور حروف اور کلمات کے ذاتی اثرات اور علم الحروف کا کچھ علم رکھتے ہیں۔ اسی طرح سکولوں میں قاری حضرات کو مقرر کیا گیا، اس کی بھی ایک ایسی افادیت ہے جو اس طریقہ کے بغیر کسی دوسرے طریقے سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ تمام بچے جو کل جوان ہو کر اس قوم کا کرتا دھرتا ہوں گے، ان کو قرآن پاک پڑھنا تو کم از کم آتا ہو۔ اس بات کا ہماری حکومتوں کو اندازہ نہیں ہے کہ ہمارے ان پڑھوں کا تو ذکر ہی کیا بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگوں میں کتنے ہیں جن کو نماز کا سبق آتا ہوگا اور جب بڑے ہو کر نماز نہ آتی ہو تو پھر نماز پڑھنے سے شرم آنے لگتی ہے اور بالآخر رفتہ رفتہ کفر و الحاد کا غلبہ شروع ہو جانا طبعی امر ہے۔ جو خود نماز نہیں پڑھتا اور اس کو ضروری نہیں سمجھتا، وہ اپنے اہل خانہ بالخصوص پیاری اولاد کو کیوں اس کی تکلیف دے گا۔ اس مرض کا خاتمہ کرنا بھی تو آخر کسی حکومت کی ذمہ داری ہے اور خاص کر نئی نسل جو سکولوں اور کالجوں میں زیرِ تعلیم ہے، اگر اس کو اسلامی اقدار کی تربیت سے آراستہ نہ کیا گیا تو جو کچھ بقیہ میدان میں اسلام کے نام پر ہوگا، وہ سب ایک ہی ریلے کی نذر ہو جائے گا۔ غرض کہ ہم نے زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں نہایت ہی اہم بنیادی کاموں کی منصوبہ بندی کرنے کی کوشش کی۔ جس کا کچھ نہ کچھ اثر خدا کے فضل و کرم سے ابھی تک قائم ہے۔ حالانکہ ہمارے بعد میں آنے والی حکومتوں نے کچھ تو ان معاملات سے بے خبری، لاعلمی اور عدم دلچسپی کی وجہ سے اور کچھ ہماری مخالفت کے باعث پوری کوشش کی کہ ان تمام کاموں کو تہہ و بالا کر دیا جائے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ کوئی اچھے کام نہیں تھے بلکہ محض مسلم کانفرنس کی حکومت کی یادگار اور باقیات تھے۔

صدر حکومت تک رسائی:

اسی طرح ہم نے عوامی قوت محاسبہ کو بیدار اور مضبوط کرنے پر کافی توجہ دی۔ غالباً یہی وہ دور تھا جس میں غریب سے غریب شخص کی رسائی براہِ راست صدر حکومت تک تھی اور اس کی بات پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ دور مکمل طور پر مثالی تھا۔ کیونکہ ایک تو نئی بات تھی، دوسرے یہ کہ لوگوں کے مسائل اس قدر تھے کہ ان کی فہرست بنانا ہی دشوار تھا، چہ جائیکہ حل کیے جائیں۔ اس لیے یقیناً کئی شکایات حل طلب رہ گئی ہوں گی۔ لیکن اس کا جو بڑا ریلا تھا وہ بہر حال گزر گیا تھا۔ چنانچہ ہمارے اسی طرزِ عمل کا اثر تھا کہ بھٹو صاحب نے بھی، ''کھلی کچہریاں'' لگانا بند کر دیں۔ لیکن ان کا جو حال تھا وہ سب کو معلوم ہے۔ بلکہ بھٹو صاحب خود ان کے بارے میں جو کہتے تھے، وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ تاہم میں نے پوری کوشش کی کہ عوامی و ملکی ضروریات کا مطالعہ کیا جائے اور پھر ان کو پورا کرنے کیلئے صحیح منصوبہ بندی کی جائے۔ ہماری منصوبہ بندی کا معیار پسند اور ناپسند کی بنیاد پر اور بے ہنگم کام کرنا نہیں تھا بلکہ کسی رو رعایت کے بغیر قومی تقاضوں کے مطابق سب کاموں کو ترتیب دینے کا تھا جو اللہ کے فضل و کرم سے ٹھیک طریقے سے چلتا رہا۔

یکساں سہولتیں:

اس کے علاوہ جو میں نے مکانیت کی موزونیت کی بات کی تھی تو اس کے بارے میں میرے دور میں اصولی فیصلے ہو گئے تھے کہ اگر بڑے ملازمین کیلئے ان کی ضرورت کے مطابق چھوٹے مکانات نہیں بنائے جا سکتے تو کم از کم سب کیلئے یکساں مکان بنائے جائیں۔ اسی طرح نہ صرف ضروریات بھی صحیح طور پر پوری ہوں گی بلکہ طبقاتی کشمکش بھی کم ہو گی۔ اسلامی مساوات بھی سمجھ میں آئے گی اور پھر یہ کہ اس طرح ہم جو محض مرتبوں کی جھوٹی انا کی خاطر ضرورت سے زائد قومی دولت صرف کرتے ہیں اس کو جائز اور صحیح مصرف میں لایا جائے گا۔ میرے بعد جلد ہی اس اصول کو بھی ترک کر دیا گیا۔

میری صدرات کے دوران وزیروں کے سفر خرچ اور یومیہ کے مقابلے میں چوتھے درجے کے ملازمین کا سفر خرچ اور یومیہ زیادہ تھا۔ان امور کی حکمت ملک و ملت کے ساتھ دلچسپی کے تناسب سے ہی سمجھ میں آ سکتی ہے۔

آزاد کشمیر میں ہمارے لیے ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ہم نے نہ صرف لوگوں کے مسائل ہی حل کرنے ہوتے ہیں، بلکہ اس قوم کو اپنی تاریخی ذمہ داری پورا کرنے کا اہل بنانا ضروری ہے۔ چنانچہ ہم نے جو کام بھی کیا، صرف وہی ہمارا مقصود نہیں تھا، بلکہ اس کو ایک اعلیٰ مقصد کے طور پر کیا۔ اس لیے ہمارا ضمیر مطمئن ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ہم نے اس میدان میں دانستہ کوئی کوتاہی نہیں کی۔ تمام توفیق اسی مالک کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وھو ولی التوفیق۔

حصہ دوم

آزاد کشمیر میں اسلامی قوانین کا نفاذ

ایک تاریخی اقدام:

آزاد کشمیر کی سیاست جہاں بعض پیچیدہ مشکلات اور اُلجھنوں سے مرکب ہے، وہاں اس کا ایک امتیاز ایسا بھی ہے جس کا ذکر نہ کرنا بے انصافی ہوگی، وہ ہے آزاد کشمیر میں اسلامی قوانین کا نفاذ۔ بظاہر کہنے کو تو یہ آسان بات ہے مگر اس کو عملاً نافذ کرنا تاریخ کا ایک ناقابل فراموش اور مثالی باب ہے۔ آج تو پاکستان کے علاوہ بعض دوسرے مسلمان ممالک میں بھی شریعت کا نفاذ کرنے کا چرچا ہے۔ لیکن جس وقت آزاد کشمیر میں یہ اقدام کیا گیا، یعنی 1971ء تا 1975ء میں تو اس وقت سعودی عرب کے علاوہ دنیا بھر میں صرف یہی وہ خطہ زمین تھا جہاں شریعت محمدی ﷺ کی تطبیق کا کام شروع کیا گیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس وقت جبکہ پاکستان میں روز و شب پروپیگنڈہ ہو رہا ہے کہ اسلام کا پورا نظام زندگی نافذ کیا جائے تو جہاں سے اس کام کا آغاز ہوا تھا، یعنی آزاد کشمیر، اس کا نام لینے سے التزام کے ساتھ گریز کیا جا رہا ہے۔ ہر چیز کا اپنا وقت مقرر ہے تاہم یہ خیال کرنا کچھ بعید از قیاس نہیں ہوگا کہ اگر اس وقت آزاد کشمیر سے اس کام کی ابتداء نہ کی گئی ہوتی تو شاید قومی اتحاد کی تحریک کو بھی محض جمہوریت کی بحالی تک محدود رکھا جاتا اور اس طرح جو اقدامات اس وقت کیے جا رہے ہیں وہ بھی ابھی شروع نہ ہو سکتے۔

غلط فہمیاں:

جس وقت آزاد کشمیر میں اس کام کا آغاز ہو رہا تھا، اس وقت یہ بات عجیب سی دکھائی دیتی تھی، کس کو معلوم تھا کہ اس چھوٹی سی جگہ سے شروع ہونے والا کام اس طرح پھیلتا چلا جائے گا۔ اس وقت تو یہ امر محض تخمین وظن کی حالت میں تھا کہ آیا اسلامی شریعت کا نفاذ اس زمانے میں ممکن بھی ہے؟ جدید تعلیم یافتہ طبقہ تو محو تماشا یا محو حیرت تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

میں نے جب بحیثیت صدر اس پر سنجیدگی سے گفتگو شروع کی تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ایک تعلیم یافتہ سرکاری افسر نے مجھ سے حیرت سے پوچھا کہ ''سردار صاحب آپ یہ کیا کرنے والے ہیں؟ ''میں نے پوچھا کیوں، تو کہنے لگے ''کل تک جس کی شلوار ٹخنوں سے اوپر نہ ہوگی؟ اس کی بھی گردن ماری جائے گی، وغیرہ وغیرہ''۔

قدر شناسی:

میں اگر اس کار خیر کا کوئی انعام نہیں چاہتا، وہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔لیکن اس پر حیرت ہوتی ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے ساتھ کس قدر بُخل کر رہے ہیں کہ نہ تو اس میں آزاد کشمیر کا ذکر کرتے ہیں، جہاں سے یہ انتہائی مشکل بلکہ مشکل ترین کام شروع ہوا جو اس وقت ناممکن دکھائی دیتا تھا، نہ ہی اس حکومت کا ذکر کرتے ہیں جس نے یہ تاریخی اقدام کرنے کی جسارت کی، بلکہ اس حکومت کے معاملہ میں تو بعد کی حکومتوں نے جو رویہ اختیار کیا وہ ایک تاریخی جرم ہے اور انسانیت کے نام پر بدترین داغ ہے۔ اس حکومت نے نہ صرف ناممکن کو ممکن کر دکھایا بلکہ وہ کام ایسے وقت میں کیا جس وقت اس کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ مرکز میں ''بھٹو صاحب'' کی حکومت تھی۔ جو اپنی دوسری ''خوبیوں'' کے علاوہ سوشلزم کی داعی اور علمبردار تھی، جو بذاتہ اسلامی شریعت کی ضد ہے۔

اسلامی سیاست، علم اور تجربہ:

شریعت کی تطبیق کے عمل کے ضمن میں آزاد کشمیر کی اس حکومت کے اقدامات سے صرف نظر کرنا بڑی بے انصافی اور کم ظرفی ہوگی۔ تاہم اس بارے میں صرف اسی قدر بتانا مقصود نہیں ہے، اس کا ذکر تو ضمناً کرنا پڑا۔ اصل بات جو مجھے کہنا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی سیاست کے بارے میں ہمارے ہاں ابھی تجربہ اور علم دونوں ہی محل نظر ہیں۔ جو سیاست ہمیں ورثہ میں ملی، وہ تو غیر ملکی حکمرانوں کی عطا کردہ تھی اور سرا سر اسلام کی روح کے منافی، اس پر

مستزاد یہ کہ اسلامی سیاست کے بارے میں کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے جو صحیح راہنمائی کرتی ہو، جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ سب کی سب فلسفہ اور اصول کے بارے میں ہیں، لکھنے والے تمام فلسفی اور مفکرین تھے، کوئی ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے جو عملی سیاست دان ہوا ہو اور اس نے تجربات کو آنے والی نسلوں کے لیے قلم بند کیا ہو، علامہ ابنِ خلدون کے مقدمہ میں بہت مفید مگر مختصر بات درج ہے، لیکن ابن خلدون بھی کوئی آزاد اور خودمختار سیاستدان نہیں تھے، ان کو کسی کی ماتحتی میں سیاسی کام کرنے کا موقع ملتا رہا۔ یہ بذاتہ ایک ایسی کمی ہے جس کا کوئی حل نہیں ہے۔ اس کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ صحیح اسلامی نظام کے اور ہمارے درمیان صدیوں کا وقفہ ہو گیا، ورنہ شاید تسلسل کی وجہ سے آنے والے لوگ بات کو آسانی سے سمجھ سکتے، پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حکمرانی کے جو تقاضے لامحالہ بدلتے گئے، ان کی وجہ سے یہ خلاء پھر طبعی مدت سے بھی کئی گنا بڑھتا چلا گیا اور آج جہاں ہم کھڑے ہیں وہ مبارک زمانہ محض خواب، ناقابل حصول یا صرف گزشتہ واقعات کا ریکارڈ بن کر رہ گیا ہے۔ اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اس ضمن میں کچھ کہا سنا جائے اور یہ بات زورِ علم کی بنا پر نہیں بلکہ عملی تجربات کی بناء پر کی جائے، تب کہیں بات سمجھ میں آئے گی، مجھے چونکہ خدائے پاک نے یہ سعادت عطا فرمائی کہ میں اس میں پہل کروں، اسی لیے میرا خیال ہے کہ میری یہ بھی ذمہ داری ہے کہ میں اس بارے میں اپنے تجربے اور مشاہدات اور تاثرات کو جس حد تک اس مقالے میں ممکن ہو، قلمبند کر دوں۔

پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے بارے میں ارادہ ہے کہ ایک علیحدہ کتاب لکھی جائے یہ مضمون پوری بات کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے یہاں بھی خاصے اختصار کے ساتھ کچھ فوری نوعیت کے معاملات پر ہی بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے اگرچہ تشنگی پوری طرح تو دور نہیں ہو سکے گی مگر کچھ نہ کچھ بات سمجھ میں ضرور آ جائے گی۔ اس سے مسلم کانفرنس کے اسلامی کردار کے امتیاز کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوں گی۔ ورنہ یوں تو یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ مسلم کانفرنس

بھی ان دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح ہی ایک جماعت ہے جس کے پاس اسلامی نظام کے بارے میں کوئی پروگرام ہے نہ علم۔ کسی اور جماعت نے اگر یہ کام کیا ہوتا تو خدا جانے وہ کیا کیا دعوے کرتی اور قوم سے کیا کیا مطالبات کرتی، لیکن کہتے ہیں کہ غریب کی جوانی اور موسم سرما کی چاندنی کو کوئی نہیں دیکھتا۔ یہ تاریخی کام چونکہ آزاد کشمیر میں ہوا اور کیا مسلم کانفرنس نے، اس لیے اس کا تذکرہ کرنا کئی حضرات کو ناپسند بلکہ ناگوار ہے، تاہم تاریخ، تاریخ ہے اس کو نہ تو جھٹلایا جا سکتا ہے، نہ اس پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے۔

ناموافق حالات اور انتخابات:

1970ء کے انتخابات کی تیاریوں کے دوران میں نے مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے آزاد کشمیر اور پاکستان بھر میں جگہ جگہ دورہ کیا اور جہاں جماعت کی تنظیم کا کام کرتا رہا، وہاں ریاست جموں وکشمیر کی آزادی، آزاد کشمیر کی ترقی وتعمیر اور پھر ملکی نظام کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے بارے میں زیادہ زور دے کر بات کرتا رہا، یہ مہم ہم نے 1968ء سے شروع کر دی تھی، جب انتخابات قریب آ گئے تو یوں معلوم ہوتا تھا گویا ہم بالکل طبعی اور فطری طریقہ سے اپنی مہم مکمل کر چکے تھے۔ مسلم کانفرنس اور آزاد حکومت کے بارے میں ہم نے ایک خاص تاثر پیدا کر دیا تھا۔ یہ کام اس دوران کافی مشکل تھا۔ کیونکہ تھوڑی دیر قبل خورشید صاحب کی حکومت ایک خاص تاثر قائم کر چکی تھی، اس کے بارے میں آج شاید کچھ سمجھ میں نہ آئے، مگر اس وقت کے لوگ حافظے پر زور دیں تو وہ نقشہ با آسانی تصور میں آ سکتا ہے۔

خورشید صاحب کا تاثر:

اگرچہ خورشید صاحب کی حکومت کے بعد خان عبدالحمید خان صاحب کی حکومت رہی اور ان کے بعد جنرل عبدالرحمٰن صاحب ہو گئے، مگر آزاد کشمیر میں تاثر وہی خورشید صاحب والا

ہی تھا۔ اغلب گمان یہی ہو رہا تھا کہ انتخابات میں بھی وہی کامیاب ہوں گے۔ اس وقت کی مرکزی حکومت، آزاد کشمیر کے اندرونی سیاسی اور نظریاتی حالات سے جس قدر بے خبر اور لاتعلق تھی شاید ہی کوئی اور ہو۔ پھر وہ جن اطلاعات پر انحصار کر کے اندازے قائم کیے ہوئے تھی، ان سے زیادہ غلط، گمراہ کن کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ ایسا تانا بانا بنا دیا گیا جس میں سب سے بڑا جرم ہی گویا نظریہ الحاق پاکستان تھا، آزاد کشمیر میں خورشید صاحب کے سوا کسی بھی دوسرے کا کامیاب ہونا نہ صرف ناممکن دکھائی دیتا تھا بلکہ نامناسب بھی معلوم ہوتا تھا اس کیفیت کا اندازہ اس بات سے ہو گا کہ جس دن پولنگ ہو رہی تھی، میں مظفرآباد سے گزرا تو مظفرآباد سیکرٹریٹ کے پولنگ اسٹیشنوں پر خورشید صاحب کے مجھ سے کوئی چالیس پچاس ووٹ زیادہ تھے۔ دو بڑے سنئیر سرکاری ملازمین جو مسلم کانفرنسی ذہن کے تھے، مجھے گیسٹ ہاؤس میں لے گئے اور کمرہ بند کر کے ایک صاحب جن کی آنکھوں میں آنسو تھے، پوچھنے لگے کہ آیا یہ چالیس ووٹوں کا فرق ہم پورا کر لیں گے؟ میں نے ان کو تسلی دی مگر وہ اس کو طفل تسلی ہی سمجھتے رہے تاوقتیکہ پورا نتیجہ سامنے آ گیا۔

اس انتخاب کی دوسری کیفیات بیان کرنا بہت تفصیل طلب ہے اور اس وقت اس سے بحث بھی نہیں ہے۔ اتنی بات میں نے اس لیے کہی کہ وہ انتخابات جو مسلم کانفرنس نے جیتا تھا، کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جس دن میں نے کاغذات نامزدگی داخل کیے، اسی دن قومی صحافت کے ایک پرانے اور دانشور رکن سید شبیر حسین شاہ میرے پاس آئے اور ناراضگی سے کہنے لگے کہ کس حکیم نے مجھے مشورہ دیا کہ میں انتخاب لڑوں؟ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ آپ کو حالات دکھائی نہیں دیتے ''اور اگر خدانخواستہ تمہیں شکست ہو گئی تو یہ سردار قیوم کی نہیں پورے نظریئے کی شکست ہو جائے گی''۔ پریشانی تو مجھے بھی ہوئی، مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ وہ غلط بھی نہیں کہہ رہے تھے، کیونکہ اس مہم کے دوران کوئی دوسری جماعت یا امیدوار الحاق پاکستان کی بات بھی نہیں کر رہا تھا، جب کہ خورشید صاحب آزاد کشمیر کی خودمختاری کا بظاہر پر

کشش، جاذبِ نظر خیال اور فکر انگیز نعرہ لگا رہے تھے۔ اس میں وہ تنہا بھی نہیں تھے، کئی بڑے سرکاری افسر بھی ان کی حمایت کر رہے تھے۔ ان کے اکثر ایجنٹ بھی آزاد کشمیر میں خورشید صاحب کیلئے کام کر رہے تھے، جیسا کہ ہمیں ہر طرف سے اطلاعات مل رہی تھیں، یہ کوئی پردہ داری کا کام بھی نہیں تھا، کھلم کھلا کنویسنگ ہوتی تھی۔

خان عبدالحمید خان کا دور صدارت:

ایک طرف یہ حال تھا تو دوسری طرف خان عبدالحمید خان صاحب کی صدارت کے دوران آزاد حکومت ایک میونسپلٹی سے بھی کم تر درجے پر آ گئی تھی، صدر کے کوئی اختیارات نہیں تھے۔ صدر صاحب ہر بات پر فرماتے تھے کہ ''بھائی تم بھی دعا کرو، میں بھی کرتا ہوں کہ بات ٹھیک ہو جائے''۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وزارت امور کشمیر کے ڈپٹی سیکرٹری کو کوہالہ پر گارڈ آف آنر پیش کیا جاتا تھا۔ وہ ڈپٹی سیکرٹری شرمسار ہونے کے بجائے اس کو اپنا قانونی حق سمجھتا تھا۔ اس سے ہمارے ملازمین اور نوجوانوں میں جو ردعمل اور انتقام کا جذبہ ابھرتا رہا تھا، اس نے خود انتظامیہ کا برا حال کر دیا تھا۔ سرکاری ملازمین دن بھر بیٹھ کر اپنا رونا روتے تھے۔ بعض منچلے اس کا اس طرح تذکرہ کرتے کہ یہ سب کچھ الحاق پاکستان کے نظریئے کا قصور ہے، ورنہ سب اچھا ہوتا۔

سرکاری ملازمین کا احساس محرومی:

پورا آزاد کشمیر تذلیل اور احساس محرومی کا شکار تھا، مرکزی حکومت میں نہ صرف یہ کہ آزاد کشمیر کے ملازمین کی کوئی عزت نہیں تھی، بلکہ خود مرکزی ملازمین جن کو آزاد کشمیر بھیجا جاتا وہ بھی کمتر درجے کے لوگ سمجھے جاتے، اس لیے کہ وہاں اکثر صرف ایسے ہی افسر تعینات کیے جاتے تھے جو مرکز میں نالائق، نکمے اور غیر ضروری سمجھے جاتے۔ اندازہ کیجیئے کہ ایک افسر نالائق ہو اور اس کو لامحدود اختیارات بھی حاصل ہوں تو وہ کیا حشر برپا نہ کرے گا۔ یہ وہ زمانہ تھا

جب ہم اکثر سوچتے تھے کہ ہم نے ڈوگرہ حکومت سے جنگ کر کے غلطی تو نہیں کی؟ اس دور کا یہ محض اجمالی خاکہ ہے، اس کی پوری تصویر کشی اس وقت ممکن نہیں ہے۔ ان باتوں کا ذکر بھی محض اس لیے کرنا پڑا کہ ایک تو جن حالات میں مسلم کانفرنس کی حکومت بنی، وہ معلوم ہو جائیں، ورنہ ہم نے جو کچھ اس دور میں کیا، اگر اس کو ہماری حکومت کے بعد کے حالات پر قیاس کیا جائے تو صحیح نتیجہ اخذ کرنا ناممکن نہیں ہے۔ دوسرے اس لیے ان کا ذکر کیا کہ ان حالات سے ہم سب کو سبق سیکھنا چاہیئے تاکہ ہم محض لاعلمی سے ان خرابیوں کا پھر کبھی ارتکاب نہ کریں۔

فوج کی تنخواہیں اور مراعات تو اگرچہ یحییٰ خان صاحب نے خدا ان کا بھلا کرے، برابر کر دیں، مگر آزاد کشمیر کے سول ملازمین کی تنخواہیں اور پنشن ملک کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں بدستور کم تھیں۔ دوسری طرف ہماری آمدنی اتنے خرچ کی بھی متحمل نہ ہوسکتی تھی، اس کے لیے مرکزی حکومت سے امداد یا قرض لیکر گزارا ہوتا تھا، سب لوگ ذہنی بغاوت پر آمادہ تھے، منفی اور تخریبی کارروائیوں کا آغاز ہو چکا تھا، اگر انصاف سے دیکھا جائے تو مسلم کانفرنس کی حکومت نے صرف اسی ایک پہلو کا جو علاج کیا، وہی بڑا کارنامہ ہے کہ اس کی کوئی قیمت نہیں دی جا سکتی۔ ہم نے مرکزی حکومت سے قرض لینا ترک کر دیا اور اپنی آمدنی اس قدر بڑھائی کہ میرے وقت میں تقریباً کئی ہزار نئے ملازمین بھرتی کرنے کے باوجود جس دن میں نے حکومت چھوڑی اس دن چار کروڑ روپے فاضل پڑے ہوئے تھے۔ اس وقت آزاد کشمیر کی اس حالت زار کے بارے میں جب میں لکھ رہا تھا تو مجھے جنگ بندی لائن کی دوسری طرف کا خیال بھی آ رہا تھا کہ وہاں کیا صورت حال تھی؟ چنانچہ اس کا نقشہ بھی میرے ذہن میں اسی طرح قائم تھا جس طرح اس کا۔ لیکن دونوں کے حالات کا دیانتدارانہ تقابل کر کے میں اس حتمی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم کمی سے بیشی کی طرف یا خراب سے بہتر کی طرف ارتقاء کرتے رہے جب کہ وہ دوسری طرف بہتر سے کمتر کی جانب ترقی معکوس کے عمل سے گزر رہے ہیں۔

اس کی ایک نہیں کتنی ہی مثالیں دی جا سکتی ہیں، زندگی کے ایک شعبے میں نہیں، تقریباً ہر شعبے میں۔

بھٹو کا اقتدار:

بہر حال ایک طرف تو آزاد کشمیر میں ہمارے لیے یہی کچھ کم قیادت نہ تھی۔ دوسری طرف پاکستان میں بھٹو صاحب برسر اقتدار آ گئے۔ میرے اور ان کے درمیان کچھ طبعی اور کچھ معروضی اختلاف پیدا ہو گئے یا پیدا کر دیئے گئے اور بڑھتے چلے گئے، ایسے میں دوسری اصلاحات کا متاثر ہونا لازمی امر تھا لیکن اسلامی قوانین کا نفاذ تو ناممکن سے کم نہیں تھا۔ آج تو بعض لوگ بڑی دیدہ دلیری بلکہ ڈھٹائی سے کہہ دیتے ہیں کہ صاحب اس وقت کیا ہوا اور مسلم کانفرنس کی حکومت نے کیا کیا؟ میں اگرچہ ان کو معذور سمجھتا ہوں کیونکہ ہمارے ہاں سوچ کا معیار ابھی اتنا بلند نہیں ہے اور وہ قومی سطح پر نہیں آ سکا، محض ذاتی اغراض اور ذاتی پسند و ناپسند کی حد تک ہی ہے، اس لیے ان حضرات سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر کسی نے قومی مفادات کے نقطہ نظر سے کبھی دیکھا تو اسے معلوم ہو گا کہ ہم نے کیا کیا اور اس کے نتائج کیا نکلے؟ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ میں آج اپنے ضمیر کے کسی گوشے میں محسوس نہیں کرتا کہ ہم سے دانستہ کوئی کوتاہی ہوئی یا ہمارے علاوہ کوئی اور ہم سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ ”ذالك فضل الله يوتيه من يشاء“۔

انتخابی منشور:

انتخابی مہم کے دوران ہم نے نہ صرف عام اجتماعات میں بلکہ اپنے تحریری منشور میں دوسری اصلاحات کے علاوہ اسلامی قوانین کے نفاذ کا بھی ذکر کیا۔ انتخابی مہم کے دوران کی گئی باتوں کے بارے میں اب خیال ہو رہا ہے کہ وہ کیا ہوتی ہیں۔ کئی باتیں تو واقعی ایسی ہوتی ہیں جن میں کہنے والے لوگ سنجیدہ تو ہوتے ہیں مگر نہ تو ان کے پورے کوائف کا ان کو علم ہوتا ہے

نہ یہ پتہ ہوتا ہے کہ ان کو عملی جامہ کیسے پہنایا جا سکے گا۔ بعض باتیں تو محض ایک اچھی خواہش ہوتی ہیں، بعض محض ردعمل اور بعض محض دفع الوقتی اور ایک عارضی اور وقتی مصلحت، جس کا کچھ مطلب نہیں ہوتا۔ اس آخری شق کو دغا اور فریب بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے دانستہ یہ ثقیل لفظ استعمال نہیں کیا۔ بھٹو صاحب جب بحیثیت صدر امریکہ سے آئے تو میں ان سے ملنے گیا، خیریت دریافت کی اور دورے کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے ''اور دو باتیں تو جو ہوئیں مگر مجھے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ سیاست دان حکومت سے باہر جو باتیں کرتے ہیں، وہ حکومت کے اندر کس طرح مختلف ہوتی ہیں''۔ پھر کہنے لگے ''نکسن سے ملتے ہی پہلی بات اس نے یہ کی کہ آپ سیٹو سینٹو سے علیحدگی کی بہت بات کرتے تھے، بچا لیتے نا مشرقی پاکستان کو''؟

بہر حال جب میں صدر ہو گیا تو اپنے کیے ہوئے وعدوں کو عملی جامہ پہنانے میں مشکلات کے ایسے پہاڑ دکھائی دینے لگے جن کا کوئی تصور اس سے قبل نہیں تھا۔ وعدے بھی ایک تو وہ تھے جو میں نے خود کئے تھے مگر اس سے زیادہ وہ تھے جو میرے جماعتی کارکن بھائیوں نے انتخابی منشور لکھتے وقت پوری فکر آزادی کے گھوڑے دوڑا کر کیے تھے۔ انھوں نے سوچا ہو گا کہ بحر ظلمات تک کون جائے، منشور میں ہی کیوں نہ گھوڑے دوڑا دیے جائیں۔ صرف امریکہ اور روس کو فتح کرنا بھول گئے، باقی کسر نہیں چھوڑی، مگر ان سب میں مشکل ترین کام وہ تھا جو شریعت کے نفاذ کا تھا۔ مجھے اسمبلی میں بھی نفاذ شریعت کے موقع پر اپنی تقریر میں س امر کا اعتراف کرنا پڑا تھا کہ اگر ان مشکلات کا مجھے پہلے علم ہوتا تو اگرچہ میں عملی کوشش ضرور کرتا مگر منشور میں وعدہ نہ کرتا۔

چنانچہ جب اس وعدے کو وفا کرنے کا عزم کیا تو ایک ایک کر کے بے شمار ایسے امور سامنے آتے گئے جن کا کوئی ادنیٰ سا تصور بھی پہلے نہ تھا۔ خیال تو سب لوگوں کی طرح میرا بھی یہی تھا کہ بس حکمران بننے کی دیر ہے، کیونکہ ہر کام کیلئے حکمران کا ارادہ ہی کافی ہے، مسلمان تو ہم سب الحمداللہ، پہلے سے ہیں، محض ایک حکم سے تمام کام خود بخود چل پڑے گا۔

پھر معلوم ہوا کہ یہی وہ عظیم غلط فہمی بلکہ حماقت ہے جس میں ہم سب مبتلا ہیں۔ ہماری مثال اس شخص کی سی ہے جس کو مکان کی اشد ضرورت ہو اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ جب چاہے گا مکان بنا لے گا، لیکن جب بنانے کا وقت آئے گا تو اسے معلوم ہو گا کہ مکان کیلئے جگہ کہاں ہے؟ روپیہ کتنا صرف ہو گا اور کہاں سے آئے گا؟ اس کے باقی لوازمات کیسے پورے ہوں گے، اس کا نقشہ کیا ہو گا، کون بنائے گا اور آیا وہ نقشہ اس زمین پر پورا بھی آئے گا یا نہیں؟ غرض یہ تو محض ادنی سی بات ہے جس کی عملی مشکلات کا یہ حال ہے تو قیاس کیجئے کہ اس آسمان کے نیچے اور اس زمین کی سطح پر سب سے مشکل کام کرنے کی مشکلات کیا ہوں گی؟

پھر یہ مشکلات کچھ تو ہر صورت حال میں مستقل نوعیت کی ہیں اور کچھ ہر ملک کے مخصوص حالات کے مطابق ہیں، ان کا کس نے پورا مطالعہ کیا اور اس کا حل دریافت کیا؟ چنانچہ میں نے ملک بھر کے کم از کم دو صد علماء کی خدمت میں ذاتی خطوط لکھے اور اس بارے میں راہنمائی کی درخواست کی، جیسا کہ میں ذکر کر آیا ہوں، جب اس طرف سے مایوسی ہوئی تو پھر گھر کی طرف رجوع کیا اور خدا کے بھروسے پر کام کا آغاز کیا۔

اس کارروائی میں سب سے پہلے تو مجھے اس پر غور کرنا پڑا کہ اس کے اپنے عملی تقاضے کیا ہیں، اس کی مشکلات کیا ہیں اور ترجیحات کیا ہونی چاہئیں؟ یہ خوف بھی دامن گیر رہا کہ نفاذ اسلام کے مقدس کام کو کہیں خدانخواستہ میری کسی نالائقی پر قیاس نہ کیا جانے لگے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غلطی تو میں کروں اور وہ نفاذ شریعت کے کھاتے سے منسوب ہو اور بالآخر اسلامی نظام کی بدنامی ہو۔ بہر حال میں مختصراً اس مشق کا ذکر کروں گا کہ ہم نے کیا کیا، کس طرح کیا اور اس کے نتائج کیا ہوئے۔

مشکلات

اسلامی نظام کا تصور:

سب سے پہلے مشکل تو یہ پیش آئی کہ جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام کا نظام نافذ کریں یا کرنا چاہیں تو اس سے عملاً مراد یہ ہے، یعنی جس طرح ہم سنتے آئے ہیں کہ یہ نظام کمیونسٹ یا سوشلسٹ یا پارلیمانی نظام ہے یا صدارتی نظام ہے تو بڑی حد تک ایک نقشہ خود بخود ذہن میں آ جاتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو بات خیال میں آتی ہے، وہ صرف اس قدر ہے کہ بعض شرعی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔ لفظ بعض اس لیے کہ سوائے علماء حضرات کے کسی کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ شرعی قوانین کیا ہیں جن کو ہم نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ بس وہی ایک دو یعنی ہاتھ کاٹنا اور سنگسار کرنا۔ چنانچہ جب پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ کیے جانے لگے تو ہاتھ کاٹنے سے ہی آغاز کیا گیا۔ اگر کسی کا علم وفکر زیادہ ہو تو وہ خلافت راشدہ کا تصور کرے گا کہ اس قسم کا نظام ہونا چاہیئے۔ مگر اس کی مشکلات اور عملی صورت کے بارے میں یقیناً اس شخص کو بھی کچھ پتہ نہ ہوگا، پھر یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ آیا ہو بہو اسی قسم کا نظام اب بھی اور کسی بھی زمانے میں ممکن نہیں ہے۔ اگر نہیں ہے تو کیا کیا جائے۔

مجھے اس وقت محسوس ہوا کہ نظام کا مطلب محض قوانین کا نفاذ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قوانین کا نفاذ بے حد اہم ہے اور ہزاروں رحمتوں کا باعث ہے مگر اسلام کے نظام میں محض سزائیں ہی تنہا کافی نہیں ہیں، اس سے تو پورا سیاسی، معاشی، اخلاقی اور عدل و انصاف کا نظام مقصود ہے، میرے خیال میں ایسا معاملہ ہے جس کا اس وقت کوئی فوری حل نہیں تھا، نہ اس پورے نظام کو کماحقہ، نافذ کیا جا سکتا تھا۔ نافذ تو درکنار اس کے حدود اربع کا ہی صحیح پتہ لگانا ناممکن اگر نہ ہو تو بے حد مشکل ضرور ہے اور اگر بڑی محنت سے اس کا کوئی پتہ لگا لیا جائے، تب بھی اس کو نافذ کرنے کی اپنی دوسری مشکلات ایسی ہیں جن کو حل کیے بغیر تفریح یا ذہنی

عیاشی تو ہو سکتی ہے مگر مقصد کسی صورت پورا نہیں ہو سکتا، اس لیے ذہن میں بات اسی پر ٹھہری کہ جس جس حصہ پر جتنا ممکن ہو عمل کیا جائے۔

اُلجھنیں:

سیاسی نظام کے بارے میں کئی الجھنیں تھیں جو آج بھی ہیں یعنی کیا وہ نظام خلافت کی طرز پر ہو یا موجودہ دور کی سیاسی اصلاحات کی طرز پر ہو۔ یہ بذاتہ بڑی اہم بحث ہے۔ پھر یہ کہ حکومت سازی کس طریقہ سے کی جائے۔ حکومت اور عوام کے ایک دوسرے پر حقوق کا تعین کیسے ہو اسمبلیوں کا درجہ کیا ہو، کیا اسلامی معاشرے میں سیاسی جماعتوں کا وجود بھی ہے کہ نہیں۔ اور اگر ہے تو اس کا کیا کردار ہونا چاہیئے۔ حکومت کی مدت کیا ہو اور اس کی معزولی یا برطرفی کا طریقہ کار کیا ہو۔ غرض یہ کہ پورا ساسی نظام ہی ابتداً سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں دوسری باتوں کے علاوہ میرا خیال یہ ہے کہ صدارتی نظام یعنی صدر کا براہِ راست انتخاب ہی نظام اسلام کے قریب تر ہے۔ میں چونکہ براہِ راست صدر منتخب ہوا تھا اور ہمارا نظام صحیح معنوں میں صدارتی طرز کا تھا۔ اس لیے میں نے ذہنی طور پر اسی پر اکتفا کیا اور دوسری باتوں کو کسی فرصت یا کسی مناسب مرحلے پر اُٹھا رکھا۔ خواہش یہ تھی کہ کسی طرح کچھ بنیادی کام تو ہو جائیں تاکہ اگر آنے والی حکومتیں چاہیں تو ان کو ابتدائی مرحلوں سے نہ گزرنا پڑے۔ اگرچہ مجھے اپنے ہم عصر سیاست کاروں اور ان کے فوراً بعد آنیوالوں یعنی دوسری صف کے بارے میں کوئی خوش فہمی ہے نہ بدگمانی، ابھی ان میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ سیاست میں جن کا مقصد حیات اسلام ہو۔ اسلام کے بارے میں بعض کی رائے زیادہ سے زیادہ دکھائی دیتی ہے کہ جو پاکستان میں ہو گا ہم بھی خواہی نخواہی اس پر عمل کریں گے۔ لیکن میری سوچ اس سے مختلف ہے، ایک تو میں اس کو اپنی زندگی کا مقصد وحید سمجھتا ہوں، دوسرا یہ کہ مجھے بچپن سے ہی مفکر اسلام علامہ اقبال کے بارے میں یہ گمان ہو گیا تھا کہ وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کیلئے کشمیر پر نظریں لگائے ہوئے ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے مفکرین نے بھی اس غرض کیلئے کشمیر کی

طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ بات کسی نہ کسی طرح میرے ذہن میں راسخ ہوگئی ہے کہ ایسا ہی ہو گا، چنانچہ ہمیں ضرورت نہیں ہے کہ اس بارے میں ہم مرکزی حکومت کی طرف دیکھیں، جب کہ ان کے ہاں بھی ہماری ہی قسم کے لوگ ہیں، جو کسی اعتبار سے بھی ہماری راہنمائی نہیں کر سکتے، ہاں قد و قامت، جسامت اور طاقت کی بات اور ہے۔

تعلیم یافتہ طبقے کے تاثرات:

صدر بننے کے بعد جونہی میں نے اسلامی نظام کا ذکر شروع کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس بارے میں عوام کی رائے تو درکنار خود نہایت پڑھے لکھے اور صوم وصلوٰۃ کے پابند مسلمانوں کے دلوں میں بھی عجیب وغریب تاثر موجود ہے۔ مثلاً ٹخنوں سے اوپر شلوار والی بات جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اکثر پڑھے لکھے لوگ یہ خیال کر رہے تھے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ سے ہمارا سارا نظام زندگی تہ و بالا ہو جائے گا۔ بعض کے نزدیک تو یہ قوانین صرف صحابہؓ و تابعین کے اسی دور کیلئے مخصوص تھے اور اب ہمارے لیے انگریز کے دیئے ہوئے قانون سے بہتر کوئی نظام نہیں ہوسکتا۔ مرکز کے وزیر قانون حفیظ پیرزادہ صاحب نے بڑے غصے سے مجھے کہا کہ ''سردار صاحب آپ یہ کیا قیامت برپا کرنا چاہتے ہیں، کل تک لوگوں کے ہاتھ اور سر کٹے ہوئے ہوں گے، کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ ملاّ کیلئے حکومت سے دستبردار ہو جائیں؟'' اس واقعہ کا ذکر میں آگے چل کر مناسب موقع ومحل پر کروں گا مگر یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ اس وقت ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کی سوچ کیا تھی اور جو پیر زادہ صاحب نے کہا وہ محض ان کی ہی رائے نہ تھی، بلکہ ملک بھر، بلکہ دنیا میں پڑھے لکھے لوگوں کی رائے یہی ہے۔ یعنی ایک طرف تو وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ اسلامی نظام سے مراد محض کشت وخون اور واقعی تباہی ہو گی، تو دوسری طرف وہ مغربی حکمرانوں اور مفکروں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوکے یہ کہتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مطلب بھی پاپائیت ہے، جس میں حکومت کا حق صرف علماء کو ہو گا،

جن کو وہ لوگ اپنی زبان میں ''ملاّ'' کہتے ہیں۔ یہاں عالم اور ملاّ کا فرق بیان کرنے کا موقع ومحل نہیں ہے، بہت سے لوگ جانتے ہیں، جونہیں جانتے وہ جان لیں گے۔ اکثر لوگ خواہ اس ملک کے اندر ہوں یا باہر اور مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اسلامی حکومت کا مطلب انگریزی زبان کے لفظ ''تھیوکریسی'' کے معنوں میں سمجھتے ہیں۔ فکری زبان سے انگریزی پورے مغرب کی بالخصوص اور مغرب سے متاثر لوگوں کی بالعموم مشترکہ زبان ہے اس لیے اسلامی حکومت کو بھی تھیوکریسی ہی کے معنوں میں لے لیتے ہیں جبکہ تھیوکریسی اور اسلامی حکومت میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ ایک المیہ یہ بھی ہے کہ صرف مغرب اور مغرب زدہ لوگ ہی نہیں بلکہ ہمارے اکثر علماء حضرات بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت سے مراد تھیوکریسی ہی ہے۔ اسلامی نظام کے مخالفین تو بہر حال اسلام کو بدنام کرنے بلکہ اس کی وحشت ناک تصویر پیش کرنے کیلئے یہی پراپیگنڈا کرتے ہیں۔

عملی نمونہ کا فقدان:

تو گویا اس طرح یہ بھی ایک بڑی مشکل درپیش تھی کہ ان حضرات کو کس طرح سمجھایا جائے کہ معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اسلامی حکومتیں کبھی بھی اس قسم کی نہ تھیں۔اسلامی حکومت تو انصاف، مساوات، رواداری، خدمت اور خدا کے رسول ﷺ کی نیابت ہے، جس سے بڑھ کر انسان اور انسانیت کی دنیاوی اور اخروی فلاح کیلئے آج تک کوئی متبادل دریافت نہیں ہو سکا، مگر کسی عملی نمونے کی عدم موجودگی میں اس کی نشاندہی ظاہر ہے کہ کس قدر مشکل ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت جمال الدین افغانیؒ کو بھی روسی لیڈروں کے ساتھ گفتگو میں یہی مشکل پیش آئی تھی۔

نفاذ شریعت کے لئے ناگزیر امور

میں نے بھی یہ محسوس کیا کہ یہ کوئی فنی نوعیت کا کام نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اور

جب چاہے کر لے یا اس کیلئے دوسرے فنی امور کی طرح کچھ ماہرین کی خدمات حاصل کر لی جائیں تو کام چل جائے گا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ جو شخص بھی یہ کام کرنا چاہے گا اس کیلئے درج ذیل باتیں ناگزیر ہیں۔

الف) یقین:

یعنی اس بات کا پختہ اور غیر متزلزل یقین کہ اسلامی نظام نہ صرف قابل عمل ہے، بلکہ یہی وہ آخری نظام ہے جو انسانیت کی معراج ہے اور انسان کے تمام دکھوں کا واحد علاج ہے اور یہ یقین کہ اس کا کوئی دوسرا متبادل ہے ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ یہ یقین ایسا نہ ہو کہ اسلامی نظام بھی منجملہ دوسرے نظاموں کی طرح ہے، اس لیے جو کچھ بھی ہو وہ صحیح ہے۔ اس بارے میں ادنیٰ سا تذبذب بھی اسی کام کی انجام دہی کیلئے ناقابل برداشت ہے۔

ب) علم:

اس امر کا شافی علم ہونا چاہیئے کہ وہ نظام ہے کیا اور ہمارے موجودہ حالات میں اس کے نفاذ کی عملی شکل کیا ہوگی۔ اس علم میں کمی کی صورت میں وہ شخص دوسروں کی طرف سے راہنمائی کا محتاج ہو گا جو خود بھی اس کی طرح محتاج ہیں، یوں اس شخص پر سے اعتماد اُٹھ جائے گا۔

ج) ذاتی کردار:

اس پورے معاملے میں ذاتی کردار بے حد اہم ہے۔ خلافت راشدہ جو ہمارے لیے قیامت تک ایک نمونہ اور مثال ہے، اس میں ان مبارک ہستیوں کا کردار ہی تھا جس نے ایک صحیح اسلامی ریاست قائم کی تھی، اگر اس میں کمی ہو گی تو جدوجہد کی یہ پوری مشق بےمعنی ہو کر رہ جائے گی۔ اس کے کردار کے کیا معنی ہیں اور اسے کیسے حاصل کیا جاتا ہے، وہ علیحدہ ایک بحث ہے، بہر حال اس کے جو معنی بھی لیے جائیں وہ

ایسے ہونے چاہئیں، جو اس نظام کے مزاج کے مطابق ہوں۔ یہ پہلو بے حد عجیب و غریب، دلچسپ اور اہم ہے مگر بدقسمتی سے اسی پر لوگوں کی توجہ کم ہے، گویا خیال یہ کیا جا رہا ہے کہ شخصی کردار کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ بس نظام نافذ کرنا چاہیئے۔

د) صلاحیت:

یہ سب کچھ ہو جانے کے باوجود بھی جو، اگرچہ خود کوئی معمولی کام نہیں ہے، اگر اس شخص میں وہ نظام نافذ کرنے کی مطلوبہ صلاحیت نہ ہوگی تو پھر وہ سب جدوجہد محض لا حاصل ہوگی اور کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں کر سکے گی۔ یہ صلاحیت بھی کوئی فنی شے نہیں ہے، بلکہ یہ وہ انسانی جوہر ہے جو زیادہ تر اسی استعداد پر موقوف ہے، البتہ اگر جوہر موجود ہو تو اس میں ترقی و اضافہ ممکن ہے مگر اس کا از سرنو پیدا کرنا تو ممکن نہیں ہے یہ بھی بذات خود ایسی مشکل ہے جسے حل کرنا آسان نہیں ہے، لیکن اس کو حل کیے بغیر کوئی اقدام کرنا بھی اندھیرے میں چھلانگ لگانے کے مترادف ہے۔

حالات کا جائزہ:

اسلامی قوانین کے نظام کے سلسلے میں مجھے ایک مشکل پیش آئی کہ جس زمین پر ایک مکان بنانا مقصود تھا، اس کا کچھ نہ کچھ جائزہ لیا جائے کہ آیا اس زمین پر ایک بالکل نئے نقشے کے مطابق وہ عمارت تعمیر ہو سکتی ہے یا نہیں، آیا اس نقشے میں تبدیلی کرنا ہوگی یا زمین کی ناہمواری اور ناموافقت کو دور کرنا ہوگا۔ لوگوں کی اخلاقی حالت کیا ہے، ان کی مذہبی معلومت کیا ہیں، اس نئی اور اچانک تبدیلی کیلئے ذہنی اور عملی طور پر تیار بھی ہیں، پھر اس تمام کارروائی میں سب سے اہم کردار جس طبقے نے ادا کرنا ہے کیا وہ سرے سے اس بات کو سمجھتا بھی ہے یا نہیں، یعنی اس مقصد کے لیے انتظامیہ کی حالت مجھے ایسے لگی جیسے کسی موٹر کار سے ہوائی جہاز کا کام لینا ہو۔

ہماری انتظامیہ کی اکثریت بے شک مسلمانوں پر مشتمل ہے، لیکن کیا وہ برسہا برس کی

اپنی مخصوص تعلیم و تربیت کے ساتھ اس نئے کام کو کر سکے گی، اس کی سمجھ میں بات آئے گی یا نہیں، اور کیا وہ اس کا بوجھ اٹھانا بھی چاہتی ہے یا نہیں، اگر نہیں تو اس کا کیا علاج ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں کہ ہماری انتظامیہ کسی اعتبار سے بھی اس نظام کے قریب تک بھٹکنا پسند نہیں کرے گی، نہ ہی وہ اس کام کے اہل ہے۔ پھر نئے نظام کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے، جبکہ ہماری انتظامیہ کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے، جو جغرافیائی عوامل کے علاوہ غیر ملکی فرنگی حکمرانوں کے اثر سے بھی پوری طرح متاثر ہے اور اس ورثے کو حرز جان بنائے ہوئے ہے۔ بعض نادان لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انتظامیہ کا کیا ہے۔ جوں ہی ہم حکمران ہوں گے یہ خود بخود ڈھیک ہو جائے گی۔ اس سے زیادہ نادانی کی کوئی بات نہیں، اس طرح تو انسان کی اپنی بنائی ہوئی اشیاء بھی اپنی نوعیت تبدیل نہیں کر سکتیں چہ جائیکہ خدائے پاک کا بنایا ہوا یہ آخری شاہکار!

ہماری انتظامیہ کے مزاج کے بعض ایسے عناصر ہیں جو اس کی فطرت ثانیہ بن گئے ہیں۔ فطرت کی تبدیلی کے بارے میں شارع علیہ السلام کا ارشاد کتنا حکیمانہ صداقت کا حامل ہے۔ اس لیے جو شخص بھی اسلام کا نظام لانا چاہے گا، اسے اولین کاموں میں یہ بھی کرنا ہوگا کہ انتظامی مشینری کو اس نظام کے مطابق بنائے۔ یہ بھی معمولی کام نہیں ایک پوری حکیمانہ مشق ہے، جس کے اپنے تقاضے اور ترجیحات ہیں۔ چنانچہ مجھے اس ضمن میں بھی کام کرنا پڑا سب سے مشکل کام یہی دکھائی دیا۔ اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں کہ اگر انتظامی مشینری درست نہ ہو تو شاید کسی حد تک کام چل جائے، مگر وہ بددلی اور نااہلیت سے کیے ہوئے کاموں کی طرح غیر مؤثر ہوگا اور صحیح نتیجہ برآمد نہیں کر سکے گا۔ آگے چل کر گزارش کروں گا کہ اس سلسلے میں ہم نے کیا کچھ کیا۔

حدود اور تعزیرات کا خوف:

اس ضمن میں ایک بات کا ذکر بہت ہی برمحل ہوگا، جس سے یہ بات صحیح طور پر سمجھ

میں آ جائے گی۔ صدر پاکستان نے جب چوری کی سزا نافذ کی تو میں نے ان سے بھی گزارش کی تھی کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، ایک تو اس لیے کہ سزاؤں کے نفاذ سے پہلے کچھ اور کام ہیں جو کرنے ضروری ہیں اور پھر اس لیے بھی کہ اس سے مخالفین کو اسلام کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کا موقع ملے گا، جیسا کہ فی الوقع ہوا۔ پاکستان کے تمام درودیواران اشتہاروں سے رنگین تھے جن میں لوگوں کی کٹی ہوئی گردنیں اور ہاتھ دکھائے گئے تھے، جن سے خون کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے ان سے کہا تھا کہ یہ مشق اس لیے بھی لاحاصل ہوگی، کیونکہ ہمارے بعض علاقے ایسے ہیں جہاں ننانوے فی صد سے بھی زیادہ چوریاں ہماری انتظامیہ کرتی اور کرواتی ہے۔ میں نے صدر صاحب کو بتایا کہ بعض بڑے افسروں نے کچھ ''ماہرین'' کو جیل خانوں میں بند کروایا ہوتا ہے۔ رات کو انھیں باہر نکلوا لیتے ہیں، چوری، ڈاکہ یا قتل کی واردات کروا دیتے ہیں اور صبح سے پہلے واپس جیل خانے میں بند کروا دیتے ہیں۔ فرمائیے اس صورت میں چور کو کون پکڑے گا؟ اور کون سزا دلوائے گا اور اگر ایک بھی بے گناہ کا ہاتھ کٹ گیا تو یہ ہزاروں گناہ گاروں کے بچ جانے سے بدتر ہوگا۔ صدر صاحب نے پوچھا کہ پھر چوری کا علاج کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ اس قسم کے علاقوں میں ذمہ دار حکام کو جب علم ہوگا کہ چوری ہونے پر سزا ان کو ملے گی تو بس وہاں ہرگز کوئی چوری نہیں ہوسکتی، سوائے کسی استثناء کے۔ اور میں اپنے دورِ صدارت میں میرپور میں اس کا تجربہ کر چکا تھا۔

درس قرآن:

پھر ایک اور تقاضا جو مشکل بھی ہے اور اہم تر بھی، وہ حکمران کی ذات پر اعتماد ہے۔ سرکاری اہلکاروں کا اعتماد اور عوام و خواص کا اعتماد، یہ وہ اولین شرط ہے جس کے بغیر اسلامی نظام تو درکنار کوئی بھی اچھا یا برا کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود پیغمبرﷺ (فداہ امی و ابی) نے بھی خدا کا پیغام دینے سے قبل اپنی ذات مبارک کو قوم

کے سامنے اعتماد کیلئے پیش کیا۔ بلکہ قرآن حکیم جو ہمارے نزدیک بلاشبہ خداوند عالم کا کلام قدیم ہے خود اس پر اعتماد بھی حضورﷺ کی ذات پر اعتماد کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر خدانخواستہ کسی کا اعتماد حضورﷺ کی ذات پر سے اُٹھ جائے تو پھر قرآن اور خدا کسی بات پر اعتماد نہیں رہتا۔ ہماری موجودہ حالت میں اس قسم کا اعتماد یکلخت مہیا کرنا تو شاید ناممکنات میں سے ہو، مگر میرا خیال ہے کہ بتدریج حاصل ہوسکتا ہے۔ کچھ اعتماد تو بہر حال اس شخصیت کی ذات میں اس سے بھی پہلے ہونا چاہیئے کہ وہ حکومت کی مسند پر آئے، پھر باقی حصہ اس کے روز مرہ کے اعمال سے مکمل ہو جانا چاہیئے۔ مجھے اس امر کا شروع میں کوئی زیادہ احساس نہیں تھا، مگر صدارت کے بعد جلد ہی ہونا شروع ہو گیا۔ جب میں نے بڑے سرکاری مسئولین کے مشورے سے ملازمین کیلئے ہفتہ میں ایک گھنٹہ درس قرآن کا فیصلہ کیا تو اس خبر پر ردعمل معلوم کرنے کیلئے دانستہ اس کے نفاذ میں غیر معینہ تاخیر کر دی، ان ہی دنوں ایک بڑے سرکاری ملازم کو دوسرے سے کہتے ہوئے سنا ''ہم سردار قیوم کا قرآن نہیں سنیں گے''۔ میں سمجھ گیا کہ ان کو قرآن پر نہیں، میری نیت پر شبہ ہے، سمجھتے ہیں کہ شاید میں درس قرآن کی آڑ میں اپنے حق میں محراب ومنبر کو استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ دل چیر کر تو میں نہیں دکھا سکتا، عمل سے ہی اس غلط تاثر کو دور کیا جا سکتا تھا، چنانچہ اس کام کو شروع کرنے کیلئے چھ ماہ کا وقفہ کرنا پڑا۔ میرا اندازہ تو یہی ہے کہ اس عرصہ میں اکثر حضرات جن کو اس وقت میری نیت پر شبہ تھا مطمئن ہو گئے تھے، نہ میری کوئی ذاتی غرض تھی نہ کوئی سیاسی مصلحت پیش نظر تھی بلکہ ہر کام خالصتاً اللہ کی رضا کیلئے کرنا چاہتا تھا۔ یہ اندازہ اس لیے درست سمجھتا ہوں کہ جب ہم نے درس کا آغاز کیا تو حکام کی طرف سے عدم تعاون کی کوئی خاص شکایت نہ ملی۔

اس مشق کو محض روایتی درس قرآن کے طور پر چلانا مقصود نہیں تھا، خیال تھا کہ سرکاری ملازمین کو ان کی اپنی ذمہ داری کے بارے میں قرآنی احکامات سے پوری طرح باخبر کر دیا جائے۔ میری یہ بھی خواہش تھی کہ خود سرکاری ملازمین بھی باری باری درس دیا کریں۔ اس

کی حکمت بھی واضح ہے۔ لیکن اب جب میں ماضی پر غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میری وہ کوشش محض ابتدائی خاکہ سا تھا، اس کو بہت بہتر اور موثر بنایا جا سکتا تھا۔ کام جتنا سرکاری کارندوں کیلئے نیا تھا، میرے لیے بھی اسکی نوعیت وہی تھی۔ مجھے اب یہ خیال بھی آتا ہے کہ محض درس قرآن سے ہی بات نہیں بنتی بلکہ اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے، اس دور میں درس قرآن کے خاص معنی لیے جارہے ہیں۔ بعض حضرات کی کوشش یہ ہے کہ محض قرآن کا ترجمہ اور تفسیر ہی کافی ہے، بلکہ اس میں بھی صرف ان کے بیان کردہ معنی صحیح تسلیم کیے جائیں۔ معنی اور مفہوم وہی صحیح تسلیم کیے جائیں جس طرح وہ خود سمجھتے ہیں۔ گویا اس طرح حدیث مبارک کی نفی ہو جاتی ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے لوگوں میں اس کا کافی اثر پہلے موجود ہے۔ چونکہ یہ فتنہ انسان کے اندر خدا سے بغاوت و نافرمانی کی پوشیدہ مرض کے عین موافق ہے اس لیے آسانی سے قبول کیا جاتا ہے۔ لہٰذا لازم یہ تھا اور یہی حقیقی طریقہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کو فقہ و حدیث مبارک سے روشناس کرایا جائے اور ساتھ ہی صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور آئمہ کرام کی مبارک زندگیوں کے حالات سے باخبر کیا جائے، تب کہیں وہ ماحول شروع ہو سکتا ہے۔ لیکن اس وقت تو ہم گویا آگ لگنے کے بعد کنواں کھود رہے تھے، پھر بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کچھ تھوڑا بہت کام ایسا ہو گیا جس پر عمارت تعمیر کرنا نسبتاً کم مشکل ہو گا۔

نفاذ شریعت کے لیے مناسب ماحول:

اسی طرح ایک اور مشکل یہ ہے کہ آیا محض شرعی قوانین کا نفاذ ہی سب مسائل کا حل ہے، اس کے علاوہ بلکہ اس سے بیشتر، اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور کام بھی ہے، اس کا تجربہ بھی مجھے اس مشق کے دوران ہوا جو بہت مفید ثابت ہوا۔ دوسرے لوگوں کی طرح میرا بھی خیال یہی تھا کہ اگر شرعی قوانین نافذ کر دیئے جائیں تو باقی معاملات خود بخود درست ہو جائیں گے۔

مگر میرے خیال میں بعض ذمہ داریاں ایسی ہیں جن کی اہمیت بجائے خود اتنی ہے کہ بعض حالتوں میں قوانین کے نفاذ کو بھی مؤخر کرنا قرین مصلحت ہوتا ہے۔ ان ذمہ داریوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جس کی صحیح مثال وہ ہے جو قحط کے زمانے میں سیدنا عمرؓ نے قائم کی تھی۔ وہ ذمہ داری عوامی مسائل کا حل اور ضروریات زندگی کی فراہمی ہے۔

قوانین کا نفاذ تو امن و امان قائم رکھنے بلکہ یوں کہیئے کہ ایک خاص قسم کا نظم و ضبط قائم رکھنے کیلئے لازمی ہے، اس سے تمام بنیادی انسانی ضروریات خود بخود مہیا نہیں ہو جاتیں، بات اگرچہ ثقیل ہے لیکن میرے خیال میں بلکہ میرا یقین ہے کہ جو حکومت عوام کی ضروریات زندگی اسلام کے اصولوں اور تقاضوں کے مطابق فراہم کرنے کی ذمہ داری نہیں لیتی اور اس کا صحیح اہتمام نہیں کرتی، اس کو اس امر کا بھی حق نہیں ہے کہ وہ محض شرعی قوانین کے نفاذ ہی پر زور دیتی رہے۔ مدینہ منورہ میں مشہور قحط کے زمانے میں خلیفہ دوئم سیدنا عمرؓ کا ہاتھ کاٹنے کی سزا کو معطل کرنا ایسا تاریخی واقعہ ہے جو اپنے اندر ہر زمانے کیلئے راہنمائی کا ایک اصل اصول قائم کر دیتا ہے۔ یہ بنیادی انسانی ضروریات، روٹی، کپڑا اور مکان ہیں۔ قانون کا مقصد افراد کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرنا ہے۔ اگر جان ہی نہ ہو تو حفاظت کس چیز کی کی جائے گی اور اگر روٹی کپڑا اور مکان ہو گا، مگر عزت و آبرو کا تحفظ نہ ہو گا تو وہ سب کچھ بے کار ہے، یہ دونوں کام ایسے ہیں جو بیک وقت ہونے چاہئیں۔ اس ضمن میں جو مجھے تجربہ ہوا گزارش کرتا ہوں۔

صدر ہو کر میں بھمبر کے دورے پر گیا تو ایک جلسہ میں میں نے اسلام اور اس کے نفاذ پر بہت زور دیا۔ جلسہ کے بعد ایک وفد نے ملنا چاہا، معززین کا وفد تھا۔ دروازے بند کر کے ان کے نمائندے نے پوچھا ''سردار صاحب ہم نے وہاں جلسہ میں بات کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ آپ صدر ہو کر پہلی مرتبہ یہاں آئے ہیں، مگر آپ ہمیں یہ کیا اسلام کا درس دے رہے ہیں۔ میں پریشان ہو گیا کہ یہ لوگ کیا بات کر رہے ہیں، میں نے پوچھا کیوں! میں نے

کوئی غلط بات کہی ہے؟''۔ اس نے کہا ''غلط نہیں مگر آپ جانتے ہیں کہ ہم پانی کہاں سے پیتے ہیں''۔ میں آزاد کشمیر میں بہت چلا پھرا تھا اور مجھے عوام کے مسائل سے واقفیت کے بارے میں خاصا زعم بھی تھا، مگر میں نے اعتراف کیا کہ مجھے اچھی طرح معلوم نہیں۔ اس نے کہا ''ہم بارش کا پانی جو جوہڑ میں جمع ہوتا ہے وہ پیتے ہیں، اسی پانی میں سے رات کو سور پانی پیتے ہیں اور دن کو ہم لوگ پیتے ہیں''۔ اس شخص نے جذباتی انداز میں کہا ''آپ اسلامی نظام بے شک بعد میں لائیں، ہمیں پینے کیلئے پاک پانی مہیا کریں، آپ فکر نہ کریں ہم بھی مسلمان ہیں۔ اسلامی نظام لانے میں ہم بھی مدد کریں گے''۔

اس وفد نے میرے لیے علم کا دروازہ کھول دیا۔ مجھے اس وقت محسوس ہوا کہ ترجیحات کیا ہونی چاہئیں۔ اسلامی نظام، مطالبہ کرنے سے قبل بہت کچھ عطا کرتا ہے، محض وصولی پر ہی زور نہیں دیتا۔ اسی طرح ایک اور جگہ سے گزرا تو کچھ خواتین نے میری کار روک لی۔ میں باہر نکلا تو کئی ایک نے اپنے سر میرے آگے کیئے، میں کچھ نہ سمجھا، پوچھنے پر ایک بہن نے کہا ''آپ دیکھتے نہیں کہ گھڑوں کی وجہ سے ہمارے سروں پر سے بال اکھڑ گئے ہیں۔ آپ اسلامی نظام تو جب لائیں گے، مگر ہمارے لیے پانی مہیا کر دیں''۔ اللہ تعالیٰ ان بہنوں کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اس طرح صحیح بات کی طرف میری راہنمائی کی پھر سیدعمرؓ کا وہ فرمان کہ:

''دجلہ کے کنارے اگر ایک کتا بھوکا مر گیا تو عمرؓ اس کا ذمہ دار ہوگا''

اس ضمن میں ایک پورا نظام، اس کے فلسفے اس کی ذمہ داریوں اور نتائج پر محیط ہے، روٹی، کپڑا اور مکان انسان کیلئے مذہب کے بعد اولین بنیادی ضرورت ہے اور تمام مفکرین کے نزدیک بھی ایک اسلامی حکومت کے بنیادی فرائض میں سے ہے لیکن بدقسمتی سے یہ کلمات آج کل خالص لادینی قوتوں کے ساتھ منسوب ہیں اور ہمارے ہاں جو ان کا نام لے وہ سوشلسٹ، کمیونسٹ، کافر اور نہ جانے کن کن القابات سے نوازا جاتا ہے۔ یہ ایسی بنیادی ضرورت ہے کہ اس کے

نام پر لادینی قوتوں نے ایک جہاں کو بے وقوف بنا رکھا ہے اور اپنا الو سیدھا کر رہی ہیں۔

عوام کی داد رسی:

اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں اور اس کے کردار کا ایک اور نہایت ہی نازک اور اہم پہلو ایسا ہے کہ اگر کامل یقین نہ ہو تو اس پر عمل ناممکن ہے، اگر اس پر عمل نہ ہو تو وہ حکومت اپنے اصلی اور بنیادی کردار سے ہی محروم رہے گی، وہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت طاقتور سے کمزور کو اس کا حق لے کر دلاتی ہے، تاکہ توازن قائم رہے۔ یہ تب ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ جب کمزور کے لیے حکمران تک رسائی آسان ہو، محض اس ایک امر سے نہ تو انتظامیہ بے قابو ہو گی، نہ ظالم آسانی سے ظلم کر سکے گا اور نہ کمزور احساس محرومی کا شکار ہو گا، اگرچہ نوعیت کے واقعات اور اصولی بحثوں سے کتابیں اٹی پڑی ہیں، لیکن عملی تجربے کے بغیر اس کا صحیح فہم ممکن نہیں۔

میں جب صدر تھا تو اس وقت جسٹس کارنیلیس مرکزی وزیر تھے۔ وہ قانون کے علاوہ کچھ عرصہ کیلئے ان دنوں وزارت امور کشمیر کے بھی سربراہ تھے۔ میری حلف برداری کی تقریب میں بھی شریک ہوئے تھے۔ چند دنوں بعد میں کسی کام سے ان سے ملنے اسلام آباد آیا۔ سرکاری کام کے بارے میں گفتگو کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا ''صدر صاحب آپ کی جمہوریت کا کیا حال ہے''۔ مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ میں انتخابی مہم کے دوران جمہوریت کے بارے میں کچھ کہتا رہا، کارنیلیس صاحب کہیں اسے اچھی طرح پڑھتے رہے ہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں نے صدارتی رہائش گاہ کا بڑا دروازہ پہلے دن ہی کھلوا دیا تھا کہ بغیر کسی روک ٹوک کے لوگ مجھ سے مل کر اپنی بات بتا سکیں۔ اس سے بھی ایک طوفان اُمڈ آیا تھا جس کا کوئی اندازہ اس سے قبل نہیں ہو سکتا تھا۔

ایک شخص کے لیے جو دن بھر کام میں مصروف رہا ہو شام کو مخلوق خدا کے ذاتی مسائل پر توجہ دینا کس قدر مشکل کام ہے اس کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اس تجربے

سے گزرنا پڑا ہو۔ پھر اس میں میری اپنی مخصوص طبیعت کی وجہ سے اور بھی اضافہ ہو جاتا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں کسی بھی شخص کو خواہ وہ کیسی حالت میں ہی کیوں نہ ہو ٹالنے کی کوشش نہیں کی، خواہ اس کا معاملہ چھوٹا تھا یا بڑا اور براہِ راست میرے متعلق تھا یا نہیں۔ یہ ٹالنے والی عادت ہمارے معاشرے میں عام ہے۔ اولاً تو ہمارے بڑے لوگوں ملاقاتیوں کی ایک حد بندی کر رکھی ہے، تعداد اور مرتبہ دونوں کے لحاظ سے۔ پھر ان میں سے بھی چند ایک خوش نصیب ہوتے ہیں جن کو ٹالا نہ جاتا ہو۔

چنانچہ میں نے کارنیلیس صاحب کو بطور شکایت بتایا کہ اس کا شاہکار یہ ہے کہ ایک فوجی حوالدار میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس نے منگنی کی ہوئی تھی اب جبکہ شادی کرنا چاہتا تھا تو ایک طرف اس کی چھٹی ختم ہو رہی ہے اور دوسری طرف لڑکی والوں نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ میں اس کی یہ بات سن کر دل ہی دل میں سخت کڑھا۔ اپنے آپ پر بھی غصہ آیا اور اس حوالدار پر بھی، مگر میں نے ضبط کیا اور اس گاؤں کے کچھ بااثر حضرات سے کہا کہ ان کا تصفیہ کرا دیں۔ میں نے کارنیلیس صاحب کو بتایا کہ یہ تھی قیامت جس سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ میری بات سن کر وہ سنجیدہ ہو گئے اور ملاحظہ کیجئیے کہ انھوں نے کیا کہا، کہنے لگے ''دیکھئیے صدر صاحب! جس اسلامی نظام کی بات آپ کرتے ہیں اس میں اور دنیا کے دوسرے نظاموں میں یہی ایک بنیادی فرق ہے، اسلامی نظام میں کمزور ترین آدمی کسی رکاوٹ کے بغیر براہِ راست سربراہ مملکت سے مل سکتا ہے۔ آپ کے نزدیک تو وہ منگنی والی بات معمولی تھی، مگر اس کیلئے تو زندگی اور موت کا مسئلہ تھا''۔ پھر کہنے لگے ''اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو اسلامی نظام کی بات مت کریں۔ اس سے وہ نظام خواہ مخواہ بدنام ہو گا''۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے، جب وہ بات کر رہے تھے تو ہماری تاریخ کے وہ اوراق جو اسلامی نظام کا مظہر ہیں، میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ انھوں نے گویا اس طرح اسلامی نظام کی اصلیت بیان کر دی۔

بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت آبادی تھوڑی تھی اور ایسا کرنا ممکن تھا، مگر

اب تو آبادی کا تناسب بڑھ گیا ہے اس لیے اب یہ ممکن نہیں ہے، اور میرے اپنے دل میں بھی یہی خیال پیدا ہوا، لیکن میں نے دیکھا کہ نیت درست اور عزم پختہ ہو تو اس نیکی کے کام میں اللہ پاک برکت عطا کرتے ہیں، ناممکن عین ممکن ہو جاتا ہے۔ البتہ اس میں تقسیم کار کرنا بہرحال ضروری ہے۔ مگر یہ تاثر بہرحال موجود ہونا چاہیئے، سماجی طور پر کوئی بھی ادنیٰ شخص صدر یا وزیرِاعظم سے خواہ کبھی ملے یا نہ ملے لیکن اس کو اس امر کا یقین ہو کہ وہ جب چاہے سربراہ حکومت سے مل سکے گا، اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہوگا۔

میرے علم میں ہے کہ کئی سرکاری ملازمین نے لی ہوئی رشوت ان دنوں واپس کرنا شروع کر دی تھی، کہ شکایت نہ ہو جائے۔ اسی ایک بات سے پورے معاشرے اور نظام حکومت پر کتنا صحت مند اثر مرتب ہوتا ہے، لیکن جن کو اسلامی نظام کے اس کردار پر نہ تو یقین ہو اور نہ علم تو وہ اس میں کئی سوالات پیدا کر سکتے ہیں، مگر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان تمام سوالات کا شافی جواب موجود ہے۔ بلکہ یہ وہ واحد طریقہ ہے جس سے کمزور، جرأت مند اور طاقتور بے بس ہوگا۔ اسی طریقہ سے رشوت کم ہوگی، اسی سے احساس محرومی دور ہوگا اور اسی سے قانون کی صحیح حکمرانی قائم ہوگی۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے حکمران اور محکوم کا تفاوت ختم ہوگا اور ایک ادنیٰ شخص کی جان و مال کی عزت بھی اتنی ہی قیمتی ہوگی جتنی معاشرہ کے کسی اعلیٰ شخصیت کی جان و مال کی قیمت ہوتی ہے۔

اسلامی مساوات اور اس کا اثر:

میرے خیال میں اس کی بنیادی فکر یہ ہے کہ ہو سکتا ہے ایک شخص بظاہر غریب اور ادنیٰ درجے کا آدمی ہو، مگر خالق کی نظر میں شاید وہی ہم سے بہتر ہو، بہتر نہ ہو تب بھی وہ ہم سے کسی صورت کم نہیں ہے۔ اس کی جان و مال اور عزت و آبرو بھی اتنی ہی مقدس ہے جتنی ہماری۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہمیں تو کانٹا چبھ جائے چھینک آ جائے تو ایک زلزلہ آ جائے، مگر اس کے جسم کے سر بازار ٹکڑے بھی کر دیئے جائیں تو پولیس بھی تب تک پرچہ درج نہ

کرے، جب تک قیمت وصول نہ کر لے۔

جب تک حکمران عوام الناس کو نہ صرف یہ کہ اپنے جیسا انسان سمجھے کہ خدائے پاک نے مجھے ان دوسرے اشخاص کی دیکھ بھال، حفاظت اور خدمت کرنے پر مامور کیا ہے، اس وقت تک اسلامی نظام کے اس کردار پر کسی صورت کوئی عمل نہیں ہوسکتا اور اگر اس پر عمل نہ ہو گا تو دل کے بہلانے کیلئے اس کا ذکر کرنا ''خیال اچھا ہے'' مگر ایسا نظام ہرگز وہ نظام نہیں ہو گا جس کو اسلامی کہا جا سکے، نہ اس سے وہ نتیجہ برآمد ہوگا جو اسلامی نظام کا حقیقی مقصود ہے۔ غور کیجئیے تو معلوم ہوگا کہ خلافت راشدہ اور خود خدا کے حبیبﷺ کا کاروبار حکومت میں یہی وہ کردار تھا، جو سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ میں نے جب اس پرغور کیا تو مجھے ''ید خلون فی دین اللہ افواجاً'' کے ارشاد خداوندی کا مفہوم بھی سمجھ آنا شروع ہوا۔ یہ لوگ جوفوج درفوج اسلام میں داخل ہو رہے تھے تو کیا ان سب کو یکا یک اسلام کی حقیقت معلوم ہوگئی تھی، کیا اتنی جلدی توحید، رسالت، قیامت اور سزا و جزا کا پورا مفہوم سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ اس طرح اسلام میں داخل ہوئے جیسا کہ اس آیت مبارکہ کا مطلب ہے۔ ظاہر ہے کہ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر کسی کو بھی اسلام کے ان بنیادی امور کا کوئی ادنیٰ سا علم بھی نہ ہوا ہو گا۔ غور کیجئیے کہ ہم پیدائشی مسلمانوں میں سے بھی کتنے ہیں جن کو ان امور کی کماحقہ سمجھ ہے۔

تو پھر سوال یہ ہے کہ آخر یہ کیا معاملہ ہوا کہ لوگ فوج درفوج دین میں داخل ہونے لگے، معاملہ جیسا کہ عقلاً بھی درست ہے اور تاریخ بھی اس کی گواہ ہے، صرف یہ تھا کہ اسلامی نظام کی بعض خصوصیات جب واضح ہوئیں تو لوگ جو دوسرے نظاموں کے شر و فساد سے پریشان حال تھے، انھوں نے اسلامی نظام ہی کو ذریعہ نجات سمجھا جو بالکل درست تھا۔ انھوں نے جب دیکھا کہ اسلامی نظام نے انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلا دی ہے، گورے کالے اور دوسرے طبقات کی تمیز اور برتری ختم کر دی ہے، سب کی جان و مال اور عزت و آبرو ایک ہی طرح مقدس و محفوظ ہے۔ جن کے آقاﷺ نے اپنی پیاری صاحبزادی کے بارے میں

فرمایا اگر وہ بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ بھی کاٹا جائے گا۔ انھوں نے جب دیکھا کہ حکمران تقویٰ اور دینداری میں اعلیٰ درجے پر ہونے کے باوجود ان ہی کی طرح رہتا سہتا ہے، بلکہ عوام کا خادم ہے، تو بتائیے کہ کون بدبخت ایسا ہوتا جو اس دین کو قبول نہ کرتا۔ بالفاظ دیگر اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے تو بنیادی سبب یہ تھا کہ عوام الناس کے مسائل کو اولیت دی گئی تھی اور ان کو حل کرنے پر دیانتدارانہ توجہ دی گئی تھی۔ اگر اس کو بے ادبی نہ سمجھا جائے تو میں کہوں گا کہ عوام الناس کے لیے ملک ہو یا نظریہ اور دین سب کا زیادہ تر دارومدار ان کے مسائل کے حل پر ہے۔

ذرا غور کیجیے کہ ہمارے ہاں جو عیسائی ہو گئے ہیں یا ہو رہے ہیں یا کسی دوسرے غیر اسلامی نظریئے یا طبقے کو قبول کر رہے ہیں تو کتنے ہیں، جو اسلام کی حقیقت سے واقف تھے یا اب عیسائیت کی حقیقت سے واقف ہو گئے۔ یہ سب قلب ماہیت وہی زندگی کے روز مرہ کے مسائل کا شاخسانہ ہے۔ بلکہ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ عیسائیت، یہودیت اور دوسرے مذاہب چھوڑ کر مسلمان ہو رہے ہیں، ان میں بھی کتنے ہیں جن کو اسلام کی صداقت کا علم ہو گیا ہے۔ وہ بھی مسائل کا ہی قصہ ہے۔ وہ مسائل سیاسی ہوں، معاشی، اخلاقی یا معاشرتی مگر بات وہی ہے۔ ورنہ ہمارے مبلغین ہی خود ایسے کتنے ہیں جن کو اسلام کی صداقت معلوم ہے، ان کے دل اس پر یقین رکھتے ہیں اور ان کا عمل اس کی گواہی دیتا ہے کہ ان کو دیکھ کر یا ان کی صحبت کے فیض سے کوئی غیر مسلم متاثر ہو۔ غیر مسلم تو درکنار خود ان کے گھروں میں کتنے لوگ ان سے متاثر ہیں۔

منیٰ میں کچھ امریکی نو مسلم لوگ میرے پاس آئے، کسی سے ان کو میرے بارے میں معلوم ہوا کہ میرا تعلق سیاست سے ہے، جب بات کرنے لگے تو میں نے ان سے کہا کہ اس سے پہلے کہ وہ بات کریں، میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ ''آپ لوگوں کے مسلم یا غیر مسلم ہونے کا فرق کیا ہے؟'' اس پر انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور

کہنے لگے، ''ہم تمہارے ساتھ یہی بات کرنے آئے تھے''۔

پھر میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کیوں مسلمان ہوئے ہیں؟ تو انھوں نے برملا کہا کہ ''سیاسی اور سماجی ضرورت کے پیشِ نظر''۔

اور یہ بالکل درست بات ہے، اس میں کوئی طعنہ ہے نہ ملامت۔ مسلمان ہونے والے لوگ یا تو بظاہر بلا سبب قلبی تبدیلی کی وجہ سے اسلام قبول کرتے ہیں یا پھر مسائل کی وجہ سے ہم میں سے کتنے ایسے ہوں گے جن کو دیکھ کر یا ان کے قریب رہ کر کوئی ایسا شخص جو اخلاق و عادت میں ہم سے بہتر ہے، اپنا دین چھوڑے گا اور اسلام قبول کرے گا۔ بات لمبی ہو گئی۔ کہنا یہ تھا کہ اسلامی حکومت کا یہی وہ بنیادی کردار ہے جس پر اس پوری عمارت کا انحصار ہے، ورنہ پروپیگنڈے کی حد تک تو ہم جو چاہیں کہیں، مگر وہ بجائے خود ایک المیہ ہو گا۔

جس حکمران کے نزدیک مادی بنیادوں پر عزت و آبرو کی درجہ بندی ہو گی وہ حکمران شخصی طور پر اسلام کے بنیادی تقاضوں کے فہم سے ہی محروم ہو گا، اس کی کوئی بھی کوشش صحیح سمت میں نہیں ہو گی۔ اس آزمائش میں پورا اُترنا کتنا مشکل ہے، اس کا اندازہ ہمیں تب ہو گا جب ہم اپنے گریبان میں منہ ڈالیں۔

میری دیکھا دیکھی یا ایک اخلاقی دباؤ کی وجہ سے بھٹو صاحب نے بھی پاکستان میں ''کھلی کچہریاں'' لگانا شروع کیں۔ لیکن اس کا مطلب کیا تھا، وہ خود ان سے پوشیدہ نہیں تھا۔ انہوں نے مجھ سے غصے سے یہ الفاظ کہے، ''ایسے تیسے افسران غریب لوگوں کو پڑھا کر میرے پاس لاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ میں عوام سے مل رہا ہوں''۔ میں پھر دہراتا ہوں۔ اسلامی نظام کوئی فنی شے نہیں ہے جیسا کہ میں نے صدر پاکستان سے کہا تھا ''اور نہ ہی یہ کوئی ایسا پھل ہے جو خشک درخت کے ساتھ لگتا ہو''۔ اس کی اصل روح عوام الناس کے اس حق کو دل و دماغ سے تسلیم کرنے کا نام ہے ورنہ اسلامی نظام جس کی اساس انسان کی دنیوی اور اخروی بھلائی پر ہے، بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

تدوین قوانین اور قاضیوں کا تقرر:

قوانین کے نفاذ کے ضمن میں ہمیں دو مشکلات بھی پیش آ رہی تھیں۔ ایک یہ کہ ہمارے لوگ عرصہ دراز سے تدوین شدہ قانون کے عادی ہو گئے ہیں، اس لیے ضروری تھا کہ قوانین کو بھی دفعہ وار ترتیب دے کر یکجا کر دیا جائے، ورنہ قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ کے وسیع ذخیرے کا مطالعہ کرنا ہو گا اور پھر ہر شخص کی اپنی علمی استعداد پر بھروسہ کرنا ہو گا۔ یہ بات خود عدلیہ اور عوام دونوں کیلئے غیر یقینی صورت حال پیدا کر دے گی۔ دوسری مشکل یہ دکھائی دے رہی تھی کہ شرعی قوانین کو نافذ العمل کون کرے گا، آیا یہی موجودہ عدالتیں کافی ہوں گی یا اس کیلئے کوئی اور طریقہ کار ہو گا۔ میرے خیال میں اس کیلئے نہ صرف اسلامی قانون کے ماہرین کی ضرورت ہو گی بلکہ اس کام کیلئے لازمی طور پر علمائے کرام ہونے چاہئیں۔ یہ موضوع نہ صرف یہ کہ زیرِ بحث تھا، بلکہ ایک معتبر طبقہ تو علماء کے بارے بے حد سخت موقف رکھتا تھا۔ ان کے خیال میں کارِ حکومت میں ''ملاّ'' کا دخل کسی صورت میں مناسب تھا نہ ہے۔ چنانچہ یہ معاملہ بھی تصفیہ طلب تھا۔

مجھے یاد آیا کہ جب پاکستان میں یہ سوال پیدا ہوا تو مجھے اس کشمکش کا علم تھا۔ لیاقت باغ کے پریس کلب میں جہاں چوہدری ظہور الٰہی مرحوم بھی تھے۔ ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ میں نے کہا کہ اسلامی قوانین کے نفاذ کیلئے صرف علماء کرام ہی کو مقرر کیا جانا چاہیئے۔ ہمارے دوسرے جج صاحبان باوجود اپنے علم کے اس ذمہ داری کے اہل نہیں ہیں۔ دلیل کے طور پر میں نے کہا کہ میں نے قانون کی بعض ایسی کتابیں پڑھی ہیں جو ہمارے ملک میں مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں، لیکن مجھے کسی نے قانون کی ڈگری نہیں دی نہ دے گا۔ اسی طرح جن حضرات نے لائبریریوں میں ٹانگ رکھ کر ناول کی طرح قرآن، حدیث اور فقہ کا مطالعہ کیا ہے وہ کس طرح اسلامی قانون کے ماہر ہو گئے۔

چوہدری صاحب مرحوم کچھ ناراض ہوئے، ان کا خیال تھا کہ اس سے ہمارے جج

صاحبان کی توہین ہوتی ہے، لیکن میں نے تو کسی بدگمانی اور توہین کے نقطہ نظر سے بات نہیں کی تھی۔ یوں تو اسلام میں قاضیوں کیلئے مختلف مفکرین نے جو معیار مقرر کیا ہے، خاص کر وکیع نے اپنی کتاب ''اخبارالقضاۃ'' میں تو اس لحاظ سے خود علماء حضرات میں بھی کم ہی ہوں گے جو اس پر پورے تو کیا اس کے نزدیک بھی ہوں گے۔

میں وہ کتاب پڑھ رہا تھا تو ہمارے ایک خوش طبع مفتی صاحب نے کتاب پڑھنے سے منع کیا، میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگے۔ ''اگر آپ نے یہ کتاب پڑھ لی اور پھر کبھی برسر حکومت آ گئے تو آپ کسی کو قاضی مقرر نہیں کریں گے، اس صورت میں کیا ہو گا''۔

اس میں مشکل یہ تھی کہ نہ تو اس معاملے کو خالصتاً ہماری مروجہ عدالتوں کے سپرد کیا جا سکتا تھا نہ یکا یک علماء کے سپرد کیا جانا مناسب تھا، کیونکہ وہ بطور قاضی فیصلے کرنے کا تجربہ بھی نہیں رکھتے تھے اور ان کی صلاحیت بھی بہر حال محل نظر ہے اور نہ اس معیار کے لوگ اتنے وافر ہیں۔ اور اگر کوئی ہے تو وہ سرکاری ملازمت اختیار کرے گا، خاص کر جب کہ یہ ملازمت تنخواہ وغیرہ سے، ویسے بھی ان کے مرتبہ کے مطابق نہ ہو، تب بھی انتظامی مشینری کسی صورت اس کیلئے تیار نہ تھی کہ علماء کو ان کے ساتھی اہلکاروں کے برابر کا درجہ دیا جائے۔ عام خیال کے مطابق مولوی کا درجہ تو بہر حال دوسرے تیسرے درجہ پر ہی ہو سکتا ہے۔

اس کا ایک تجربہ محکمہ افتاء کے نام سے آزاد کشمیر میں ہو چکا تھا۔ جب میں نے صدارت کا چارج سنبھالا تو اس وقت محکمہ افتاء جو سید علی احمد شاہ صاحب کا قائم کردہ تھا، حکومت نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ مفتی فوت ہو جائے، مستعفی ہو جائے یا ریٹائر ہو جائے تو اس کی آسامی کو ختم کر دیا جائے۔ ایسے میں علماء کو بحال کرنا یا اس سے بڑھ کر مؤثر بنانا اور دوسروں کے ہم پلہ ٹھہرانا، پھر عدل کے کاروبار میں شریک کرنا تو گویا ناممکنات میں سے تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ آزاد کشمیر کی اس حکومت کے پاس پیسہ تھا اور نہ اختیارات، ہر بات کیلئے وزارت امور کشمیر کی اجازت درکار تھی، اور وزارت امور کشمیر وہ گودام تھا جہاں کچھ ڈال دینا تو آسان

تھا مگر واپس نکالنا ممکن نہیں تھا، پھر اس وقت کی وزارت امور کشمیر تو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آزاد کشمیر کا درجہ کم کرنے پر لگی ہوئی تھی، بلکہ اسکا درجہ ایک میونسپلٹی سے بھی کم کرنے کے درپے تھی۔ بہر حال اس کا حل میں نے سوچا کہ ہر عدالت میں ایک قاضی بھی مقرر کر دیا جائے اور اس طرح ایک ڈویژن بنچ کے طور پر یہ عدالتیں کام کریں، ساتھ ہی یہ بھی طے کر دیا کہ اسلامی قوانین کی تاویل کے ضمن میں جہاں اختلاف رائے ہو وہاں قاضی کی رائے کو فوقیت حاصل ہو، جہاں تک سول قوانین کا تعلق ہے اس کو زیر مطالعہ رکھ دیا گیا تھا، تاکہ جہاں کہیں اسلامی قوانین کے ساتھ تصادم ہو صرف وہیں دخل دیا جائے ورنہ نہیں۔ مگر یہ کام شروع میں محض سب جج اور سیشن جج صاحبان کی عدالتوں تک محدود رکھا گیا تھا۔ تیاری یہ ہو رہی تھی کہ عدالت عالیہ میں بھی اسے شروع کیا جائے، بلکہ ایسا ادارہ قائم کرنے کی ضرورت تھی جو خالصتاً علماء پر مشتمل ہو اور نہ صرف تمام اختلافی امور پر فیصلہ صادر کرے بلکہ یہ بھی دیکھ لے کہ کوئی مقدمہ ضلعی عدالت کے بعد اپیل کی صلاحیت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ انتظامیہ کی ممکنہ خواہش یہ دکھائی دیتی تھی کہ یہ معاملہ جہاں تک ہو سکے دور تک نہ جانے دیا جائے، اولاً تو سب جج تک رہے ورنہ زیادہ سے زیادہ ضلعی عدالت تک۔ لیکن اگر اللہ پاک کو منظور ہوتا اور مجھے موقع ملتا تو میں اس نظام کو مکمل کر دیتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے اسلام کے نظام عدل کو ترتیب دینے میں بے حد مدد مل سکتی تھی۔

اس نوعیت کی متعدد مشکلات نے ایک ایک کر کے سر اُٹھایا، لیکن خدائے پاک کا بے پایاں کرم ہے کہ وہ ہمارے کام میں حائل نہ ہو سکیں اور جو رفتار فطری اور طبعی تھی، ہم اس کے مطابق چلتے رہے۔

اس دور میں مرے دل میں ایک احساس یہ بھی پیدا ہوا اور شدت سے ہوا کہ اسلامی نظام کا کام صحیح معنوں میں صرف وہی حکمران کر سکتا ہے جو یہ نہ سمجھے کہ وہ اپنی حکومت کے باعث حکمران ہے اور یہ کہ اسے حکمرانی بہر صورت قائم رکھنی چاہیئے۔ جس کسی بھی حکمران کے

دل میں اپنی حکومت باقی رکھنے کی خواہش پیدا ہوئی وہی گمراہ ہو گیا اور اس کی تمام کوششیں خواہ کتنی ہی درست کیوں نہ ہوں، وہ خدا اور رسول ﷺ کے لیے نہیں بلکہ اس کے برعکس اسلام کو اپنی خواہش کا آلہ کار بنا رہا ہو گا۔ یہ خواہش دنیا کی دوسری تمام خواہشات سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ جیسا کہ عارف رومی نے بھی لکھا ہے کہ:

> ''خدا اور بندے کے درمیان سب سے طاقتور چیز جو حائل ہوتی ہے وہ اقتدار اور اس کی خواہش ہے''۔

ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو یہی ایک ایسی حکمت ہے جس کا حصول اگر ناممکن نہیں تو مشکل ترین ضرور ہے۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز کا علاج سے انکار کرنا گویا موت کو ترجیح دینا بھی یقیناً اسی ایمان اور حکمت کا حصہ ہے، مجھے تو صدر بن کر ان کی یہ بات سمجھ میں آئی۔ لاعلمی اور بے خبری میں تو ایک شخص اس بوجھ کو کندھا دے سکتا ہے، جیسے خود قرآن حکیم نے فرمایا لیکن ہوش میں ایسا کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ اللہ پاک نے بھی اس بار امانت کو اٹھانے کی جسارت کرنے والے کو ظلوماً جھولاً سے تعبیر کیا ہے۔ یہ کام توفیق الٰہی سے ہی ہو سکتا ہے، انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور وہ یقیناً مدد کرتا ہے۔

''ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون'' اسی طرح ''ان اللہ یدافع عن الذین آمنوا''

تعزیراتی قوانین کے نفاذ میں عملی مشکلات:

جب اسلام کے تعزیراتی قوانین کی تدوین ہو گئی اور ہم انھیں نافذ کرنے کے قریب پہنچے تو دو اور واقعات ایسے پیش آئے جو قابل غور ہیں۔ میں نے محض مرکز کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کی غرض سے اس خیال سے کہ کہیں یہ تاثر نہ ہو کہ آزاد کشمیر کوئی علیحدہ خودمختار مملکت ہے مرکز سے درخواست کی کہ پاکستان کی نظریاتی کونسل کا اجلاس مظفرآباد میں منعقد کیا جائے تا

کہ ہم وہ مسودہ ان سے بھی منظور کروالیں یا ممکن ہے وہ اس میں کچھ اضافہ کرنا چاہیں۔ چنانچہ جسٹس محمودالرحمٰن، خدا انھیں غریق رحمت کرے، میں نے انھیں عجیب شوق اور ایمان والا شخص پایا، میٹنگ شروع ہونے سے قبل مجھے ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے، ''کیا واقعی یہ قوانین نافذ کرنا چاہتے ہیں؟'' میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے بے اختیار ہو کر کہا ''کیا آپ مجھے منافق سمجھتے ہیں؟'' وہ کچھ پریشان سے ہو گئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر محبت بھرے انداز میں کہنے لگے، ''صدر صاحب! آپ ناراض نہ ہوں۔ میں نے اس لیے یہ بات پوچھی ہے کہ ہمیں یہی کام سپرد کیا گیا ہے، لیکن جس طریقے سے ہمارے سپرد کیا گیا ہے، اس سے تو قیامت تک ہم کچھ نہیں کر سکتے''۔ میں ان کی بات سمجھ گیا تو میں نے کہا کہ ''ہم تو اس میں سنجیدہ ہیں اور یہ ہمارا جزو ایمان ہے''۔ کہنے لگے ''پھر یہ جو مسودہ ہے اس سے بہتر کچھ نہیں ہو سکتا، ہم اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کر سکتے''۔ انھوں نے اس مسودہ کی تیاری میں پلندری والے مولوی محمد یوسف صاحب کی بہت تعریف کی۔ چنانچہ وہ مسودہ کسی خاص تردد کے بغیر منظور ہو گیا۔ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب سے بھی ان دنوں ملاقات رہی اور ان کے افکار اور تحریروں سے بھی مدد ملی۔

اس ضمن میں دوسری مشکل اس وقت پیش آئی، جب تمام تیاری ہو گئی اور ہم نے اس مسودہ کو اسمبلی کی منظوری کیلئے تیار کر دیا۔ مرکز سے رابطہ ضروری تھا، اس لیے نہیں کہ کوئی قانونی مجبوری تھی، بلکہ یہ ایک اخلاقی و سیاسی پہلو تھا جس کے بہت دور رس نتائج میری نظر میں تھے۔ پہلے تو حفیظ پیرزادہ صاحب سے واسطہ پڑا۔ معلوم نہیں سچ مچ یا مصنوعی طور پر وہ بہت غصے میں تھے۔ پہلے بتا آیا ہوں کہ انھوں نے کہا ''سردار صاحب! آپ یہ قیامت برپا کرنا چاہتے ہیں، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم ملّا کیلئے حکومت خالی کر دیں''۔ میں نے تحمل سے کہا ''پیرزادہ صاحب! ملّا تو بے چارہ خود اس قدر الجھا ہوا ہے کہ اسے اس بات کی فرصت ہی نہیں کہ آپ کی جگہ لے۔ آپ مطمئن رہیں، دوسرے یہ کہ کیا آپ نے یہ مسودہ پڑھا'' بولے

’’نہیں‘‘ میں نے کہا: ’’مصیبت دراصل یہی ہے کہ آپ لوگ کچھ معلوم کیے بغیر فتوے دے دیتے ہیں‘‘۔ پھر کہنے لگے ’’اچھا چلو بھٹو صاحب کے پاس چلتے ہیں‘‘ جب وہاں گئے تو بھٹو صاحب پریشان تھے، کہنے لگے ’’آپ ہمارے لیے کوئی اور بم شیل لائے ہیں‘‘۔ پیرزادہ نے کہا ’’یہ مسودہ تو ٹھیک ہے‘‘ گفتگو طویل تھی۔ مختصر یہ کہ انھوں نے پوچھا ’’کیا اس میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا؟‘‘ میں بات تو ان کی سمجھ گیا تھا، مگر جان کر میں نے کہا کہ ’’قرآنی انجکشن اور نص قرآنی پر تو کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا، باقی ہر بات پر بات ہوسکتی ہے‘‘ جلدی سے کہنے لگے ’’نہیں نہیں، کہیں اخبار والوں کو نہ بتا دینا کہ میں قرآنی انجکشن پر سمجھوتا چاہتا ہوں‘‘ ان کو میرے بارے میں کافی بدگمانی دلوائی گئی تھی۔ تاہم میں نے کہا، ’’آپ مطمئن رہیں، یہ کوئی بات اخبار کیلئے نہیں ہے‘‘۔ میں نے پھر ان سے کہا، ’’ایک اور سمجھوتہ ہوسکتا ہے، آپ مجھے سعودی عرب کی قومیت دلوا دیں تو میں اپنے بال بچوں سمیت وہاں چلا جاؤں اور جاتے ہوئے کراچی میں یہ بیان دے جاؤں کہ میں نے اپنی قوم کے ساتھ جھوٹ بولا اور دغا کیا، اس لیے مجھے یہاں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے‘‘۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ’’وہ بتائیں کہ ان کی کیا رائے ہے؟‘‘ تو ان کا خیال معلوم ہوا کہ رجم اور ارتداد کی سزا کو اگر سر دست پہلے مرحلے میں مؤخر کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔ میں نے ان کے ساتھ اتفاق کیا اور چلا آیا۔ انھوں نے اسی گفتگو میں فرمایا، ’’آپ بھی بزنجو کی طرح ہیں، بات وہ بھی میٹھی کرتا ہے لیکن اپنی بات پر قائم رہتا ہے‘‘۔

آج تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ میں نے ان کی یہ بات کیوں مانی تھی بلکہ بعض لوگ تو شاید کفر کا فتویٰ دینے سے بھی گریز نہ کریں، لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب بھٹو نہ صرف زندہ تھے، بلکہ وہ پورے جاہ و جلال کیساتھ حکمران تھے اور ایسے حکمران کے سامنے انکار کرنا تو درکنار، بات کرنا بھی بڑے دل گردے کا کام تھا۔ پھر میرے سامنے تو یہ بات تھی کہ آیا ان سے لڑ کر سارا معاملہ خراب کرنا بہتر یا لڑائی کے بغیر جو کچھ ہو سکے کرنا مناسب ہے۔

اسی طرح اسلامی تعزیرات کی تدوین یا دفعہ بندی کا کام بھی جیسا کہ محض الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، ایسا نہیں تھا کہ چند دفعات کا کاغذ پر ترتیب کیساتھ لکھ دیا جائے تو کافی ہو گا۔ یہ کام اگر ہم کسی مدرس کے سپرد کر دیتے تب بھی ہو جاتا، مگر بات دراصل یہ تھی کہ اس تدوین شدہ قانون کے بارے میں مختلف مکاتیب فکر کے مابین ربط اور اتفاق رائے ضروری تھا، تنہا مذہبی گروہوں کے علماء کے نزدیک ہی نہیں بلکہ زندگی کے دوسرے مؤثر طبقات اور علماء کے مابین بھی ایک فطری یگانگت کی ضرورت تھی۔ اس میں زیادہ تر ہمارے وکلاء اور عدالت عالیہ اور ضلعی عدالتوں کے جج صاحبان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ تعزیرات کی اس دفعہ بندی پر کوئی ایک سال کے قریب صرف ہوا۔ اس جدوجہد میں ہمارے مقامی علماء کے علاوہ پاکستان کے بعض ماہرین اور صاحب علم حضرات کو بھی گاہ بگاہ تکلیف دینا پڑی۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کو بھی تکلیف دی (واضح رہے کہ یہ وہ متنازعہ فضل الرحمٰن نہیں بلکہ کراچی والے فضل الرحمٰن تھے۔ خدا ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے) پروفیسر ہاشمی صاحب (عبدالقدوس ہاشمی) کے علم و فضل سے بھی استفادہ کیا گیا۔ مولانا مفتی محمود مرحوم اور مولانا محمد یوسف بنوری صاحب سے میری اپنی ایک میٹنگ ہوئی۔ غرضیکہ اس دوران ان تمام طبقات کے معروف نمائندوں سے دل کھول کر بلا حجاب و لحاظ بحث و تمحیص ہوئی اور خدا کا شکر ہے کہ اصولوں پر کوئی سمجھوتہ کیے بغیر ہم ایک متفقہ مسودہ تیار کر پائے۔ وہ حضرات جن کو ہمارے علماء کے علم و فضل اور خود اسلامی قوانین کی افادیت اور ان کے قابل اعتماد عمل ہونے پر شک اور بدگمانی تھی، ان سب نے بخوشی اتفاق کیا۔ اس میں ہمارے دوسرے دینی بزرگوں کے علاوہ مولانا محمد یوسف خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر دے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ان ہی قاضی حضرات میں سے ایک، قاضی عبدالرشید صاحب نے سول قانون پر ایک بے حد مفید، کتاب مرتب کر دی ہے۔

جہاں میں نے ان چند حضرات کا ذکر کیا ہے۔ مجھے اس امر کا اعتراف بھی ہے کہ

شاید کچھ اور حضرات کے نام ذکر کرنے سے رہ گئے ہوں، جس کے لیے میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں چونکہ کوئی ڈائری رکھنے کا عادی نہیں ہوں، اس لیے جو نام یاد آیا وہ لکھ دیا۔ اس کو کسی اور بات پر محمول نہ کیا جائے۔ اگر کسی وقت کوئی اور متعلقہ امر نہ آیا تو کسی اور ایڈیشن میں یقیناً تذکرہ کروں گا۔

قوانین کا تدریجی نفاذ:

جب میں صدر بن گیا تو کچھ ہمدرد لوگوں کا فوری اصرار شروع ہو گیا تھا کہ اسلامی قوانین کو فی الفور نافذ کیا جائے۔ ان میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس سلسلے میں کرنا کیا ہے، بس ایک نیک خواہش تھی جس کی تکمیل چاہتے تھے۔ مگر میں نے ان کی بات پر کوئی کان نہ دھرا اور دھیمے طریقے سے کام کرتا رہا، میں نے ترجیحات کے مطابق اس کام کو شروع کرنے کے لیے دل میں یہ فیصلہ کیا کہ اس کی ابتداء اس طرح کی جائے کہ نہ تو بہت شور وغل ہو اور نہ خواہ مخواہ کسی کو پریشانی ہو۔ مطلب یہ تھا کہ پہلے وہ کام کیا جائے جو آسانی سے ہضم ہو سکے اور کوئی بحث مباحثہ نہ شروع ہو جائے۔ چنانچہ ایک تو چونکہ رمضان المبارک سر پر تھا، اس لیے احترام رمضان کا ایک آرڈیننس جاری کیا۔ پھر جمعۃ المبارک کی چھٹی کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ قومی لباس کا تعین کیا۔ لباس کا تعین کرنے میں کئی مصلحتیں پیشِ نظر تھیں، ایک تو یہ کہ ہمارے لوگ مغربی لباس ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک امتیاز کی علامت کے طور پر پہنتے ہیں اور یہ امتیاز فرنگی کی غلامی کی یادگار ہے، اس سے حاکم ومحکوم کا تصور قائم رہتا ہے۔ سوٹ پہنا ہوا افسر اپنے آپ کو محض سوٹ کی وجہ سے ہی حاکم سمجھتا رہتا ہے اور شلوار قمیض والے کو خواہ وہ بنفسہ کتنا قابل احترام شخص ہو محکوم سمجھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف ذہنی اور طبقاتی کشمکش پیدا ہوتی ہے تو دوسری جانب وہ اپنائیت جو کہ آزادی کے بعد حکومت اور عوام ہونی ضروری ہے وہ نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کے برعکس اجنبیت اور غیریت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی علیحدہ مخلوق ہیں، ہمارے ہم جنس نہیں ہیں۔ اس لیے ضروری

تھا کہ لباس کی وجہ سے جو غیر اسلامی بلکہ غیر انسانی تفریق پیدا ہو کر ہمارے معاشرے کو غیر اسلامی بنا رہی ہے اس کو دور کیا جائے اور بڑے افسروں سے لیکر عام آدمی تک ایک ہی قسم کا لباس پہنیں۔ افسروں کیلئے کافی مشکل تھا کہ وہ اپنے ذہن کو تبدیل کرتے مگر رفتہ رفتہ ان پر بھی اس حکمت عملی کی عظمت بڑھ گئی۔ اس خیال کے برعکس کہ شاید شلوار قمیض سے ان کی عزت کم ہو جائے گی۔ اسی طرح اس تبدیلی سے عوام اور افسروں کے مابین غیرت بھی کم ہونے لگی اور اگر وہ سلسلہ بامقصد طریقہ پر چلتا رہتا تو آزاد کشمیر آج ایک مثال ہوتا۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ اردو کو دفتری زبان بنانے کیلئے نیم دلانہ نہیں، صدق دل سے اور پوری سنجیدگی کیساتھ کوشش کی جسکا نہایت ہی اچھا نتیجہ برآمد ہوا بلکہ حیرت انگیز طریقہ سے نہایت قلیل وقت میں الفاظ، اصطلاحات اور محاورات کا خودبخود ترجمہ ہونے لگا۔

انتظامیہ کی اصلاح:

جب یہ کام ٹھیک سے چلنا شروع ہو گیا تو پھر مزید اقدام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ میرے خیال میں اولین ترجیح انتظامیہ کی تھی کہ اس کو کس طرح اسلامی نظام کی طرف موڑا جائے۔ کیونکہ جب تک انتظامیہ بھی ذہنی اور قلبی طور پر متفق نہ ہو اور دل سے تعاون نہ کرے یا کم از کم یہ کہ مخالفت نہ کرے تب تک اس قسم کی بنیادی تبدیلی لانا کسی صورت ممکن نہیں۔ جب ضیاء الحق صاحب نے مارشل لاء کی قوت سے پاکستان میں شریعت کا نفاذ کرنا چاہا تو میں نے اس وقت کہا تھا کہ موجودہ انتظامیہ کے ذریعہ اسلامی قوانین کے نفاذ کا مطلب کچھ یوں ہو گا کہ جو مشینری لپ سٹک اور پاؤڈر بنانے کیلئے مرتب کی گئی ہو اس سے محض ایک حکم کے تحت جدید ترین میزائیل بنانے کے لیے استعمال ہونے کی خواہش کی جا رہی ہے۔

بہر حال بہت سوچ بچار کے بعد خیال ہوا کہ ایک تو تمام بڑے سرکاری افسروں کو اعتماد میں لیا جائے اور ان کی رائے دریافت کی جائے تا کہ باہمی مشاورت کا فریضہ بھی پورا ہو

جائے۔ کچھ باتیں، جیسا کہ میں کہہ رہا ہوں، ذہن میں ترجیحات کے طور پر متعین تو تھیں، لیکن خواہش یہ تھی کہ انتظامیہ کے لوگ خود ہی تجویز کریں تو یہ زیادہ مناسب ہو۔

چنانچہ میں نے مختلف سطحوں پر اس قسم کی مشاورت کا اہتمام کیا۔ پہلے تو لباس اور زبان کی بات تھی۔ کافی رد و کد کے بعد اس بات پر اتفاق کر لیا اس کی شاید ایک بڑی وجہ یہ بھی ہو کہ وہ جسٹس محمودالرحمٰن کی طرح کسی غلط فہمی میں ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ کرنا کرانا کیا ہے اور کس نے کرنا ہے یہ محض سستی شہرت اور دفع الوقتی کے لیے ہوگا اس لیے کون اس پر بحث کرے۔ بہر حال وہ تو ہوا۔ میرا اب بھی خیال ہے کہ بے شمار لوگ اس وقت ایسے تھے جن کا خیال یہ ہوگا کہ میں یہ سب کام محض سیاسی مصلحت کی وجہ سے کر رہا ہوں۔ جن سیاسی حالات سے ہم لوگ گزر رہے تھے ان کا تقاضا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

مشاورت کی اس قسم کی ایک مشق کے دوران میں نے مزید اقدامات کی خواہش کا اظہار کیا۔ میرے خیال میں یہ تھا کہ سرکاری ملازمین کو باقاعدہ درس قرآن کے ذریعے اس مشق سے مانوس کیا جائے۔ یہ یقین تھا کہ قرآن کریم کے پیغام اور خود اس کے الفاظ اور کلمات میں بھی تاثیر کا اپنا ایک منفرد اعجاز موجود ہے اس کا بھی فائدہ ہوگا اور یہ کام کسی بحث و مباحثہ کے بغیر ہی طے ہو جائے گا۔ لیکن میں یہ بھی چاہتا تھا کہ بجائے اس کے کہ میں یہ تجویز کروں خود انتظامیہ کے سربراہان اگر کریں تو زیادہ اچھا ہوتا کہ وہ اس کام کو اپنا سمجھیں۔ محض میرا ایک حکم سمجھ کر مجبوراً اس پر عمل نہ کریں کیونکہ ایسے عمل کا انجام مجھے معلوم ہے۔

بہر حال خاصی طویل مشق کے بعد اسی طرح ہوا، ان سب نے یہی تجویز کیا۔ ایک پروگرام بھی مرتب ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے سوچا کہ اس پروگرام کی خبر کا ردعمل بھی دیکھ لیں کہ ملازمین دل میں کیا سوچتے ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں۔ میں نے ایک صاحب سے سنا۔

''ہم سردار قیوم کا قرآن نہیں سنیں گے'' مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا میں یہی توقع

کر رہا تھا، کیونکہ اس وقت پوری فضا شکوک و بدگمانیوں سے لبریز تھی۔ اس لیے میں نے پھر اس پروگرام کو کم از کم چھ ماہ تک ملتوی رکھا۔

پروگرام یہ تھا کہ انتظامیہ کے تمام مراکز میں ہفتہ وار درس قرآن ہو تا کہ انتظامیہ کا ہر حصہ اس سے متاثر ہو اور سب کا رُخ ایک طرف ہو جائے۔ اس وقت تو اسی کو بہت کافی سمجھتا تھا لیکن آج سوچتا ہوں کہ وہ پروگرام بھی محض ابتدائی تھا اس کو بہت بہتر بنایا جا سکتا تھا، مگر اس وقت غالبًا اس سے زیادہ ممکن نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ تو وہی تھی، جو میں بیان کر آیا کہ اس کام کیلئے حکومت میں جانے سے پہلے ہم تیار نہیں تھے، دوسرا یہ کہ ہمارے پاس کوئی ایسی ٹیم نہ تھی، ایسی ٹیم یا جماعت کا نہ ہونا بھی ایک بڑا المیہ ہے کیونکہ یہ کام تو کیا کوئی بھی اجتماعی کام ایسا نہیں ہے جس کو کسی ٹیم کے بغیر صحیح طور پر کیا جا سکے۔ بہر حال چھ ماہ بعد ہم نے درس قرآن شروع کیا جو خدا کے فضل سے افتاں و خیزاں چلتا رہا، لیکن جونہی ہماری حکومت ختم ہوئی وہ بھی ختم کر دیا گیا۔ اسی طرح سرکاری ملازمتوں کیلئے امتحانات وغیرہ میں ایک اسلامی نصاب کو لازمی قرار دیا گیا تھا، ہر ملازم کے لیے ضروری تھا کہ وہ اسلام کے علاوہ نظریہ الحاق پاکستان کی وفاداری کا حلف لے۔ ضمناً یاد آیا کہ نظریہ الحاق پاکستان کو پہلی مرتبہ آئینی تحفظ دیا گیا تھا۔

تعلیمی اداروں کی اصلاح:

اس کے ساتھ دوسرا اہم پہلو محکمہ تعلیم ہے۔ اگر تعلیمی اداروں کی اصلاح نہ کی جائے تو اس مشق کا مطلب محض یہ ہوگا کہ آگے آگے ہم تعمیر کرتے جائیں گے تو ہمارے پیچھے آنے والا ریلا اس تمام تعمیر کو مٹاتا جائے گا۔ اس لیے بے حد ضروری ہے کہ زیر تربیت نئی نسل کا قبلہ بھی درست کیا جائے۔ یہ کام بذاتہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس میں دو تین بنیادی مشکلات ہیں۔ ایک تو خود اساتذہ ہیں، شاید ہی کسی تعلیمی ادارے میں ایسے اساتذہ ہوں جن کے مابین شدید نظریاتی اختلاف نہ ہوں، پھر یہ اساتذہ کرام ان اختلافات کو محض علمی و فکری حد تک بھی

نہیں رکھتے، تعلیمی اداروں میں بھی ان کے فروغ کیلئے کام کرتے ہیں، ملک بھر میں شاید ہی کوئی ادارہ ہوگا جہاں یہ فساد نہ ہو، بدنصیبی یہ ہے کہ اختلافات بھی کوئی فروعی نہیں ہیں، ایسے بنیادی ہیں کہ ان کی سرحدیں ملک کی سلامتی اور خود اسلام کے خلاف جا ملتی ہیں۔ اسی طرح اخلاق و عادات میں بھی مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ چنانچہ اساتذہ کی اس کشمکش کے نتیجہ میں آج ہمارے تعلیمی ادارے خاص کر کالج اور یونیورسٹیاں تخریبی اڈے اور اسلحہ خانے بنتے جا رہے ہیں۔

دوسری پریشانی یہ ہے کہ ان تعلیمی اداروں میں طلبہ کی جس قدر تنظیمیں ہیں وہ سب کی سب نہ صرف سیاسی بلکہ اداروں کے باہر کی سیاسی جماعتوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جو سیاسی رسہ کشی باہر ہوتی ہے وہ ہی ان تعلیمی اداروں میں بھی نافذ ہو جاتی ہے، پھر کچھ اسی پر اکتفا نہیں، ان تنظیموں کے ڈانڈے ملک کے باہر کے عناصر سے بھی جا ملتے ہیں۔ طلبہ کے علاوہ بعض اساتذہ کا بھی یہی حال ہے۔ ایک ہزار طلبہ اتنی خرابی نہیں کرتے جتنی اس قسم کا ایک استاد کرتا ہے۔ معصوم ذہنوں کو زہر آلود کرنے کا کام صرف استاد ہی کر سکتا ہے۔ والدین اور حکومت دونوں ہی اس اہم ترین معاملہ میں انتہائی نا اہل اور بے کار ثابت ہو رہے ہیں۔

اس میں تیسرا نقص یہ ہے کہ روز اول ہی سے تعلیمی اداروں کو یتیم خانہ بنا دیا گیا ہے۔ ہمارا پورا تعلیمی نظام بے مقصد اور محض سرکاری ملازم پیدا کرنے پر مرکوز ہے، اس کی وجہ سے معیار اس قدر گر گیا ہے کہ آج ہمارے بعد آزاد ہونے والے ممالک جہاں ابھی تعلیم شروع ہو رہی ہے وہاں بھی ہماری ڈگریوں کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ یہ کافی طویل داستان ہے مختصراً یہ کہ اس کا انتظام بھی بے حد ضروری تھا۔

اس مقصد کیلئے اس وقت محض دو باتوں پر توجہ دی۔ ایک تو یہ کہ مخلوط تعلیم کو ختم کرنے کیلئے اقدامات شروع کیے، اس کا نہایت ہی اچھا اثر ہوا مگر بدقسمتی سے بعد میں اس پر کسی نے بامقصد طریقہ سے عمل نہ کیا۔ تاہم پہلے سے بہتر صورت اب بھی باقی ہے۔

اس ضمن میں جو دوسرا قدم اُٹھایا وہ یہ تھا کہ ہائی سکولوں تک کے تمام اداروں میں صبح کے وقت نظموں کی بجائے قرآن و حدیث اور نماز کا سبق حسب ترتیب پڑھانے کا اہتمام کیا۔ اس کے بارے میں اسی مقالے میں پہلے ذکر کر آیا ہوں۔ اسی طرح ہائی سکولوں میں قرآن کریم پڑھانے کیلئے باقاعدہ قاریوں کو اساتذہ میں شامل کیا۔ پروگرام یہ تھا کہ پرائمری سے ہائی سکولوں اور کالجوں تک ایسا ہی کیا جائے۔ ان اداروں میں با جماعت نماز کا اہتمام بھی شروع کرا دیا تھا۔ اس مشق سے غرض یہ تھی کہ جو پانی بہہ گیا ہے اس کو بہنے دیا جائے مگر جو بعد میں آ رہا ہے اس کا رخ صحیح سمت میں کر دیا جائے۔ میرے خیال میں صحیح اور مناسب طریقہ بھی یہی ہے۔

مشرقی پاکستان کے المیہ کے بارے میں جن لوگوں کو کچھ علم ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس میں تعلیمی اداروں کا کیا کردار تھا اور کتنا تھا۔ میں نے 1958ء میں مارشل لاء لگنے پر صدر ایوب خان کو مشرقی پاکستان کے بارے میں جو خط لکھا تھا اور جو علاج میں بتانا چاہتا تھا اس میں ایک بنیادی امر تعلیمی اداروں سے ہی متعلق تھا۔ میرا یقین تھا کہ اگرچہ اس وقت بھی کافی پانی بہہ چکا تھا پھر بھی اگر توجہ دی جاتی تو اللہ تعالیٰ ضرور ہماری مدد فرماتے۔ یہی تعلیمی ادارے ہیں کہ جن پر آج کفر کی تمام طاقتیں اپنی پوری بساط کے ساتھ حملہ آور ہیں اور ہماری معصوم اور خالی الذہن جواں سال نسل کو ذہنی افراتفری کا شکار بنا رہی ہیں۔

1965ء کی تحریک کے نتیجے میں جب ہزاروں کشمیری مسلمانوں کو پاکستان میں پناہ لینا پڑی تو کئی بچے جو مقبوضہ کشمیر کے تعلیمی اداروں سے آئے تھے، صبح اُٹھ کر السلام علیکم کے بجائے نمستے یا آداب عرض کہتے تھے، ان کو مسلمانوں کی نامور شخصیات کے بجائے ہندوؤں کے بڑے لوگوں کے نام اور تاریخ یاد تھی۔ یہی حشر بھارت کے تمام تعلیمی اداروں کا ہے۔ وہ ایک باقاعدہ سوچے سمجھے سائنٹیفک منصوبے کے ذریعے مسلمانوں کے بچوں کو غیر مسلم بنا رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا تکلیف دہ پہلو ہے کہ سوائے اس کے ہم خود کو بے حمیت اور احمق قرار دیں

اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ غالباً ساری دنیا میں صرف ہمارا ہی ایک واحد ملک ہے، جہاں جواں سال نسل کو طوفانی لہروں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ کوئی سمت ہے نہ ملاح، نہ چپو، بس تنہا کشتی کی طرح ہماری یہ نسل موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہے اور ہم شکایت کر رہے ہیں کہ جواں سال نسل اپنے تاریخی ورثہ کی اہل نہیں رہی وغیرہ وغیرہ۔ جواں سال نسل کے لیے فکری و ذہنی تربیت کا کام مسلم لیگ اور حکومت کو کرنا چاہیئے تھا۔ مگر آج حالت یہ ہے کہ سوائے ان دو کے باقی سب ہی لوگ اس نسل کو تباہ کرنے کیلئے نئے نئے راستوں کی تلاش میں ہیں۔

اگرچہ یہ کام قدرے طویل المدت تھا تاہم میں نے یہ کیا کہ تعلیمی اداروں میں صبح کے اجتماع میں نعرہ تکبیر، اللہ اکبر، اسلام زندہ باد، پاکستان زندہ باد، کشمیر بنے گا پاکستان کا نعرہ شروع کروایا۔ ساتھ ہی نظموں اور غزلوں وغیرہ کا وہ متبادل جاری کر دیا جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ قاری حضرات کا تقرر، نمازوں کا قیام اور مخلوط تعلیم کا خاتمہ، ابھی اس پر بھی پورا عمل نہ ہو پایا تھا کہ میری حکومت کو برطرف کر دیا گیا، پھر کسی کو کیا پڑی تھی کہ اتنا درد سر مول لیتا۔ ہمارے ہاں تخلیقی فکر تو ویسے ہی زوال پذیر ہے لیکن سیاست میں تو نہ صرف مفقود ہے، بلکہ جو ہے وہ بھی منفی اور انتقامی رجحانات کی نذر ہو گئی ہے۔ ابھی منصوبہ یہ تھا کہ زیرِ تعلیم بچوں کی صحت ،اخلاق اور محنت کی عظمت کی بحالی کے بارے میں بھی منظّم طریقے سے کام کیا جائے۔ پھر غلامی کی ایک بڑی لعنت یہ ہوتی ہے کہ غلام قومیں اقدام کے جوہر سے محروم ہو جاتی ہیں، خوداعتمادی باقی نہیں رہتی، ہماری قوم اس مرض کی ایسی زندہ مثال ہے کہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ چنانچہ میں نے خوداعتمادی بحال کرنے اور اقدام کے جوہر کو بروئے کار لانے کیلئے بھی کچھ پروگرام مرتب کر لیے تھے۔ مگر بڑی دقت یہ تھی کہ مسیحا آپ ہی بیمار تھے، وہ جن کے ذریعہ اسے نافذ کیا جانا تھا وہی خود اس مرض میں مبتلا تھے، یعنی اساتذہ کرام، اس لیے دوہری محنت کی ضرورت تھی بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بیماری کا احساس دلانا اور اس کا شعور پیدا کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ یہ کام تنہا صرف اسی ایک محکمہ تک محدود نہیں بلکہ اسکے تمام

متعلقہ شعبوں میں کام کرنے کی ضرورت تھی، پھر میرے ساتھیوں کو خود ان میں کسی امر کا بھی علم تھا نہ احساس وشعور اور نہ ہی ہم میں سے کسی کی ایسی تربیت ہوئی تھی۔ ہمیں حکومت مل گئی تھی اور بس۔ میں نے اپنی عاملہ سے بارہا کہا تھا کہ حکومت تو شاید ہمیں مل جائے گی، مگر ہم اس کیلئے تیار نہیں ہیں، وہی ہوا لیکن اگر وقت ملتا تو ان شاء اللہ یہ سب کمی پوری کر دی جاتی، جہاں تک ممکن ہوتا۔

ہمارے تعلیمی اداروں کی ایک اور خصوصیت ہے جس کو مدنظر نہ رکھنا اپنی پوری قوم کے ساتھ ظلم کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم ابھی تک میدان جنگ میں ہیں ہمارا زیادہ کام ابھی باقی ہے۔ ہمارا جو بھی تعلیمی نظام ہو اسے اس اہم ترین ضرورت اور بنیادی مقصد کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ یہ وہ باریک نکتہ ہے جس کا شعور ہمارے ہاں اگر مفقود نہیں تو کم از کم نمایاں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بات تو محتاج تشریح نہیں ہے کہ آزادی کا بقیہ کام ہماری آنے والی نسل ہی نے مکمل کرنا ہے، لیکن عجیب حماقت انگیز اتفاق ہے کہ اس علم کے باوجود ہمارا تمام تر تعلیمی نظام اس مقصد سے نہ صرف دور کر دیا گیا، بلکہ اس کی مخالف اور منفی سمت اختیار کئے ہوئے ہے۔ یہ بات یوں اچھی طرح شاید سمجھ میں نہ آئے۔

افغان مجاہدین سے خطاب:

مجھے کچھ عرصہ پہلے پشاور میں افغان مجاہدین کے ایک اجتماع سے خطاب کا موقع ملا تو میں نے ان کو دو باتیں زور دے کر خالص طور پر کہیں۔ ایک یہ کہ جس ملک نے ان کو پناہ دی ہے اس کی سالمیت اور استحکام کے تقاضے بھی ان افغان مجاہدین اور قائدین کی ذمہ داری ہے۔ حکومت پاکستان کو فکر نہیں ہونی چاہیئے کہ ان صفوں کی آڑ میں کوئی اور تخریب کاری کر رہا ہے۔ دوسری بات جو میں نے ان سے کہی وہ یہ تھی کہ کشمیر کی جنگ آزادی کے دوران میں نے اپنے سیکٹر میں حکم دے رکھا تھا کہ میرے بریگیڈ کا کوئی افسر پاکستان نہیں جائے گا۔ سوائے اس کے کہ میں خود اس کی اجازت دوں۔ بات یہ تھی کہ وہاں محاذ پر تو ہم بغیر ہتھیاروں کے ننگے،

بھوکے، چنے کھا کر یا مانگی ہوئی خشک روٹیاں پانی یا مرچ کے ساتھ کھا کر لڑ رہے تھے، لیکن دریا کے اس طرف لوگ پنکھے لگا کر کمروں میں صوفوں اور قالینوں پر بیٹھتے تھے، حکم بھی چلاتے تھے اور تنخواہیں بھی لیتے تھے۔ محاذ سے آیا ہوا افسر بھی تو انسان ہی تھا اور اسی خون میں سے تھا۔ وہ بے چارہ کیوں واپس جا کر اس خوفناک آگ میں جلتا۔ چنانچہ ہمارے جس قدر پڑھے لکھے سمجھ دار لوگ تھے وہ رفتہ رفتہ سب راولپنڈی کا رخ کر رہے تھے۔ ہماری اس تحریک کو اس سے بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ لیکن میں نے اپنے سیکٹر پر اس کا کافی حد تک تدارک کیا۔ ورنہ اگر میں چاہتا تو حکومت میں بھی شریک ہو سکتا تھا، لیکن میں نے خود بھی محاذ پر ہی رہنا پسند کیا۔ میں نے افغانوں کو بتایا کہ وہ اس بات کا بھی خاص خیال رکھیں کہ جو مجاہد پشاور یا کوئٹہ میں مرسڈیز کاروں میں بھی پھرے گا، ائیر کنڈیشن میں رات گزارے گا اور خوب گوشت پکا پکایا کھائے گا وہ پھر واپس جا کر سنگلاخ پہاڑوں میں بھوکا پیاسا گرمی و سردی میں چٹانوں پر سو کر لڑائی کیسے لڑے گا۔

یہ بات اس لیے کرنا پڑی کہ اس بار رابطہ عالم اسلامی کی مٹینگ میں افغان مجاہدین بچوں کو سعودی عرب اور دوسرے ممالک میں سکالر شپ دینے کا فیصلہ ہو رہا تھا تو میں نے ان سے کہا کہ افغانستان کا مسئلہ کوئی چند مہینوں یا سالوں کی بات نہیں ہے، اگر بہت جلدی بھی حل ہوا تو نئی نسل ہی اس کو حل کرے گی۔ لیکن اگر ہم نئی نسل کو سعودی عرب، انگلستان، امریکہ اور دوسرے ممالک میں تعلیم کیلئے بھیجیں گے تو ان میں باقی کیا رہے گا۔ کتنے ہوں گے جو آٹھ دس سال زندگی کی تمام آسائشوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد اور ایسی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد جو جذبہ جہاد اور آزادی دونوں کے منافی ہے، واپس جانا چاہیں گے، پھر کیا وہ اس قابل بھی رہیں گے کہ واپس جا کر جہاد کر سکیں۔ میں نے کہا کہ اسطرح تو گویا ہم خود اپنے ہاتھ سے افغانستان کے مستقبل کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ اس لیے میں نے تجویز کیا کہ بچوں کو تعلیم بھی دلوائی جائے، لیکن ان کو ان کے اس اصلی جوہر سے محروم نہ کیا جائے جس کے سبب مفکر

اسلام حضرت علامہ اقبالؒ نے افغانوں کو ایشیاء کا دل کہا۔

آزاد کشمیر میں زیر تعلیم نوجوانوں کی بھی بالکل یہی صورت ہے گویا ہم نے خود ہی ان کو ان کے اس اصلی جوہر سے محروم کر دیا جس کی وجہ سے بھارت جیسے بڑے ملک کے وزیرِاعظم کو 1948ء میں جنگ بندی کیلئے اقوام متحدہ میں فریاد لے کر جانا پڑا تھا۔ آج تو ہم سے ایک مکھی بھی نہیں ڈرتی حالانکہ ہم آج تعداد میں کہیں زیادہ ہیں۔ ہماری کشمکش نے اور پھر حکومتوں نے نہ صرف اس جذبے کو بڑھنے نہیں دیا، اس کی تربیت نہیں کی، اس کو منظّم و مربوط نہیں کیا بلکہ اس کو سرے سے ختم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی یہ کتنی بڑی ناکامی بلکہ نامرادی ہے۔

مجھے چونکہ اس امر کا پورا احساس اور شعور تھا، اس لیے میں نے تعلیمی اداروں پر بھی خاص توجہ دی۔ انتخابی مہم کے دوران کی میری تقریریں اس بات پر گواہ ہیں۔ تاہم مرکزی حکومت نہ صرف اس پر رضا مند نہیں تھی، بلکہ وہ ہر لحہ مجھے صدارت سے ہٹانے کی فکر میں تھے، اس لیے اس پروگرام کو بھی دلجمعی سے نہ چلایا جا سکا۔

روح جہاد کی بیداری:

یہاں یہ بھی گزارش کروں کہ مجھے اپنے اس احساس و شعور کے باوجود اس بات کا بھی شدت سے احساس رہا ہے کہ ہم کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے مرکزی حکومت اور ہمارے درمیان کوئی سیاسی، فوجی یا نیم فوجی تصادم ہو جائے۔ اسی لیے میں نے تنظیم المجاہد کو بھی جس کے بارے میں ہمارے مخالفین دنیا بھر کے الزامات لگاتے ہیں، معطل کر دیا تھا کیونکہ اگر ایسی پرائیویٹ تنظیم ہو گی تو تصادم بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح ملک کے لیے اس سے بدتر کوئی اور بات نہیں ہو گی۔ تاہم بحیثیت صدر حکومت میں نے آزاد کشمیر کے تعلیمی اداروں میں ایک خاص قومی تشخص کا عقیدہ اور نظم و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کام پر کسی اور نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ہماری نئی نسل کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر کے محض بے کار

نہ کر دیا جائے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کو اس قابل بنا دیا جائے کہ اگر وہ سردست کشمیر فتح نہیں کر سکتے، اتنا تو ہو کہ بھارتی سینا جو کہ آزاد کشمیر پر حملے کیلئے پر تول رہی ہے اسے بتا دیا جائے کہ اس کو آزاد کشمیر کے تمام مرد و زن حتیٰ کہ زیر تعلیم ننھے اور معصوم بچوں سے بھی لڑنا ہو گا۔ ایسی قوم کو دنیا کی کون سی طاقت فتح کر سکتی ہے۔ ہماری جواں سال نسل کو شجاعت، ایمان، اتحاد اور نظم و ضبط کا پیکر ہونا چاہیئے، یہ تھی وہ خواہش جس کو بروئے کار لانے کیلئے یہ سب کاروائی کی جا رہی تھی۔

اچھے کام اوروں نے بھی ضرور کیے ہوں گے، اگرچہ اچھا کام اچھا ہی ہوتا ہے، مگر مقصد کی نسبت سے اس کی قدر و قیمت میں بے حد فرق پڑ جاتا ہے۔ نماز وہ شخص بھی پڑھتا ہے جس کی عادت ہوگئی ہے، لیکن ایک وہ ہے کہ نماز کو خدا کا حکم و رسولﷺ کی سنت اور خدا کے معبود حقیقی ہونے کا حق سمجھ کر پڑھتا ہے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، اگرچہ بظاہر نماز ایک ہی ہے۔ میں نے آزاد کشمیر میں جو بھی اقدامات کیے ان کا میرے ذہن میں ایک واضح مقصد تھا، محض مصلحت کوشی یا کوئی وقتی سیاسی مفاد یا سستی شہرت کبھی مدنظر نہیں تھی۔ 19/ جولائی 1973ء کو ہم نے آزاد کشمیر میں جو ہفتہ الحاق پاکستان منایا تھا، جس طریقے سے منایا اور اس میں جس طرح تعلیمی اداروں کو شریک کیا گیا وہی ایک واقعہ ایسا ہے جو اس حکومت کی مقصدیت پر شافی دلالت کرتا ہے۔

آئمہ مساجد کی تربیت:

اس کے علاوہ اسی حکومت نے پہلی بار مساجد کے اماموں کی تعلیم و تربیت کا پروگرام شروع کیا۔ اگرچہ وہ بھی ابھی ابتدائی تجربہ کی حیثیت رکھتا ہے، تاہم اس کو بھی بے حد پسند کیا گیا۔ اس سے بھی کچھ قومی و ملی مقاصد پیش نظر تھے۔ اولاً تو دیہات میں کم تعلیم والے اماموں کی تعلیمی حالت میں اصلاح پیش نظر تھی، پھر ان کے اپنے مابین رابطہ اور تبادلہ خیال ضروری تھا۔ ان میں حوصلہ اور خود اعتمادی پیدا کرنا مقصود تھا۔ پھر ان کے اس طرح باہمی میل جول سے

اس تلخی کو بھی کم کرنا مقصود تھا جو ایک تو محض پیشہ وارانہ فرقہ واریت کی پیداوار ہے اور دوسرے ایک دوسرے سے دوری کی وجہ سے بڑھتی رہتی ہے۔ان تینوں باتوں سے یعنی اسلامی تعزیرات کی دفعہ بندی کے دوران ہر مکتب فکر کے علماء کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کی شمولیت مساجد کے اماموں کی تربیت اور پھر قاضیوں کا تقرر میرے خیال میں ایسے اقدامات تھے جن سے نہایت مفید نتائج برآمد ہوئے تھے جن کا کچھ اثر ابھی تک باقی ہے۔

اگر ان تمام کاموں کو سمجھا جاتا اور جاری رکھا جاتا تو آزاد کشمیر کا معاشرہ جو پہلے ہی نسبتاً اسلام کے زیادہ قریب ہے اور زیادہ ترقی کرتا اور اس کا ایک مفید اثر نہ صرف اپنے ہاں پڑتا بلکہ ایک بامقصد اثر خود مقبوضہ کشمیر پر بھی مرتب ہوتا لیکن ہماری ایک بڑی خامی یہ ہے کہ ہم لوگ ملکی سیاست میں ذاتی پسند اور ناپسند کو قومی مفادات پر ترجیح دیتے ہیں اور معمولی اختلافات کو دشمنی بنا لیتے ہیں۔ابھی تو یہ بھی محل نظر ہے کہ ہم میں کتنے ہیں جن کو قومی مفادات کی کچھ سمجھ بھی ہے اور اس سے دلچسپی بھی۔یہ افراتفری کا عالم اس وجہ سے بھی ہے کہ اولاً تو قومی مفادات کو ذاتی مفاد کے نقطہءنظر سے دیکھا جاتا ہے، پھر یہ کہ قومی مفاد پر بھی اتفاق رائے نہیں ہے۔کسی کے خیال میں کچھ ہے کسی کے کچھ۔حالانکہ اس اختلاف کی بھی گروہ بندی کی جاسکتی ہے اور ہر گروہ کے نزدیک بنیادوں پر اتفاق ہونا چاہیئے۔وہاں تو ہر صورت کوئی اختلاف رائے نہیں ہونا چاہیئے لیکن شومئی قسمت گروہ تو درکنار کوئی دو جماعتیں یا دو لیڈر بھی قومی مفاد پر متفق نہیں ہوتے۔جو کام میرے بعد آنے والی حکومتوں نے محض اس لیے ترک کر دیئے کہ ان کو سردار عبدالقیوم خان نے شروع کیا تھا، وہ سب کے سب ایسے تھے جن میں میری ذات کا کوئی دنیاوی مفاد نہیں تھا۔ اگر وہ میرے لیے مفید تھے تو دوسروں کیلئے بھی اسی قدر فائدہ مند تھے۔ اگر جاری رہتے تو بعد والے بھی اس نیکی میں شریک ہو سکتے اور قومی یک جہتی پیدا ہو جاتی، حالات کا رُخ ایک طرف ہو جاتا۔ جس حکمران یا راہنما کو استحکام کے اس بنیادی اصول کا بھی علم نہیں اور وہ اس پر کبھی عمل نہیں کر پاتا اس سے قومی مفادات اور بڑے سیاسی معاملات میں

ادنیٰ سی توقع وابستہ کرنا بھی غلط ہے۔اس کا ذکر میں کسی دوسری جگہ کر آیا ہوں لیکن یہ مرض ہمارے ہاں اس قدر گہرا ہو گیا ہے کہ ہمارے چھوٹے لیڈروں کا کہنا ہی کیا چوٹی کے لیڈر صاحبان بھی محض دشمنی نما اختلاف کی وجہ سے تاریخی حقیقتوں ہی کو جھٹلانے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔

بعض بڑے ذمہ دار لوگوں سے یہاں تک کہتے سنا ہے کہ نیلا بٹ کا واقعہ محض افسانہ ہے اور یہ کہ سردار عبدالقیوم خان نے مسلح جہاد کا آغاز ہی نہیں کیا۔ جب کہ یہ ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ اس کو جھٹلانے کی کتنی ہی کوششیں کی جائیں۔ وہ فضول ہوں گی اور رائیگاں جائیں گی۔ پاکستان آرمی ہیڈ کوارٹر کا ریکارڈ اس پر گواہ ہے۔ اقوام متحدہ کے کشمیر کمیشن کے سیکرٹریٹ کے ایک رکن رچرڈ سائمنڈ نے اپنی رپورٹ میں اس کا ذکر کیا ہے اور یہ رپورٹ پہلی بار کلکتہ کے ایک اخبار اسٹیٹسمین میں 04رفروری 1948ء کو چھپی تھی۔ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے پاک و ہندو کے ایک رکن جوزف کاربل (JOSEPH KORBEL) نے اپنی کتاب (DANGER IN KASHMIR) اور افواج ہند کے نامور انگریز افسر لارڈ برڈورڈ نے بھی اپنی کتاب (TWO NATION AND KASHMIR) میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ مغرب میں لکھی گئی کئی اور کتابوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔ دوران جہاد اور اس کے بعد بھی جب تک ہم متحد رہے، اس تاریخی صداقت کو کسی نے جھٹلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آزاد کشمیر کے بانی صدر سردار محمد ابراہیم خان نے 21رمئی 1948ء کو نوائے وقت لاہور کے مسٹر اعجاز سجانی کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا تھا کہ جہاد کشمیر کا آغاز دھیر کوٹ سے ہوا تھا اور انہی کی حکومت کے سہ روزہ ''اخبار آزاد کشمیر'' نے 29راکتوبر 1948ء کو استقلال نمبر نکالا تو اس کے اداریے میں لکھا کہ جہاد کا آغاز دھیر کوٹ سے کیا گیا۔ اس اخبار کے اسی نمبر میں ''آزاد کشمیر کا مجاہد اول'' کے عنوان سے جہاد کشمیر کے بانی کے طور پر میرا ذکر ہے۔ سید احمد شہید بریلوی کی تحریک جہاد کے آخری قائد ابو سلمان مولانا فضل الٰہی صاحب وزیر آبادی مرحوم

نے مارچ 1948ء میں ''مسئلہ جہاد کشمیر'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں مجھے جہاد کشمیر کا بانی لکھا۔ حضرت مولانا نے قیام پاکستان کے چند سالوں بعد 128 برس کی عمر میں وفات پائی اور ان کی تنظیموں کے لوگوں نے میری قیادت میں جہاد کشمیر میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ سردار محمد ابراہیم خان کے بڑے بھائی مولوی امیر عالم خان نے تاریخ آزادی کشمیر کے نام سے ایک کتاب 1950ء میں لکھی جس میں اس جہاد میں مجاہدین کی قیادت کرنے والے بعض کمانڈروں کا ذکر کیا ہے، لیکن مجاہد اول میرے نام کے ساتھ لکھا۔ یہ تاریخی حقیقت بھی اب تک محو نہیں کی جا سکی کہ آزاد کشمیر کی افواج میں پہلی اور دوسری پلٹن کی جو ترتیب ہے وہ بھی نیلا بٹ کی نسبت سے ہی ہے۔ کیونکہ اسی مقام (نیلہ بٹ) پر آزاد کشمیر کی افواج کا پہلا سپاہی، پہلی پلاٹون، پہلی کمپنی اور پہلا بریگیڈ قائم کیا گیا تھا۔ مگر قارئین حضرات حیران ہوں گے کہ محض سیاسی مخالفت اور ساتھ ہی الحاق پاکستان کی تحریک کے باعث بعض حضرات یہاں تک پہنچ گئے کہ نہ صرف نیلا بٹ بلکہ سردار عبدالقیوم کے تاریخی اور ناقابل تردید کردار سے ہی انکار کر رہے ہیں۔ اب تو یہ لوگ ان تمام مجاہدین کو جنھوں نے قرون اولیٰ کی یاد تازہ کر دی تھی، جن کی قربانیوں کی بدولت آج ہم آزادی کا سانس لے رہے ہیں اور خود ایک بڑی مسلمان مملکت پاکستان بھی محفوظ ہے ''لٹیرے اور ڈاکو'' کہتے ہوئے شرم و حیا محسوس نہیں کرتے۔ یہ ہے وہ المیہ جس سے ہماری تاریخ گزر رہی ہے۔ دشمن سے کیا گلہ، کافر سے کیا شکایت اس گھر کو اپنے چراغ سے ہی آگ لگائی جا رہی ہے۔ نیز اس قسم کے خیالات کا اظہار کرنے والے کوئی نااہل اور غیر معروف لوگ نہیں ہیں بلکہ کسی کو حادثتاً قائداعظم کی چند روزہ رفاقت نصیب ہوئی تو کوئی اس طرح حادثے سے فوج کا بڑا افسر کہلانے کا مستحق ہو گیا۔

یہ جو جہاد کشمیر میں سب سے پہلے مقام کے طور پر نیلا بٹ کا ذکر آ گیا اور پھر یہ کہ اگر بعض پڑھے لکھے حضرات تاریخی حقیقت کو جھٹلانے کیلئے اس واقعہ ہی کو محض من گھڑت افسانہ بتا کر اپنے دل کو تسلی دیتے ہیں یا انتقام کی آگ بجھاتے ہیں تو کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔

آخر اس تحریک کا کسی مقام سے تو آغاز کیا گیا ہوگا۔ وہ مقام کون سا تھا۔ پھر تاریخ کی بات ہے کہ وہ کون سی تاریخ تھی جو اس تحریک میں اولین حیثیت رکھتی ہے، تو نیلا بٹ سے یہ تحریک 23/اگست 1947ء کو چلائی گئی۔ پھر یہ کوئی ایک دو دن کا معاملہ نہیں تھا۔ دھیر کوٹ کا تھانہ جلانے کے دن سے لیکر جس دن باغ فتح ہوا، یہی نیلا بٹ ہی ہمارا جنگی وفوجی ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہی نہیں بلکہ اگر یہ مقام ہمارے قبضے میں نہ ہوتا تو دریا عبور کر کے مری کے علاقہ میں جانے کا کوئی متبادل راستہ ہی نہ تھا۔اسی کی بدولت ہم دریا عبور کر سکتے تھے۔ اب بعض من چلے یہ بھی کہیں گے کہ بھلا کوئی شخص اس مقام سے تیز رو دریائے جہلم کو پل کے بغیر کیسے عبور کر سکتا ہے؟۔

شیخ سعدی۔ نے اس کا جواب دیا ہے کہ اگر چمگادڑ کو سورج کی روشنی میں دکھائی نہ دے تو اس میں سورج کا کیا قصور ہے اور کیا اس طرح سورج کے وجود سے انکار کر دینا چاہیئے۔ اس مقام ''نیلا بٹ'' کو فتح کرنے کیلئے ڈوگرہ فوج نے کوہالہ اور باغ دونوں جانب سے بھر پور حملے کیے اور بالآخر پسپا ہو کر بھاگ نکلے۔ یہ علاقہ اگرچہ عباسی قبیلے سے آباد ہے، مگر اس ہیڈ کوارٹر میں محض عباسی نہیں تھے بلکہ تحصیل باغ میں آباد درجن بھر دوسرے قبائل کے بے شمار نوجوان، فوجی اور غیر فوجی موجود تھے۔ اسی مقام پر ایک راجپوت نوجوان محمد لطیف خان میرے پہلو میں کھڑا ہوا دشمن کی گولی سے شہید ہوا۔ وہ بیشمار مجاہد اور غازی ابھی زندہ ہیں، جو اس واقعہ میں شریک تھے لیکن آنکھوں پر تعصب اور مخالفت کی یہ تاریک پٹی کہ اس واقعہ کا سرے سے ہی انکار کر دیا جائے، شاید ہی کسی اور قوم کو نصیب ہوئی ہو۔ آزاد اور زندہ قومیں تو اپنی تاریخ پر فخر کرتی ہیں جھٹلاتی نہیں ہیں۔ نیلا بٹ کا واقعہ جہاد آزادی کی تاریخ میں ایک انمٹ یادگار ہے۔ سورج کو انگلی کے پیچھے نہیں چھپایا جا سکتا۔

رہا میرا مجاہد اول ہونا، تو نہ میں نے خود کو مجاہد اول کہا نہ میں نے کسی سے کوئی معاوضہ مانگا، جس کا جی چاہے اپنے ساتھ مجاہد اول لکھتا رہے۔ لیکن اس کا میں کیا علاج کر سکتا

ہوں کہ جب بھی کسی نے انصاف سے تاریخ لکھی تو وہ وہی بات کہے گا جو تاریخ جہاد کشمیر کے صفحات پر مقدس انسانی خون کے ساتھ قیامت تک رقم رہے گی۔ اس میں بخل کے بجائے خدا سے توفیق مانگنا چاہیئے کہ وہ دوسروں کو بھی سچائی کی توفیق دے۔ مگر اس پرانے محاورے کا کیا کیجئے گا جو کبڑے کے بارے میں مشہور ہے کہ اس سے کسی نے پوچھا ''تم سیدھا ہونا پسند کرو گے یا یہ کہ باقی کبڑے ہو جائیں تو اس نے کہا باقی سب کبڑے ہو جائیں''۔

بہر حال یہ ایک بات تو ضمناً یہاں آ گئی۔ جب کبھی اس پر کچھ لکھنے کی نوبت آئی تو ان شاء اللہ تفصیل سے لکھیں گے۔

یہ بھی ایک سانحہ سے کم نہیں ہے کہ اس قسم کے اعتراضات اور انکار کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کو جہاد آزادی میں تنکا دہرا کرنے کی بھی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ گویا وہ اپنی اس محرومی کا اس طرح انتقام لینا چاہتے ہیں، اللہ ان کو ہدایت دے۔ جس نے کچھ خدمت کی ہے اس کو بہر حال دوسروں کی خدمت کا بھی اعتراف ہوتا ہے۔ میں نے جتنے لوگوں کو اس نوعیت کے اعتراضات کرتے دیکھا یا سنا ہے وہ تقریباً سب کے سب وہ لوگ ہیں جو اس سعادت سے محروم رہے بلکہ اگر ان کو موقع مل جاتا تب بھی وہ کچھ نہ کر پاتے۔ واللہ اعلم۔

اقامت نماز:

جب سے میں صدر ہوا، تو میرے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کا آغاز نماز قائم کرانے سے کیا جائے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ نظام صلوٰۃ کو نافذ کیسے کیا جائے۔ نماز جاننے والے ملازمین کا تناسب کیا ہے، اور اس کام کو کہاں سے شروع کریں؟ ان سوالوں کا مثبت جواب تو اور بھی مشکل تھا۔ اس وقت ان کے تمام جوابات لکھنا طوالت کا باعث ہو گا، مگر دو باتیں کہنا ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ اگر اس حالت میں نماز کا نظام نافذ کیا جائے اور نماز نہ پڑھنے والے کو مجرم قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جبکہ اکثریت کو نماز آتی ہی نہیں تو ہم ان کو

باقاعدگی سے پڑھنے پر مکلّف کریں۔ ''اقامو الصلوٰۃ'' کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ پہلے دن سے درجہ کمال کے تصور سے کام شروع کیا جائے، بلکہ اس کام کو اولین ترجیح حاصل ہونی چاہیے۔ اس کا نافذ کرنے کا اہتمام شروع کر دیا جائے۔ میری یہ ترجیح قرآن حکیم کے اس ضمن میں ایک دوسرے ارشاد کے بھی عین مطابق ہے کہ ادع الیٰ سبیل ربك بالحکمه الخ ضمناً یہ بھی کہوں کہ اس لفظ صلوۃ سے مراد اگرچہ تمام بدنی عبادات ہیں، مگر ایک نظام کے نقطہ نظر سے پنج گانہ نماز ہی مراد لی جا سکتی ہے۔

دوسرا یہ طے کیا کہ اس کام کا آغاز بھی بتدریج کیا جائے چونکہ ہم جو یہ نظام نافذ کرنے والے تھے، دوسروں سے بلحاظ درجہ اوپر تھے۔ اس لیے اوپر سے ہی شروع کیا جانا چاہیئے، اس کی حکمت تو واضح ہے جو لوگ ایک نظام کے نافذ کرنے کے دعویدار ہوں گے ان کا اپنا ایمان اور عمل اس نظام کی گواہی نہ دے تو اس کو نافذ کرنے کی کوشش محض ایک مذاق ہو گی۔ بلکہ پرودگار کے اس حکم میں بھی آ جائے گی کہ ''لم تقولون مالا تفعلون'' ترجمہ: تم ایسی بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں، یہ بات خدا کے ہاں بہت بڑا گناہ ہے کہ تم وہ کہو جو کرتے نہیں۔ اس لیے ہم نے زکوٰۃ کے نظام سے قبل صلوٰۃ کا نظام نافذ کرنے کے لیے اپنے آپ ہی کو منتخب کیا۔ چنانچہ صدارتی سیکرٹریٹ اور مرکزی سیکرٹریٹ میں نقیب الصلوٰۃ مقرر کرنے شروع کر دیئے۔ اس کا ایک منظر میں خود سعودی عرب میں شاہ فیصل مرحوم کے ابتدائی دور میں دیکھ آیا تھا، آج کل اس میں بھی قدرے کمی ہو گئی ہے، مگر میرا دل اس سے بے حد متاثر تھا۔ گورنر مکہ کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ اذان کا وقت ہو گیا، وہی دربان جو بڑے ادب سے کھڑے ہوئے تھے، بے دریغ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے اور اسی بے باکی اور تحکمانہ انداز میں صلوٰۃ صلوٰۃ کی صدائیں لگانے لگے۔ ایک لمحے کیلئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس وقت تو حکومت ان چھوٹے ملازمین کی ہے۔ اس کے علاوہ میں خود بھی اپنے رفیقوں اور بڑے افسروں کیساتھ کوشش کرتا تھا کہ سب لوگ نماز باقاعدہ پڑھیں۔ میری مشکل یہ بھی تھی، جو یقیناً

صدر ضیاء الحق صاحب کو پیش آ رہی ہے کہ کوئی ایک بھی ساتھی اور کوئی ایک بھی سرکاری ملازم، بڑا یا چھوٹا نمازی یا بے نمازی، اس قسم کی منظّم مشق کیلئے ذہنی طور پر ہرگز تیار نہیں تھا۔ میں تو کسی وقت خود بھی امامت کر لیتا تھا تا کہ اس کام کو محض تنخواہ دار مولوی کا ہی فرض نہ سمجھا جائے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ سب کام اس وقت ایک زبردست خواہش کے زور سے ہی ہو رہا تھا۔ میرے اپنے وجود میں بھی ابھی وہ باتیں پوری طرح راسخ نہ ہو پائی تھیں، باوجود اس کے کہ یہ شوق مجھے دوران صدارت پیدا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ بچپن سے ہی خدائے پاک نے ودیعت فرمایا تھا۔ لیکن شوق اور استقامت میں بہر حال بہت فرق ہے۔

اس مشق کا اپنا اثر ضرور ہوتا رہا اور آج اگر اسی کام کو پھر سے شروع کیا جائے تو میرا یقین ہے کہ پہلے سے بہت بہتر اور مؤثر طریقہ سے ہو سکتا ہے، وہ دیرپا بھی ہوگا اور وسیع پیمانے پر قابل قبول بھی۔ نظام صلوٰۃ کا ایک طریقہ سعودی عرب کے بعض دور افتادہ دیہاتی علاقوں میں بھی رائج ہے۔ وہ لوگ خود رضا کارانہ طور پر اس کی نگرانی کا اہتمام کرتے ہیں۔ گاؤں والوں نے رجسٹر حاضری رکھا ہوتا ہے اور پانچ وقت حاضری لگاتے ہیں۔

غیر حاضری کے بارے میں دریافت کیا جاتا ہے۔ اگرچہ وہاں دانستہ غیر حاضری کا کوئی تصور نہیں ہے، لیکن ممکن ہے کہ سزا کا اہتمام بھی ہوتا ہو۔

نظامِ عشر و زکوٰۃ:

ایک طرف یہ سب کام ہو رہا تھا اسی کے ساتھ ساتھ ہم تعزیرات کی دفعہ بندی کی مشق میں بھی مصروف تھے، ساتھ ہی عشر و زکوٰۃ کے نظام کی تیاریاں کر رہے تھے، ان کے ساتھ بھی ایک آویزش زوروں پر تھی، بہر حال یہ سب کام ایک ہی وقت پر چلتے رہے۔ جب عشر و زکوٰۃ کی بات ہم نے شروع کی تو مجھے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ اس بارے میں بھی عوام اور خواص دونوں کو ہی اس نظام کے بارے میں معلومات ہیں نہ اس کی اہمیت کا پتہ ہے اور نہ ان کی عادت اس طرح ہے۔ اکثر لوگ جو عشر و زکوٰۃ اپنی جگہ ادا کرتے ہیں ان میں

سے بہت کم ہیں جن کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا صحیح مصرف کیا ہے۔ چنانچہ عشر و زکوٰۃ کا نصاب وصولی، اور اس کے مصرف کا طریقہ کار، یہ سب باتیں ایسی تھیں جن کے بارے میں ضرورت تھی کہ لوگوں کو اچھی طرح آگاہ کیا جائے۔ اگرچہ یہ بھی بحث طلب امر ہے کہ آیا عشر و زکوٰۃ جبراً وصول کی جائے۔ یا لوگوں کی مرضی پر چھوڑا جائے تاہم جو بھی صورت ہو مگر یہ بات بہر حال ہمارے ہاں ابھی اچھی طرح معلوم نہیں ہے کہ یہ کس قسم کا فرض یا حق ہے، اس کا فائدہ کیا ہے اور صحیح طریقہ کیا ہے، یعنی اس کے صحیح مستحق لوگ کون ہیں؟۔

جس وقت ہم اس قانونی مسودے کی تیاری کر رہے تھے اسی کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ و عشر کے مستحق لوگوں کی فہرستیں بھی مرتب کی جا رہی تھیں۔ اس تیاری میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض مقامات پر ان لوگوں نے بھی اپنے نام مستحق لوگوں کی فہرست میں درج کروائے ہیں جو خود صاحب نصاب ہیں۔ یہ اس لیے ذکر کیا کہ اس بارے میں ہمارے ہاں کتنی بے خبری اور لاعلمی ہے، اس کا اندازہ ہو جائے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ عین ان ہی دنوں میں بھٹو صاحب نے سوات و دیر کی ریاستوں میں عشر کی معافی کا اعلان کر دیا۔ ہمارے لیے یہ ایک مشکل ہو گئی۔ لوگوں کو سمجھانا پڑا کہ وہ عشر اور چیز ہے اور یہ ''اسلامی عشر'' دوسری بات ہے۔ تاہم اس کشمکش کا کچھ اندازہ اس اقدام کے پس منظر سے بھی ہو سکتا ہے۔

نفاذ سے پہلے قوانین کا اثر:

بالآخر وہ قانونی مسودہ تیار ہو گیا جس کو اسمبلی میں پیش کیا گیا اور منظوری لیکر اس کے نفاذ کا اہتمام شروع ہو گیا۔ ابھی یہ مسودہ اسمبلی میں پیش نہ ہوا تھا کہ مجھے یہ خیال آیا کہ ہم یہ اتنا عظیم اور بابرکت کام جو کر رہے ہیں اور اس کا نفاذ اگرچہ بے حد اہم ہے، مگر دیکھیں کہ آیا نفاذ کی ان کوششوں کا کچھ اثر بھی مرتب ہوا ہے۔ میرا یقین تھا کہ ان کوششوں کا بھی کچھ اثر ضرور مرتب ہونا چاہیئے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے یہ کیا سوجھی۔ لیکن میرا دل کہتا تھا کہ یہ

نہیں ہوسکتا کہ ان کوششوں کا اثر نفاذ سے پہلے ہی مرتب ہونا شروع نہ ہوا چنانچہ اس مسودے کو اسمبلی میں پیش کرنے سے قبل میں نے انسپکٹر جنرل سے دریافت کیا کہ پیوستہ سال کے جرائم کی ایک رپورٹ مجھے دی جائے۔ انھوں نے جو رپورٹ دی اس کی رو سے جرائم میں حیرت انگیز کمی تھی۔ رپورٹ کے بغیر بھی مجھے اس کا علم تھا مگر میں سرکاری رپورٹیں بھی دیکھنا چاہتا تھا۔تاہم آئی جی پی صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں نے یہ رپورٹ کیوں طلب کی ہے۔ جرائم کی کمی کا آپ اس سے انداہ لگائیں کہ اس پورے ایک سال میں آزاد کشمیر میں 21 چوریاں ہوئیں۔ جن میں 17 چوریاں وہ تھیں جو شرعاً چوریاں نہیں بنتیں، کیونکہ جنگل سے لکڑی چرائی گئی تھی۔ بعض وہ تھیں کہ کچھ مسافر بس سے اترتے وقت سامان بھول گئے تھے ایک چوری اب یاد نہیں کہ وہ کس قسم کی تھی۔ اس طرح چوریاں سو فیصد بند ہوگئی تھیں۔ میرا یقین ہے کہ یہ بات ایک طرف تو اسلامی نفاذ کی محض کوششوں کی برکت تھی اور دوسری طرف بعض اہم انتظامی اقدامات کا بھی اثر تھا۔ یہ انتظامی اقدامات کا ذکر اس لئے کیا کہ میں نے اکثر محسوس کیا کہ یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلامی قوانین کو جاری کرنے کا مطلب بس حکم دینے کی دیر ہے، باقی سب کچھ خود کار طریقے سے خودبخود درست ہوتا جائے گا یہ خیال بے حد غلط ہے۔ جب تک کوئی حکومت انتظامی معاملات کو درست کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کرے گی اس کے نافذ کئے ہوئے جو بھی قوانین ہوں گے وہ محض افراتفری پیدا کریں گے، اور مطلوبہ نتائج برآمد نہیں کر سکتے۔ انتظامی امور میں اسلام یا کفر اور شرعی قوانین کا مسئلہ نہیں ہے، یہ تو محض ایمان، کردار اور انتظامی امور میں صلاحیت کا مسئلہ ہے۔ آج کل ہم جن مسائل میں گھرے ہوئے ہیں وہ سب مذہبی ہیں نہ کہ غیر مذہبی، وہ محض اور محض انتظامی ہیں۔ میں نے صدر پاکستان کو بھی ایک بڑی میٹنگ میں یہ کہا تھا کہ اگر وہ صرف انتظامی معاملات ہی کو درست کر دیں تو اس ملک کے عوام کی اسی فیصد پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ اس میں کسی مذہبی قانون کی ضرورت نہیں ہے یہ تو غیر مذہب بھی کر سکتے ہیں۔ انگریز نے

یہاں شریعت نافذ نہیں کر رکھی تھی مگر ایک اعلی انتظامیہ دے رکھی تھی جس کے بل پر وہ ایک سو سال حکومت کرتے رہے۔ ان کو آج بھی لوگ اچھی طرح یاد کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی خرابی ہوتی ہے تو لوگ کہہ اٹھتے ہیں کہ کیا بات ہے انگریز کی، اس کے وقت میں تو ایسا ہوتا تھا اور ایسا تھا اور واقعی ہوتا تھا۔

خلافت راشدہ جو ہمارے لیے آخری راہنمائی اور کامل مثال پیش کرتی ہے، اس میں بھی اگر غور کیا جائے تو ان مبارک ہستیوں کی انتظامی صلاحیتیں ہی نمایاں دکھائی دیتی ہیں ورنہ اسلامی قانون تو آج بھی وہی ہے۔ جب میں اس بات پر غور کرتا ہوں تو مجھے سرکار دو جہاں ﷺ کا وہ ارشاد مبارک یاد آتا ہے ''خیارکم فی الجاھلیہ خیارکم فی الاسلام'' جوں جوں انتظامی صلاحیتوں کا معیار کم ہوتا گیا توں توں حکومت اسلامیہ کمزرو ہوتی گئی، جب کہ بعد میں آنے والے حضرات میں ایمان، علم، تقویٰ غرضیکہ کسی چیز کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس میں وہ سب ایک سے ایک بڑھ کے تھے۔ لیکن بات اگر کہیں تھی تو وہ محض انتظامی امور سے ہی متعلق تھی اور اس بارے میں خود حضور اکرم ﷺ کا وہ ارشاد جو آپ ﷺ نے ابوہریرہؓ کے کسی جگہ کا امیر بننے کی خواہش کے جواب میں مرحمت فرمایا تھا، بہت بڑی تاریخی دلیل ہے ورنہ حضرت ابوہریرہؓ میں اور کون سی کمی تھی۔

اس سے یہ فطری حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ بعض صلاحیتیں علم و ایمان کا لازمی حصہ نہیں ہیں، وہ محض انسانی ہیں اور کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ہوں گی، اس طویل بحث میں پڑنے کا وقت نہیں ہے، نہ خدانخواستہ اس سے یہ مراد ہے کہ قرن اول کو ہم اپنے حالات پر قیاس کریں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ محض اسلامی قوانین کی تدوین اور ان پر عمل کرنے کا حکم دینا ہی کسی حکمران کیلئے کافی نہیں ہے، حکمران کی ذمہ داری اس سے آگے بھی ہے، وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے تو بھائی حکم دے دیا ہے، کوئی مانے یا نہ مانے میں کیا کرسکتا ہوں۔ یہ تو ایسی بات ہو گی کہ کوئی شخص اپنے آپ سے کہہ دے کہ چلو بھائی نماز پڑھو، مگر اٹھنے، وضو کرنے اور

جائے نماز تک جانے کیلئے اپنے نفس کو آزاد چھوڑ دے کہ میں کیا کروں کہ میں نے تو کہہ دیا ہے۔ اس کام کیلئے بھی ایک انتظامی صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے۔

بہر حال اس بات کو مسئلہ کے طور پر تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن میرا مشاہدہ، علم اور تجربہ یہی ہے۔ مجھے چونکہ اس کا بے حد احساس تھا، اس لیے دوسرے تمام امور کا بھی ساتھ ہی ساتھ خیال رکھتا تھا کہ کہیں میری نااہلیت، کوتاہی یا لاپرواہی اسلامی نظام کے کھاتے میں نہ پڑ جائے اور کل لوگ یہ نہ کہنے لگیں کہ اسلامی نظام تو اس زمانے میں نافذ ہی نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جن کو ان کے خام علم نے گمراہ کر دیا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا نظام محض اسی وقت کے ساتھ مخصوص تھا۔ اس کا ایک تجربہ ہمیں بھی ہوا۔

ایک جدید تعلیم یافتہ مجتہد:

جب ہم اسلامی قوانین وعشر زکوٰۃ کا مسودہ تیار کر رہے تھے، عین ان ہی دنوں میں ہمارے ہاں ایک جدید تعلیم یافتہ مجتہد پیدا ہو گیا۔ محکمہ تعلیم کا سربراہ تھا اور کچھ کتابوں کا مصنف بھی۔ اس کے بارے میں شنید یہ تھی، واللہ اعلم کہ وہ پہلے احمدیہ جماعت سے تعلق رکھتا تھا، پھر پرویزی مکتبہ فکر کا حامی ہو گیا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر جو تاویلیں زکوٰۃ اور ہاتھ کاٹنے کے بارے میں کر رہا تھا، وہ تقریباً اسی قسم کی تھیں جو مؤخر الذکر گروہ کے بانی کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں۔ وہ صاحب کہہ رہے تھے کہ زکوٰۃ کا کوئی نصاب نہیں ہے اور ہاتھ کاٹنے کا مطلب یہ جسمانی ہاتھ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اس کی مالی حالت ہے۔ یعنی چور کو جرمانہ کیا جائے، ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ نہ معلوم کہ ان صاحب کو خود یہ اجتہاد سوجھا یا ان کو اس کام پر لگایا گیا۔ کیونکہ اس وقت بھٹو صاحب خود اور ہمارے حنیف رامے صاحب ان پر بہت شفقت فرماتے تھے۔

انکار سنت:

اس بحث میں بھی اس وقت پڑنا مشکل ہے کہ جو کچھ وہ صاحب کہہ رہے تھے اس کی حقیقت کیا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں سنت رسولﷺ کے کھلے انکار پر مبنی تھیں، جس کا اندازہ ہر وہ مسلمان کرسکتا ہے جس کا ادنیٰ سا تعلق بھی اسلام کے ساتھ ہے۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آزاد کشمیر میں اس فتنہ کو اُجاگر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ہماری وہ کوشش اسی بحث و مباحثہ کی نذر ہو جائے۔ ان کا خیال یہ بھی ہو گا کہ سردار عبدالقیوم چونکہ مولوی نہیں ہے، اس لیے اس کو گمراہ کرنا مشکل نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ کبھی میرے پاس حضرت علی ہجویریؒ کی تصنیف ''کشف المحجوب'' لے آتا، کبھی کوئی بحث، کبھی علامہ اقبال کے شعروں کا سہارا لیتا۔ میں نے ایک بار تنگ آ کر اس سے کہا کہ، کیا حضرت علی ہجویری اور علامہ اقبال دین اسلام میں کوئی آخری سند ہیں۔ میں نے کہا اگر ان کو ہی سند مان لیا جائے تو پھر منطقی بات یہ ہے کہ جس کو یہ سب لوگ خود بھی سند مانتے ہیں، جناب رسالت مآبﷺ ان کو کیوں نہ آخری سند مانا جائے۔ میں نے اس سے کہا کہ ان حضرات کے کلام کی تاویلیں ہوسکتی ہیں اور میں ان کی یہ تاویل کرتا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔

اجتہاد کی شرط:

ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ اجتہاد یا تجدید کرنے کے لیے کسی کا ہدایت پر ہونا ضروری ہے کہ نہیں۔ کہنے لگے ہاں ضروری ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن کہتا ہے ہدایت صرف متقی لوگوں کیلئے مخصوص ہے، آپ متقی کی کس تعریف میں آتے ہیں۔ میں نے پوچھا، آپ نماز باقاعدہ پڑھتے ہیں، کہا کبھی کبھی، میں نے کہا، آپ نصف رات تک کلب میں بیٹھتے ہیں۔ انکار کیسے ہوسکتا تھا۔ اس قسم کی باتیں پوچھ کر میں نے کہا، ان سب کے باوجود آپ کو ہدایت مل گئی، مگر ہم باقی لوگ اس سے محروم ہیں۔ میں نے کہا بھائی، توبہ کرو، خدا سے معافی مانگو، اس شخص کی سرتوڑ کوشش یہ تھی کہ مجھ پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا جائے تا کہ میرا یقین متزلزل ہو

جائے اور میں باز آ جاؤں۔ جب وہ نہ ہوا تو ان کو محکمہ تعلیم کی سربراہی سے علیحدہ ہونا پڑا اور ہماری جان چھوٹ گئی۔ ان کو پھر مرکزی حکومت میں جگہ مل گئی۔ مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے اجتہاد کا کیا بنا۔ دیکھئیے اس ملک کی نیرنگیاں، انہی صاحب کو جن کا عقیدہ قارئین کو معلوم ہو گیا ہے بعد میں اسلامی نظریاتی کونسل کے کسی شعبے میں شامل کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں نے ایک صاحب سے ذکر کیا تو کہنے لگے اس کو ماہر معاشیات سے لیا گیا ہے۔ میں نے کہا تو پھر دنیا میں کتنے غیر مسلم بلکہ اسلام دشمن ہوں گے جو اسلامی معاشیات کے اس سے بھی بڑھ کر ماہر ہوں گے، ان کو کیوں نہ بلایا جائے۔

گمراہ کن تفسیر و تاویل:

وہ ان دنوں آزاد کشمیر کے تعلیمی اداروں میں دورے کر کے تقریریں کر رہا تھا اور اپنے ہم خیال استادوں کے ذریعے تعلیمی اداروں میں ہماری نوجوان نسل کو جس کا دینی علم تو تھا نہیں، البتہ وہ سیاسی کشمکش میں تھے، متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غالباً غرض یہ تھی کہ ایسے طلبہ جو پی پی کی فکر سے متاثر تھے اور پھر وہ جو نظریہ خودمختاری، لبریشن لیگ اور میری مخالف تنظیموں سے وابستہ تھے ان کو منظّم کر کے سامنے لایا جائے۔ جب وہ باہر نکل آئیں گے اور فسادات شروع ہوں گے تو مرکزی حکومت ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق مداخلت کرے گی جس کے نتیجے میں یا حکومت ہی بدل جائے گی یا سردار قیوم کا دماغ درست کیا جائے گا اور اس طرح اسلامی نظام کی خواہش کا یہ دھندا ختم ہو جائے گا۔ مرکزی حکومت میں اس قسم کی کارروائیاں روز بروز ہو رہی تھیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، مگر خدا نے کیا کہ وہ ناکام ہو گئے۔ اس شخص کی حمایت میں بھٹو صاحب نے مجھے ذاتی خط لکھا تھا اور پھر دوسرے خط کے ذریعے اس کی تصدیق کی۔ حنیف رامے صاحب نے مجھے ان کے بارے میں خط لکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آزاد کشمیر اور پاکستان دونوں کا دارومدار اب ہمارے محکمہ تعلیم کے اس سربراہ پر ہے۔ ان کو بروقت علیحدہ کر دیا گیا، ورنہ بعد میں جو کچھ ہوا اس میں وہ مرکزی کردار ہوتے۔ مجھے وقتاً

فوقتاً یہ بھی معلوم ہوتا رہا کہ ملازمت سے علیحدہ ہو جانے کے باوجود اپنے مشن کیلئے وہ کوشش کرتے رہے اور آزاد کشمیر میں رابطہ قائم رکھا۔ میں نے تو سچی بات ہے کہ اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ہمارا کام تو بس ایک حد تک کوششوں پر موقوف ہے، نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس بات پر قادر ہے کہ ویرزقہ من حیث لایحتسب ایسی جگہ سے انتظام کرے کہ انسان کے گمان کو بھی وہاں تک رسائی نہ ہو۔ خداوند قدوس نے ان تمام گھناونی سازشوں کو ناکام کر دیا اور جتنا کام ہم سے لینا مقصود تھا وہ لے لیا۔ والحمد لله علیٰ ذالك۔

اسی سے مجھے یاد آیا کہ یہ حالت محض میری ہی نہیں تھی، بلکہ اس وقت پاکستان میں اسلام کے نام پر جو کچھ عمل ہو رہا ہے اس کا بھی یہی حال ہے۔ یہاں بھی صدر صاحب کے اردگرد ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جو درحقیقت اس قسم کے اسلامی نظام کو محض ملائیت قرار دیتے ہیں اور نہایت چالاکی سے صدر صاحب کی کوششوں کا حلیہ بگاڑنا چاہتے ہیں، بلکہ اس طرح ناکام کرنے کی کوشش میں ہیں کہ پھر کوئی نام ہی نہ لے۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا تجربہ ہے کہ صدر صاحب کے دائیں بائیں بلکہ اعتماد والے لوگوں میں بعض نے مجھے بھی تبلیغ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ حضرات جن کے پاس محض بیٹھنے سے بھی کفر کا تاثر ملتا ہے اور جن سے ہاتھ ملانے سے ایمان میں کمی ہوتی ہے وہ بھی اپنے آپ کو مبلغ اسلام سمجھتے ہیں، کبھی اھدنا الصراط المستقیم کی من گھڑت تفسیر کبھی ہدایت کے نئے معنی، کبھی صلوٰۃ، زکوٰۃ اور قطع ید کا نیا مفہوم، وہ بات کر رہے ہوتے تو میں سوچ رہا ہوتا کہ خدا کی شان ہے جن کو فرض غسل کی توفیق بھی نہیں ہوتی نہ اس کو فرض ہی مانتے ہیں، وہ بھی مجھے ایمان اور ہدایت کے معنی سمجھانے کی فکر میں ہیں۔ دراصل یہ وہی انکار حدیث یا انکار سنت رسول ﷺ کا فتنہ ہے جو زیادہ تر حکومت کے ایوانوں کو ناپاک کرنے کی فکر میں ہے۔

فتنہ پرداز حاشیہ نشین:

اگر مارشل لاء نہ ہوتا تو یہ لوگ جو یوں بھی بڑے اثر و رسوخ والے ہوتے ہیں،

صدر صاحب کو اس اسلامی نظام میں ایسا چکر دیتے کہ وہ بھی یاد رکھتے۔اس کے باوجود جب میں غور کرتا ہوں تو دکھائی دیتا ہے کہ ان لوگوں نے صدر صاحب اور صحیح العقیدہ اسلامی عناصر کے درمیان بداعتمادی اور بدگمانی کی ایسی خلیج حائل کی ہوئی ہے کہ اگرچہ زبان سے نہیں کہا جاتا، مگر خیال ہی خیال میں کچھ عجب نہیں کہ دونوں جانب کفر کے فتوے لگتے ہوں۔ یہ لوگ اپنی منافقانہ روش کی وجہ سے ہر حکمران کی ناک کا بال بن جاتے ہیں، خاص کر وہ حکمران جن کا عوام اور عوامی قوتوں کے بارے میں اپنا براہ راست علم نہیں ہوتا وہ تو ان ہی دوست نما دشمنوں کو اپنا سب کچھ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کا اولین کارنامہ اور واردات یہ ہوتی ہے کہ وہ محبّ وطن اور صحیح اسلامی قوتوں کے بارے میں حکمران کو یہ باور کرائیں کہ دراصل یہ ہیں وہ لوگ جو وطن دشمن اور حکمران کی ذات کے دشمن ہیں۔

میں نے خود کئی ایسی رپورٹیں دیکھی ہیں جو میرے اور کئی دوسرے اشخاص کے بارے میں تھیں، مگر ان کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔لیکن حکومت کے نزدیک وہ بہر حال حرف قرآن سمجھی جاتی ہیں۔ضمناً ذکر کروں کہ ہمارے آزاد کشمیر کے ایک صدر محمد حیات خان اسی قسم کی کارروائی خود بھی کرتے رہے اور ان سازشی رپورٹوں کو بھی بطور تصدیق بڑھا چڑھا کر صدر صاحب کو پیش کرتے رہے۔ اگر کوئی بھی شخص جس کا اپنا علم نہ ہو وہ ان رپورٹوں پر عمل کرے تو میں اور مجھ جیسے کئی دوسرے لوگ گردن زدنی ٹھہریں گے اور یہ آسان طریقہ ہے جس سے اس ملک میں استحکام نہ پیدا ہونے دیا جائے اور پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے سے باز رکھا جائے۔کسی بھی ملک کی اس سے زیادہ کوئی تخریب نہیں ہوسکتی کہ اس ملک میں رہنے والے محبّ وطن عناصر کو مایوس، بدگمان اور لاتعلق کر دیا جائے۔ ایسا ملک اور ایسا معاشرہ ریت کے گھروندے کی طرح خودبخود زمین بوس ہو جاتا ہے۔حکومت ملک کے دشمنوں کو محبّ وطن عناصر میں تلاش کرنے پر لگ جاتی ہے، جبکہ اصل دشمن اس کی گود میں بیٹھے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں اسلامی نظام اور پاکستان اور خود اسلام یکجا ہو گئے ہیں، اس

لیے جو سازش پاکستان کی تخریب کیلئے ہو گی، وہی خود بخود اسلام کی قوت کو کمزور کرے گی۔ اسی طرح اس کے برعکس بھی۔ اس لیے ان امور کو یکجا کر کے بیان کرنا پڑ جاتا ہے۔

عشر و زکوٰۃ کے نفاذ کا معاملہ:

عشر و زکوٰۃ کے نفاذ میں بھی کئی بحثیں ہیں، نصاب کیا ہے، صاحب نصاب کون لوگ ہیں، نصاب کا بنیادی معیار کاغذ کا روپیہ ہے یا چاندی ہے یا سونا ہے۔ بنکوں میں جمع رقوم پر زکوٰۃ کی صورت کیا ہے۔ فیکٹریوں اور کارخانوں کے بارے میں نصاب کا اطلاق کس طرح ہو گا اور کیا زکوٰۃ کے بعد کوئی اور ٹیکس بھی لگ سکتا ہے کہ نہیں وغیرہ وغیرہ؟۔ اس قسم کے بے شمار سوالات ہیں جن پر اس وقت بھی بحث تھی اور آج بھی ہے بلکہ جاری رہے گی۔ میں نے اپنے اس خیال پر عمل شروع کروایا تھا کہ ہم بہت دھیمے طریقے سے کام کریں اور ان بحثوں میں سردست نہ پڑیں، جن کا منطقی اور علمی حل دریافت کرنا بہت دقت طلب ہے۔ ہم لوگ چونکہ مزاجاً بھی بحثوں کو جاری رکھنے کا شوق رکھتے ہیں اس لیے یوں بھی کسی بحث کا کوئی ایسا مشترکہ حل نہیں ہے جو سب کو خوشی سے قبول ہو۔ ہمارے اس قومی مزاج کے علاوہ ایک اور امر جو بحثوں کو جنم دیتا ہے اور لامتناہی کر دیتا ہے وہ ہمارے دلوں کا چور ہے۔ یہ بھی اب ہماری عادت میں شامل ہے کہ ہم دینی امور میں رخصت اور چھوٹ کے بے حد خواہش مند ہیں۔ وہ علماء اور مشائخ حضرات جو سختی سے سنت رسول ﷺ کی طرف بلاتے ہیں، ہم لوگ انھیں دقیانوسی اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ تو کھلم کھلا کہتا ہے کہ دین کو ان ملاؤں نے مشکل بنا دیا ہے، ورنہ وضو، طہارت، نماز کی رکعتیں اور ترتیب رکوع و سجود، یہ سب باتیں غیر ضروری ہیں۔ گویا یہ سب ''ملاؤں'' کی دریافت ہیں۔ چنانچہ ہمارے بعض مفکرین نے اسی جدید تقاضے کو مدنظر رکھ کر دین کو گویا آسان بنانا شروع کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض تو کھلم کھلا حدیث مبارک اور شارع اسلام کی سنت کے منکر ہو گئے اور بعض دوسروں نے درمیانی راستہ اختیار کیا، انکار کرنے سے اگرچہ گریز ہی کیا، مگر سنت رسول ﷺ کی اہمیت کو بالواسطہ کم

کرنے پر زور دیا۔ گویا یہ طبقہ منکرین کے لیے دروازے کا کام دے رہا ہے۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ ہم اس حالت میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھائیں، کیونکہ میرا اس پر بلا دلیل یقین ہے کہ اگر نیک نیتی سے قدم اُٹھے گا تو ہر قدم کے بعد دوسرے قدم کے لیے آسانی ہوتی چلی جائے گی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ اللہ ان کے درجات بلند کرے، ہمارے شیخ کے پاس بظاہر آوارہ منش نوجوان بھی آتے تھے اور اپنی بعض پوشیدہ خواہشات کے لیے بھی دعا وتعویز کی درخواست کرتے تھے۔ حضرت چونکہ اخلاق محمدی ﷺ کا بھی ایک عجیب مظہر تھے، وہ ان باتوں کو غور سے سنتے اور پھر اس شخص کو رات کو وضو کر کے چند کلمات پڑھ لینے کے لیے بتا دیتے۔ وہ بے چارہ کسی اور خیال میں تردد شروع کرتا، جب وضو کر لیتا تو خیال کرتا کہ چلو بھئی وضو تو ہے نماز ہی کیوں نہ پڑھ لیں۔ اس طرح گویا اس کیلئے راستہ کھلتا جاتا اور وہ اس تصوراتی اور جنسی دنیا سے ہٹ کر اپنی اصل کی جانب چل پڑتا۔

چنانچہ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ہم اسلامی نظام کے بارے میں بہت آسان قدم اُٹھاتے رہے اور راستہ کھلتا چلا گیا۔

سود سے چھٹکارا:

اس کے ساتھ یہ خیال بھی لامحالہ پیدا ہوا کہ سود سے کس طرح جان چھڑائی جائے گی۔ اس پر بھی ایسی طویل اور لانیحل بحث ہے کہ ہمارے بعض خود ساختہ محققین کا عقیدہ ہی بدل گیا اور انھوں نے سود کو جائز قرار دینے کیلئے قلم آزمائی کی۔ میرا خیال وہی تھا کہ ہم کہیں نہ کہیں سے تو اس معاشرے میں معاشی پاکیزگی شروع کریں، خواہ وہ بظاہر کتنی غیر اہم ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ حکومت اور ملازمین سرکار کے درمیان لین دین پر جو سود لگتا تھا، وہ میں نے معاف کرنے کے احکامات دے دیئے۔ جس کے نتیجے میں لاکھوں روپے کی سودی رقم سے حکومت محروم ہوگئی۔ مجھے یاد نہیں کہ اس کمی کا اتنا احساس بھی کیا گیا ہو جتنا کسی کی بھری ہوئی جیب سے ایک روپیہ کے گر جانے سے ہوتا ہوگا۔ ملازمین نے بھی اس کو اپنے اپنے خیال پر

ہی قیاس کیا، لیکن اس کو پسندیدگی کی نظر سے ہی دیکھا گیا۔ اس سے اسلامی معاشرے کے قیام کے ضمن میں خاصا صحت مند اثر ہوا۔ کیونکہ عام تاثر یہی ہے کہ اسلامی نظام صرف مطالبہ ہی کرتا ہے، دیتا کچھ نہیں ہے، سوائے قیامت میں جو ملے گا سو ملے گا۔ اتنا انتظار ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ معمولی سا اقدام انتظامیہ میں بھی اعتماد اور یک دلی پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔

مسودہ قانون اسمبلی میں:

جب یہ سب معاملات ایک خاص مقام پر پہنچے تو میں نے تمام بڑے سرکاری ملازمین کو جمع کیا اور ان کو بتایا کہ اتنی طویل مشق اور مسلسل تجربے کے بعد اب ہم ایسے مقام پر آ گئے ہیں کہ پیچھے آنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، اب اسلامی قوانین کو نافذ کرنا ہی ہو گا۔ اس لیے میں نے ان سے کہا کہ اگر ان میں کوئی ایسا ہے جو اس بات کو پسند نہیں کرتا یا اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تو اس کیلئے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ نیک نیتی اور آزادی سے استعفیٰ دے دے اور گھر چلا جائے۔ میں نے ان کو بتایا کہ اس میں تو کوئی ناراضگی نہ ہو گی کہ ایک شخص دیانتداری سے معذوری کا اظہار کر دے، لیکن کسی قسم کا عدم تعاون یا شرارت برداشت نہیں ہو گی۔ اگرچہ مجھے علم تھا کہ جوتا کہاں کاٹتا ہے اور اس کے محرکات کیا ہیں۔ جیسا کہ میں ذکر کر آیا ہوں۔ مگر ایک غالب اکثریت دل سے خواہاں تھی کہ ہمارے ہاں یہ کوشش کسی صورت آگے بڑھے، بہر حال کسی نے مخالفت نہ کی اور ہم نے وہ مسودہ اسمبلی کی منظوری کیلئے بھیج دیا۔

اس وقت ہمارے مجموعی مزاج نے معاف نہ کیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ خدا اور رسول ﷺ کا قانون ہے، اسمبلی کون ہے جو منظوری دے۔ اس پر بھی کافی لے دے ہوئی، مگر اس میں کوئی قباحت نہ دکھائی دی۔ کیونکہ اسمبلی کی حیثیت ایک تو یہ ہے کہ وہاں تمام معاملات کی چھان بین ہوتی ہے تاکہ کوئی گوشہ اوجھل نہ رہے اور یہ نہایت عمدہ بات ہے۔ خلفاء کے وقت میں بھی قوانین کے نفاذ پر مسجد نبوی ﷺ کا مجمع تقریباً اسی قسم کی اسمبلی ہوتا تھا اور تاریخ

بتاتی ہے کہ بعض بہت غیر معروف عورتوں اور مردوں کی رائے کو بھی خلفاء نے درست تسلیم کیا اور بعض امور میں اصلاح فرمائی۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ہاں اگرچہ حکومت کو بھی پوری حکمرانی کا حق ہوتا ہے، لیکن حقیقی قوت حاکمہ اسمبلی ہی ہوتی ہے، فرق یہ ہے کہ بعض حکمرانوں کا اس حقیقت کے ساتھ تصادم ہوتا رہتا ہے، اس کی کئی وجوہات ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ میرے ساتھ اسمبلی کا تصادم نہیں ہوا، حالانکہ اسمبلی میں ہماری پوزیشن زیادہ مضبوط نہیں تھی بلکہ شروع میں تو ہم اقلیتی گروہ تھے۔ اگر مرکز سے بے جا مداخلت نہ ہوتی تو وہ اسمبلی ایک مثالی اور معیاری اسمبلی ثابت ہوتی۔

مخلص رفقائے کار:

اس تمام مشق میں کئی حضرات نے دلچسپی لی۔ جس میں ہر طبقہ خیال اور ہر مذہبی حلقے کے بااثر حضرات شریک تھے۔ آج شاید سب حضرات کے بارے میں اچھی طرح یاد نہ ہو لیکن مظفرآباد میں سید مظفر حسین شاہ ندوی جو امور دینیہ کے ناظم تھے، مولانا مفتی عبدالقدوس مرحوم جو ایک دینی مدرسہ چلا رہے تھے اور انتہائی نیک شخصیت تھے اور مولانا محمد یونس اثری، یہ تینوں حضرات گویا ٹھیکیدار تھے۔ کوئی دن ایسا نہ ہوتا کہ مجھے کسی نہ کسی کام کے بارے میں یاد نہ دلاتے، تجاویز بتلاتے اور جہاں کہیں کوئی نقص واقع ہو رہا ہوتا اس سے آگاہ کرتے۔ میری غفلت اور تساہل دور کرانے میں ان حضرات کا خصوصی حصہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ ندوی صاحب محترم تو ان چند لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے نیلا بٹ سے جہاد آزادی کا آغاز کیا اور پھر پورا عرصہ ہم لوگ ایک ساتھ رہے۔ وہ بتا سکیں گے کہ آزاد کشمیر میں اسلامی قوانین کا نفاذ مجھے 1971ء میں یاد نہیں آیا تھا بلکہ جہاد کے روز اول سے ہی میرا دلی رجحان اسی طرف تھا۔ چنانچہ جہاد کا آغاز کرتے وقت ہم نے کوہالہ کے قریب باسیاں کے مقام پر ایک میثاق مرتب کیا تھا جس کی پابندی کا ہم نے حلف لے کر دریا عبور کیا اور اسلحہ ساتھ لائے تھے، بلکہ ہم نے شروع ہی میں وہ نظم و ضبط اپنانے کی کوشش کی تھی جس کو دینی اصطلاح میں

جہاد کہا جاتا ہے اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ اہتمام صرف یہیں ہمارے سیکٹر میں تھا، دوسری کسی جگہ نہیں کیا گیا یا ہمارے علم میں نہیں ہے۔

جیل خانوں کی اصلاح کی کوشش:

اس مشق کے ساتھ ساتھ ہم نے جیل خانوں میں بھی اسلامی تعلیم کا اہتمام کیا۔ اس غرض کیلئے ہر جیل خانے کیلئے ایک عالم دین کا تقرر کیا، تاکہ قید کے دوران بھی لوگ قرآن و حدیث سے استفادہ کریں۔ قیدی حضرات کے بارے میں میرے خیال میں کئی منصوبے ابھرتے رہے ہیں۔ میں نے خود قید رہ کر ان کی حالت کا مطالعہ کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ ہمارے قید خانوں کی جو حالت ہے وہ گویا انسانیت کی تباہی کے اڈے ہیں، اچھے بھلے لوگ باہر سے جا کر خراب ہو جاتے ہیں۔ جیل خانوں کے بارے میں کسی نے سچ کہا ہے کہ ان میں بسا اوقات چور قطب بن کر نکلتے ہیں اور قطب چور بن کر نکلتے ہیں، چور کا قطب بننا تو ایک استثناء ہے، دوسری بات اگرچہ سو فی صد ان ہی معنوں میں ظاہر نہ ہوتی ہو لیکن تشبیہ کے طور پر بالکل درست ہے۔ جیل خانوں کی اصلاح کیلئے منجملہ دوسری باتوں کے جن میں سے بعض تو میں نے 1956ء میں اور پھر 1971ء کے دور صدارت میں نافذ کرنے کی کوشش کی، ایک یہ ہے کہ وہاں ایک نصاب مقرر کر دیا اور ایک عالم دین کی ڈیوٹی لگا دی جس کو مفتی کا درجہ دیا گیا جو آج تک جاری ہے۔ مگر اس وقت تو محض، ملازمت کی حد تک ہے، مدبر آدمی کے نقطہ نظر سے کوئی نمایاں بات نظر نہیں آتی۔

غرضیکہ کوشش یہ تھی کہ زندگی کے ہر شعبے کا رُخ ایک طرف موڑ دیا جائے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہماری ادنیٰ سی کوشش کا اتنا اثر ہوا جو ہماری توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ آج جب میں ماضی پر نظر دوڑاتا ہوں تو جہاں کئی ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے جو کی جانی چاہیئے تھیں، مگر ہماری بے خبری یا کسی دوسری وجہ سے نہ ہو سکیں اور افسوس ہوتا ہے کہ کاش وہ بھی ہم کر گزرتے، وہاں اس پر اطمینان بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ ہم نے کیا وہ بے غرضی، شوق اور اللہ اور

اس کے حبیب ﷺ کی خوشنودی کیلئے اور صحیح طریقہ سے کیا۔ الحمدالله العظیم۔

سعودی عرب میں تعلیم و تربیت کیلئے وظائف:

اسی دوران میں نے سعودی حکومت اور وہاں دوسرے مسئولین کے ساتھ آزاد کشمیر کے علماء کیلئے دینی علم اور قضاء کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کیلئے انتظام کیا۔ اس میں اگرچہ میری خوش فہمی اور نا تجربہ کاری کی وجہ سے اتنا فائدہ نہ ہوا لیکن ہماری حکومت باقی رہتی تو ہم سعودی حکومت کی ہمدردی سے پورا پورا استفادہ کرتے۔ آزاد کشمیر کیلئے اس وقت کی حکومت نے سب سے زیادہ تعداد میں داخلوں کی اجازت دے رکھی تھی۔ ہمارے لیے مدرسین اور علماء کے علاوہ طلبہ کیلئے پچاس وظائف مقرر تھے۔ لیکن میرے بعد ایک تو کسی حکومت نے دلچسپی نہ لی۔ دوسرے ہمارے کچھ ہمدردوں نے، خدا ان کا بھلا کرے جن کا سعودی حکومت کے ساتھ میل جول ہے، سعودی حکومت اور ان کے دوسرے مسئولین کو مجھ سے بدظن کرنے کا ''قومی'' کارنامہ سرانجام دیا۔ جس کی وجہ سے وہ تمام وظائف ایک ایک کر کے ختم کر دیئے گئے۔ اگر وہی لوگ ان کو کام میں لاتے تب بھی اچھی بات تھی، لیکن بعض لوگوں کی فطرت وہی کبڑے والی ہوتی ہے۔ سعودی عرب کی اس قسم کی امداد اور تعاون کیلئے جہاں سعودی عرب کی حکومت ہمارے تشکر کی مستحق ہے، وہاں شیخ عبدالعزیز بن باز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دراصل ان کی ذاتی توجہ کے باعث ہی آزاد کشمیر کے معاملے میں سعودی حکام اور حکومت نے تھوڑے وقت میں اتنی دلچسپی لی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔ شیخ بن باز آج کل افتاء ارشاد اور تحقیقات کے واحد ادارے کے صدر ہیں اور رابطہ عالم اسلامی کے چیئرمین بھی۔

سعودی عرب میں نظام قصاص:

سعودی عرب میں بالعموم جو بھی نظام ہے اور بالخصوص جو قضاء کا محکمہ ہے، اس میں اگرچہ حکومت اور حکمرانوں کا بھی یقیناً اثر ہے، لیکن وہاں ان لوگوں کی اپنی طبیعت، مزاج اور

خیالات کا بھی حصہ ہے۔ اگر قضاء کا محکمہ ٹھیک کام کر رہا ہے تو صرف اس لیے نہیں کہ حکومت ایسا چاہتی اور اس میں مداخلت سے حتی الامکان پرہیز کرتی ہے بلکہ اکثر قاضی مزاجاً ایسے ہیں کہ ان کے کام میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا، مگر ہمارے ہاں تو سچی بات ہے کہ نہ تو حکومت کوئی ایسی بنی جو قانون اور عدالتوں کا احترام کرے اور نہ ان لوگوں کی کثرت ہے جن کے کام میں مداخلت مشکل ہو، ممکن تو درکنار، اس لیے ہمارے معاشرے میں کتنا کام کرنا ہے اس کا اندازہ لگانا خاصا مشکل ہے۔

بعض کیا بلکہ ہمارے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ بس چند بنیادی کام کر دیئے جائیں تو اور کچھ نہیں کرنا پڑتا، پورا نظام خود بخود اسلامی ہو جائے گا۔ میرے نزدیک یہ خیال درست نہیں ہے۔ عارضی اور عبوری مدت میں تو شاید کام چل جائے لیکن جب تک اس کو مستقل بنیادوں پر استوار نہیں کیا جائے صحیح نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا بلکہ اس طرح جب پسپائی ہو گی اور اس سے ایک خلا پیدا ہو گا، اور لازماً پیدا ہو گا تو پھر ہر عمل کے مساوی ردعمل کے اصول کے مطابق جو طوفان برپا ہوسکتا ہے اس کا کیا اندازہ کیا جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں ایسی تدریجی اور ارتقائی تبدیلیاں لائی جائیں جو نہ صرف یہ کہ اس نظام کے موافق ہوں بلکہ ان کی وجہ سے وہ نظام دیرپا اور طویل المدت ثابت ہو اور ساتھ ہی مخالف قوتوں کا راستہ روکنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔

عربی زبان کی ترویج:

اسی مقصد کے پیش نظر میں نے یہ بھی کوشش کی کہ تعلیمی اداروں میں عربی زبان کو لازمی قرار دیا جائے۔ کہنے کو تو یہ آسان ہے، مگر اس کی عملی مشکلات بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ ایک مشکل تو یہی ہے کہ عربی جاننے والے اساتذہ ہی موجود نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں تو اکثر و بیشتر اساتذہ ایسے ہیں جن کو اردو بھی ٹھیک نہیں آتی اور انگریزی تو گویا وہ اپنی مقامی زبان میں بولتے ہیں، پھر یہ کہ جنھوں نے عربی پڑھی ہے اس کا بھی بالکل یہی حشر ہے، نہ بول سکتے ہیں

نہ لکھ سکتے ہیں، پڑھانا تو کجا۔ اس کے علاوہ جو عربی ہمارے ہاں عام طور پر پڑھائی جاتی ہے اس میں ایم اے کر کے بھی آدمی کہیں نہیں پہنچتا۔ جن حضرات نے مولانا محمد حسین آزاد کا فارسی دانی اور ایران والا واقعہ پڑھا ہے وہ اندازہ کریں گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ہمارے اپنے ساتھ بھی ایک بار بالکل یہی تجربہ ہوا۔

میں صدارت کے زمانے میں سعودی عرب گیا۔ ہمارے ساتھ ایک ایسے صاحب بھی تھے جن کو عربی زبان میں بلاشبہ وافر دسترس حاصل ہے بلکہ ہمارے ہاں شاید وہی سب سے بہتر عربی جانتے ہیں۔ انھیں عربی لٹریچر اور ادب سے خاص شغف بھی ہے اور نہایت ہی اعلیٰ مدرسے میں عربی تعلیم حاصل کی ہے۔ ایک جگہ مجھے کسی ضرورت سے کپڑے سینے والے دھاگہ کی ضرورت پڑ گئی۔ میں نے ان صاحب سے کہا کہ بازار سے منگوا دیں۔ ہمارے ساتھ مرحوم قاسم جعفر بھی تھے جو اپنی ظرافت طبع کیلئے دوستوں میں بہت محترم تھے۔ ان صاحب نے قاسم مرحوم کو کہا کہ کسی دوکاندار سے جا کر ''سلک'' مانگیں وہ دے دے گا۔ قاسم ظفر بے چارے کئی دکانوں پر پھرے مگر سب نے انکار کیا، ایک دوکاندار کو انھوں نے اشارہ سے بتایا کہ وہ جو سامنے رکھا ہوا ہے، وہ چاہیئے تو دکاندار نے بے ساختہ کہا ''خیط، خیط'' جب قاسم واپس آئے تو غصہ بھی تھا اور ظرافت بھی، مولوی صاحب سے کہنے لگے ''دیکھیئے مولانا! جو عربی آپ بولتے ہیں اس کو سمجھنے والے لوگ مر گئے ہیں، وغیرہ وغیرہ''۔

اسی طرح میں نے صدارت سے قبل کے چند سالوں میں خود عربی سیکھنے کی خاطر ہمارے ہاں مروج جو بھی اضافی یا امدادی کتابیں دستیاب ہیں حتیٰ کہ جو بھارت میں چھپی ہیں وہ سب منگوائیں اور بہت محنت کر کے ان کو پڑھا، بلکہ ان کو ایک طرح گویا ازبر کیا۔ یہ کوئی ایک درجن کے قریب مختلف سیٹ ہوں گے۔ ان میں ایک سیٹ وہ بھی ہے، جو مصر سے ریڈیو پر غیر عربی دانوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ لیکن جب میں اپنے خیالات کو عربی میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا تو کچھ اتہ پتہ نہ لگتا۔ اس سے مجھے اپنے عربی دانوں کی مشکل کا بھی اندازہ ہوا اور

نصاب مرتب کرنے والوں کی کمی کا بھی۔ لے دے کر دو ہی صورتیں تھیں، ایک یہ کہ اپنے ہاں سے اساتذہ کو کم از کم دو سال کیلئے عرب ممالک میں صرف عربی سیکھنے کیلئے بھیجا جائے، تاکہ وہ ابتدائی کتابیں پڑھا سکیں، پھر یہ کہ ان ہی اساتذہ میں سے بعض ایسے حضرات کو جن کو عربی زبان کا شوق ہو، عربی ادب، تاریخ اور علم دین وغیرہ میں اعلیٰ تعلیم دلوائی جائے، تاکہ یہ لوگ واپس آ کر اساتذہ کی تدریس کا کام کرسکیں۔

عرب اساتذہ:

اول تو ایسے حضرات ملنا مشکل تھے، پھر جو ملے وہ سعودی عرب جا کر بے چارے واپس کیسے آتے۔ یہاں بمشکل ایک ڈیڑھ ہزار تنخواہ ہو گی وہاں اگر داؤ لگ جائے جیسا کہ بعض کا لگ گیا، تو بعض کی تنخواہ بارہ، پندرہ، بیس ہزار اور اس سے بھی زیادہ تھی۔ واپس آ کر کیا کرتے؟ وہ لوگوں کو عربی پڑھا کر اور اسلامی نظام لا کر کیا کما سکتے تھے۔ ان کا قصور بھی کیا، ہمارے ہاں غلامی نے جو اثرات چھوڑے ہیں، وہ ہنوز موجود ہیں، ہمارا سارا نظام تعلیم صرف کرائے اور تنخواہ کے مقصد پر موقوف ہے۔ اس میں کوئی دوسری بات، ملت، مذہب، آزادی اور قومی تشخص جیسی شامل تھی، نہ اب ہے۔ پھر بھی اگر مجھے کچھ اور موقع مل جاتا تو ہم یقیناً اس میں بھی کوئی راہ نکال لیتے۔ اسی طرح وہ طلبہ بھی جو ہمارے ہاں سے گئے یا دنیا کے کسی خطے سے جاتے ہیں، ان سب کا یہی حال ہے۔ کوئی بھی اس اعلیٰ مقصد کے کام نہ آیا، سوائے ایک دو کے۔ میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی ایک بھی میرے ترجمان کا کام کرسکتا ہو، بہر حال میری یہ کوشش بھی اسی مقصد کیلئے تھی، پھر ہم نے باہر سے بھی اساتذہ منگوائے، مگر ان کا بھی ہمارے بعد وہی حشر ہوا، بعد میں آنے والے لوگوں میں اور ہم میں کوئی دور کی بھی فکری مماثلت یا مناسبت نہ تھی بلکہ ہم ایک دوسرے کی عین ضد تھے۔

مدارس میں عربی زبان کی تعلیم:

ضمناً ذکر کردوں کہ پاکستان بھر میں اپریل 1983ء سے چھٹی جماعت سے عربی لازمی کر دی گئی ہے۔ لیکن میرے خیال میں کسی ایک جگہ بھی باقاعدہ پڑھائی نہیں جاتی ہو گی اور چونکہ یہ مضمون لازمی ہوگیا ہے، اس لیے اس میں پاس ہونے کیلئے پڑھے بغیر بھی نمبر دیئے جاتے ہوں گے۔ ویسے یہ رواج پہلے سے جاری ہے کہ عربی ہو یا دینیات دونوں کو ایک غیر ضروری مضمون سمجھ کر بغیر پڑھے امتحانوں میں اچھے نمبر دے دیئے جاتے تھے۔ تاہم میرا خیال یہ ہے اور ارادہ بھی ہے کہ چھٹی سے نہیں بلکہ روز اول سے عربی لازمی ہو۔ دراصل بچوں کو شروع کے چند سال میں صرف عربی ہی پڑھائی جائے تب جا کر بچے اصل زبان سے مانوس ہوں گے۔ اسی طرح خود اساتذہ کی تعلیم بھی ناگزیر ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہم عرب ممالک سے درسی کتب منگوائیں اور ان میں کچھ ضروری رد و بدل کر کے اپنے تعلیمی اداروں میں رائج کر دیں، چنانچہ میں نے تین چار ممالک کے درسی نصاب کی کتابیں منگوائیں۔ ان میں مصر، لیبیا، عراق اور سعودی عرب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مصر کی کتابوں میں عربی زبان تو یقیناً عمدہ ہے مگر ان کا حشر بھی ہماری طرح ہی ہے کہ ان کو پڑھ کر کوئی کہیں کا نہیں رہتا۔ مغربیت کا ان پر اتنا اثر ہے کہ سوشلزم کے زہر سے لبریز ہیں۔ پھر سعودی عرب ہی رہ جاتا ہے، وہیں سے درسی کتابیں منگوائیں، میرے لیے مشکل تھا کہ میں اتنے قلیل عرصہ میں کئی لوگوں کو اس مشق میں شامل کرتا اور ہر ایک بات کی توجیہ سے سب کو واقف رکھتا۔ جونہی سعودی عرب سے کتابیں آنے لگیں، پروپیگنڈہ شروع ہوگیا کہ سردار قیوم وہابیت پھیلا رہا ہے، اور ابتداء میں یہ باتیں پھیلائیں ان نالائق لوگوں نے جن کی قابلیت معیاری نہیں تھی، مگر وہ کسی فرقہ کی نسبت سے ملازمتیں چاہتے تھے، لیکن وہ اس بنیاد پر نہیں دی جا سکتی تھیں، پھر بھی میں اپنی پوزیشن واضح کرسکتا تھا، وقت نہ ملا اور وہ کام ادھورا رہ گیا۔

عربی تعلیم کی ضرورت:

اب یہ جو عربی کے بارے میں میں نے بات کی تو میں یہ بھی عرض کر دوں کہ ہمارے ہاں کئی وجوہ سے اس کی اشد ضرورت ہے۔ منجملہ ان کے یہ قرآن و حدیث کی زبان ہر مسلمان کو آنی چاہیئے، قرآن کریم جو عربی زبان میں نازل کیا گیا تو اس کی اپنی ایک بالغ حکمت ہے، اس کا ایک حصہ وہ ہے قرآن کریم نے فرمایا: ''انا انزلناه قرآنا عربیا لعلکم تعقلون'' ترجمہ: ''ہم نے قرآن عربی میں اس لیے اتارا کہ تمہیں عقل آ جائے''۔ اب ظاہر ہے کہ اگر عقل کے معنی ایٹم بم بنانے کے لیے جائیں تو پھر تمام حافظ قرآن بڑے سائنس دان ہونے چاہئیں تھے۔ اس عقل کے معنی وہ صحیح عقل ہے جو مخلوق کو اپنے خالق کی معرفت عطا کرتی ہے۔ کیونکہ جس کو یہ عقل نصیب نہیں ہوئی، اس کی باقی تمام عقل بے کار محض ہے۔ قرآن نے خود اس عقل کو قرآن کریم اور عربی زبان کے ساتھ مختص کر دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر زبان حتیٰ کہ اس کا رسم الخط بھی اپنا ایک خاص اثر مرتب کرتا ہے، جو تہذیب و تمدن، عادات و اخلاق، ثقافت اور معاش سب پر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ہر زبان بولنے والا ان امور میں دوسرے سے مختلف ہے۔ اس لیے اگر مسلمان زیادہ تر عربی بولنے لگیں اور عربی کو اپنا لیں تو لامحالہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے جائیں گے اور یہ بعد کم ہوتا جائے گا، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم جب اردو کو ترکی کی طرح انگریزی رسم الخط میں تبدیل کرنے لگے تھے، تو خدا بھلا کرے، ہمارے صاحب علم وفکر حضرات کا جنھوں نے ان کو یہی نکتہ سمجھایا تھا، جس نے ان کو اس قباحت سے باز رکھا۔ اس غرض کے لیے عربی زبان کو عام کرنا چاہیئے۔

اس لیے میرے خیال میں اسلامی نظام کی کوششوں میں اس عمل کا بے حد دخل ہوگا، محض چل چلاؤ کیلئے نہیں بلکہ ایک مربوط اور پوری طرح سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عربی زبان کو رواج دینے کا اہتمام کیا جائے، یوں بھی ہمارے ہاں ایک اور فتنہ بھی موجود ہے کہ قرآن و حدیث کو اپنی زبان میں پڑھا جائے۔ حتیٰ کہ نماز بھی اردو پنجابی یا دوسری مقامی

زبانوں میں پڑھی جائے۔ یہ فتنہ انکار حدیث سے بھی اشد ہے۔ یہ تو صریحاً انکار پر مبنی ہے۔ لیکن جن کو سمجھ نہیں یا قرآن حکیم کے مطابق ''لم یدخل الاایمان فی قلوبھم''

جو مسلمان تو ہیں مگر ایمان سے سینے خالی ہیں، ان کیلئے یہ فتنہ بے حد پر کشش اور منطقی ہے۔ اس کا تدارک بھی عربی تعلیم کو عام کر کے ہی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہو گا تو مسلمان تو اگرچہ بے شک ہوں گے اور بالآخر ہماری بخشش بھی ضرور ہو جائے گی، مگر ہمارا اسلام ہماری رنگ ونسل، بود و باش اور طرز تمدن کے ماتحت ہو گا۔ اس سے خود اختلاف جنم لیتا ہے۔ اس کی موجودگی میں ہم کس طرح واعتصمو اور ادخلو فی السم، وغیرہ کے احکامات خداوندی کی صحیح معنوں میں بجا آوری کر سکتے ہیں۔ اس مقام پر یہ گزارش بھی کروں کہ یہ سب کچھ کر جانے کے باوجود اس میں جو کوئی خاص پیش رفت نہ ہوئی تو اس کے کئی دوسرے اسباب کے علاوہ ایک بڑا سبب ہمارے معاشرے اور اسلامی نظام میں ایک طبعی اجنبیت اور مغائرت ہے جو اگرچہ بہت نمایاں نہیں ہے، مگر نہ صرف موجود ہے بلکہ بے حد طاقتور ہے، جب تک یہ مغائرت دور نہیں ہوتی اس ضمن میں جو کام بھی ہو گا وہ محض کسی طاقت کے بل بوتے پر کچھ دیر تو چلے گا، لیکن وہ کسی صورت دیرپا نہیں ہو سکتا نہ ہی خاطر خواہ نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

یہ اجنبیت اور غیرت کس کس گوشے میں ہے اور کتنی گہری ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے اس کا اثر ہماری زندگی کے ہر شعبے پر ہے اخلاق و عادت، رسم و رواج، تہذیب و تمدن، سوچ وفکر اور پھر خاص کر اقتصادی اور معاشی معاملات میں ہم اسلام کی روح سے کوسوں دور کھڑے ہیں۔ ہمارے کتنے سرمایہ دار ہیں جو خوش دلی سے زکوۃ وعشر ادا کرنا چاہتے ہیں۔ سرمایہ دار ہی کیوں غیر سرمایہ دار بھی کتنے ہیں جو صاحب نصاب ہونے کا حق فرض سمجھ کر ادا کرنا چاہتے ہیں۔

نفاذ شریعت کا طریقہ کار

صدارت سے علیحدگی کے بعد:

چنانچہ جوں ہی صدارت سے علیحدہ ہوا، وہ سب کا سب تلپٹ ہو گیا، خصوصیت کے ساتھ ہماری انتظامیہ تو ایسا لگتا تھا کہ کسی بڑی پریشانی سے چھوٹ گئی ہے۔ محض اس لیے کہ پیدائشی مسلمان تو ہم ہیں، مگر ہماری تعلیم و تربیت کتنی اسلام پر ہوئی ہے۔ ہم تو اب عادتاً اسلام کو اپنے مزاج کا مذہب سمجھنے لگ گئے ہیں، بلکہ اپنے مزاج کے ماتحت، اس کے حصہ میں بھی عربیت نہیں رہی جو اسلام کا خاص کردار ہے۔ اب تو اپنے اجنبی اور اسلام کے مخالف اور اپنے اپنے علیحدہ مزاجوں کو ہم اس قدر تحفظ دینے لگے ہیں کہ بعض لوگ عربی اور عرب مسلمان دونوں پر ہی معترض ہیں۔

فرقہ بندیوں کا تعصب:

اس میں پھر ایک بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کے نظام کا کام کہاں سے شروع کیا جائے۔ آیا پہلے معاشرہ تیار کیا جائے اور بعد میں نظام کی بات کی جائے یا پہلے نظام کے نافذ کرنے سے کی جائے؟ اس بحث کا کوئی حتمی اور آخری جواب ہے، نہ دیا جا سکتا ہے، معاشرہ کون تیار کرے گا، کیونکہ جن پر بظاہر ایسا معاشرہ تیار کرنے کی ذمہ داری ہے اور وہ اپنے دعویٰ کے مطابق کر بھی رہے ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ وہ تیاری خود ایسے تعصب کی نظر ہو گئی ہے کہ اس سے تو وہ فاصلہ پہلے سے زیادہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اب تو یہ ابھی فیصلہ کرنا ہو گا کہ اسلام شیعہ ہے، سنی ہے، دیو بندی ہے، بریلوی ہے یا اہل حدیث، بلکہ ستم یہ ہے کہ اب تو اس فرقہ بندی میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک طرف یہ حال ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ سرے سے دین ہی کے مخالف عناصر اتنے طاقتور ہیں کہ بس ان کے قریب پہنچنا ہی مشکل ہے۔ چنانچہ ایک طرف سے تیاری ہو گی تو دوسری طرف سے دین مخالف رو اس کو بہا کر لے

جائے گی۔ پاس ادب کے باعث کہہ نہیں سکتا، ورنہ غور سے دیکھا جائے تو اسلامی نظام کی راہ میں آج سب سے بڑی رکاوٹ یہی تحریکیں ہیں، جو خود اسلام کے نام پر چل رہی ہیں۔

اس بحث کا یہ محل نہیں ہے تاہم سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص برسر اقتدار آ جائے جس کی یہ خواہش ہو کہ اس ملک میں اسلامی نظام نافذ کیا جائے تو کیا کیا جانا چاہیئے؟ اصل میں یہی بات ہے جو اس بحث کا اصل موضوع ہے۔ وہ دوسری بات کہ معاشرہ پہلے تیار کیا جائے، میرے خیال میں نو من تیل اور رادھا والی بات ہے۔ ابھی ہمارا رُخ ہی اس طرف نہیں ہے۔

نفاذ شریعت کے لیے طریق کار:

یہ بات کہ کوئی ایسا شخص برسر اقتدار آ جائے۔ میرے خیال میں کسی خاص طریقہ پر موقوف یا منحصر نہیں ہے، بلکہ ممکن ہی نہیں۔ البتہ اگر ایسا ہو جائے تو یہ محض خدا کا کرم ہوگا یا یہ کہ اس قوم کیلئے اور اس فرد کیلئے ایک آزمائش، جس کا مطلب اتمام حجت بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہ خدائے تعالیٰ ہماری کمزوریوں اور مشکلات کی آویزش میں ہماری امداد فرمانا چاہتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی سنت ایسی بھی ہے کہ وہ مایوسی اور تاریکی میں امید اور روشنی عطا کرتے ہیں اور ناممکن کو ممکن بنانے پر قادر ہیں۔ بہر حال اگر ایسا ماحول پیدا ہو جائے تو میرے خیال میں تمام کام بیک وقت شروع کیے جانے چاہئیں، لیکن رفتار اور ترجیحات بہر حال ایسی ہونی چاہئیں کہ قدم ملا کر چلا جا سکے۔ جہاں قدم اکھڑ گیا پھر علاج مشکل ہے۔ اوپر سے یعنی حکومت کی طرف سے یہ کام شروع کرنا نسبتاً آسان ہے اور مشکل بھی!

مشکل اس لیے کہ خود کو اور اپنے تمام رفقاء اور انتظامیہ کو ایک خاص نہج پر چلانا ضروری ہے۔ ہم لوگ عادتاً دوسروں کو نصیحت بہت کرتے ہیں مگر معاملہ اپنے آپ پر آ جائے تو اولاً عمل کرنا مشکل، پھر اس پر مداومت یا استقامت تو اور بھی مشکل ہے۔ اگر حکمران خود اور حکومت کسی بات پر متزلزل ہے اور ڈھل مل یقین ہو جائے تو لوگوں پر اس کا وہی اثر ہوتا ہے

بلکہ لوگ تو سرے سے بے یقینی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اگر حکمران اور حکومت کے کردار میں اصلاح ہو جائے یعنی قول وفعل میں یک رخی اور موافقت ہو تو معاشرے کی اصلاح کا بے شمار کام بغیر کسی تردد کے خود بہ خود چل پڑتا ہے۔ غالبًا وہی بات ہے، ''الناس علیٰ دین ملوکھم''۔ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں، دراصل یہ وہی مقام ہے، جہاں ہم لوگ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ کوئی بے ادبی کرنا مقصود نہیں ہے لیکن کسی غلط فہمی میں رہنا بھی اچھا نہیں ہے، معلوم نہیں ہمارے ہاں ابھی وہ لوگ ہیں جو اپنے قول وفعل اور عمل وتقوی کے اس مقام پر ہوں کہ ان کی اخلاقی قوت سے ایک نظام کو چلانے میں مدد ملے۔ ہمارا معاشرہ نیک سیرت اور باکردار لوگوں سے یقیناً خالی نہیں ہے، مگر میں ان طبقات کی بات کر رہا ہوں جو سیاست میں ہیں اور جن سے یہ توقع کی جانی چاہیئے کہ وہ لوگ اسلامی نظام کے بارے میں کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ہماری تاریخ کا ایک عجیب سانحہ ہے کہ جس قدر لوگ علم وعمل اور تقویٰ و پرہیز گاری میں قابل تقلید ہیں، ان میں سے کسی کو سیاست سے دلچسپی نہیں ہے ان میں وہ معیار نہیں ہے۔

بہر حال بات یہاں تک آ جاتی ہے کہ جس کسی کو اللہ تعالیٰ موقع دے اسے چاہیئے کہ وہ جس قدر اس کے لیے ممکن ہو اپنا فرض ادا کرے۔ خدائے تعالیٰ کی یہ سنت بھی معلوم ہے کہ جب وہ چاہتا ہے تو کسی بظاہر نا اہل ہی سے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دلوا دیتا ہے۔ شاید یہ کام بھی کسی ایسے طریقے سے ہو پائے۔

حکومت .... ایک آزمائش:

کارحکومت میں ایک اور مسئلہ بڑا اہم ہے اور تمام حکمرانوں کیلئے بالعموم اور ان کیلئے بالخصوص جو جمہوریت، اچھائی اور قانون کی بالادستی پر عمل کرنا چاہتے ہوں ایک سنگین آزمائش ہے۔ اس سے بڑھ کر اس شخص کیلئے اور بھی بڑی آزمائش ہے، جو اسلام کی بالا دستی قائم کرنے کا خواہش مند ہو، آزمائش اس حکمران کے عزیز و اقارب اور دوست یار ہیں، یہ بھی ایک

لانیحل معاملہ ہے۔ ایک اچھے سے اچھے حکمران کی نیک نامی محض ان کی وجہ سے داغدار ہو جاتی ہے بلکہ اس کے خلاف ردعمل ہونے لگتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ شخص اپنے تمام تر حسن نیت اور نیک اعمال کے باوجود ان لوگوں کی بد اعمالیوں کی سزا بھگتنے پر مجبور ہوتا ہے۔ بادشاہی نظام میں تو ایک حد تک اثر ہوتا ہے مگر وہاں بھی ہمیں معلوم ہے کہ کتنی بادشاہتیں جانشینوں کی نالائقی اور نااہلی کے باعث ختم ہو گئیں۔

ہمارے ہاں جمہوری اور عوامی نظام میں کسی بھی متوقع حکمران کی اولاً تو اپنی کوئی خاص تربیت نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لواحقین کی تربیت تو شاید کبھی زیرِ غور بھی نہ آئی ہو گی۔ جب وہ شخص کسی مرتبے پر فائز ہو جائے تو یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ آل اولاد اور عزیز و اقارب جن کیلئے ایک شخص اپنی زندگی وقف کر رکھتا ہو، خاص کر جب وہ اقتدار اعلیٰ پر آ جائے تو وہی لوگ اس کی پریشانیوں کا سب سے زیادہ مؤجب بن جاتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اس شخص کی امداد کریں جو ہمدردی اور اس تعلق کا فطری تقاضا ہے، اس وقت گویا فطری تقاضے ہی بدل جاتے ہیں اور وہی لوگ اس کے بوجھ میں اضافہ کا باعث بن جاتے ہیں۔ کسی ایک حکمران کی بات نہیں ہے، یہ ایسا فطری نظام ہے کہ اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کسی کو اپنے خاص کرم سے بچائے تو اور بات ہے۔ پوری انسانی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ سیدنا عمرؓ کے صاحبزادے والا واقعہ، کیسی عبرتناک حقیقت ہے، لیکن اس دنیا میں کتنے عمرؓ ہوں گے۔ تاریخ میں تو شاید وہی تھے۔ خود انبیاء علیہ السلام کو لیجیے کہ حضور اکرم ﷺ ہی شاید ایک استثناء ہیں کہ آپ ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا کہ ''اگر میری بیٹی فاطمہؓ چوری کرے گی تو اس کا بھی ہاتھ کٹے گا'' اور سیدنا نوحؑ کو جب تک اللہ تعالیٰ نے منع نہ فرمایا وہ اپنے گمراہ بیٹے کیلئے دعا کرتے رہے۔ ان ہی واقعات سے قرآن حکیم کے ارشاد کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ ایک جگہ مال اور اولاد کو فتنہ یعنی آزمائش فرمایا تو دوسری جگہ دشمن قرار دیا مگر ساتھ ہی درگزر کیلئے بھی فرمایا۔

لواحقین اور عزیز و اقارب:

وہ حکمران جو خدا اور رسولﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر خود چلنے اور دوسروں کو چلانے کی کوشش کرے گا اس کیلئے ایک آزمائش تو خود اس کی اپنی ذات ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو کتنا اسلام کے سپرد کرتا ہے۔ اولاً تو اسی مشکل سے نبرد آزما ہونا غیر معمولی کرم نوازی کا محتاج ہے۔ کہنے کو تو ہم میں ہر شخص کہے گا کہ وہ مبتلائے آزمائش نہیں ہے، مگر خدا کو تو علم ہے اور اس کو خود بھی اپنے اندر کا کچھ نہ کچھ حال معلوم ہوتا ہے۔ دوسری سنگین آزمائش یہی لواحقین ہیں۔ اگر اس بے چارے کے اپنے کوائف درست ہوں لیکن اس کے عزیز و اقارب کو اس کا احساس نہ ہو اور وہ ساتھ نہ دیں بلکہ اپنے عمل سے مخالفت کریں تو ایک وہ شخص اندرونی طور پر یعنی خود اپنے اندر ایک عذاب میں مبتلا ہوتا ہے دوسرے باہر بھی اس کا اثر کم ہو جاتا ہے اور انتظامیہ وغیرہ کے وہ لوگ جو اس حکمران کی نیکی سے تنگ ہوتے ہیں، پھر ان ہی لواحقین کو اپنا آلہ کار بناتے ہیں۔ یہ ایسی قیامت خیز اور ہلاکت آمیز مشق ہے کہ جس کو اس کا کچھ علم ہے وہ بے چارہ ویسے ہی بے موت مارا گیا۔

حکمران کے لواحقین کو اس کا شاید ہی کچھ علم ہو سکے کہ وہ لوگ جو ان کے بہت دوست اور ہمدرد بنتے ہیں اور تحفے تحائف دیتے ہیں ان میں سے کتنے ہیں جو اس حکمران کے اصلی دشمن ہیں اور خود غرض ہیں۔ اکثر یہی دو طبقے ہیں جو حکمرانوں کی اصلی کمزوری کا فائدہ اُٹھاتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ کوئی بھی سچا بہی خواہ اور مخلص ہمدرد نہیں ہوتا، لیکن ان مخلصین کی بھی ایک بیماری ہے، وہ اکثر اس شخص سے ناراض رہتے ہیں جس کے وہ ہمدرد ہوتے ہیں، وہ اپنا حق سمجھتے ہیں کہ ان کی عزت کی جائے اور ان سے مشورہ طلب کیا جائے۔ لیکن یہ دوسرے لوگ حکمران کے لواحقین کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ مخلص ہیں، اور درحقیقت وہی اس حکمران کے اصل دشمن ہوتے ہیں، کیونکہ نہ وہ خوشامد کریں نہ منافقت نہ ان کو اپنی ایسی کوئی غرض ہوتی ہے جس کو وہ دوست کی عزت پر ترجیح دیں، چنانچہ مخالفین یا منافقین تو در پردہ اس حکمران کی

مخالفت کرتے ہیں، جب کہ یہ مخلص لوگ جن کو اخلاص کی وجہ سے کوئی ڈر بھی نہیں ہوتا از راہ ہمدردی کھلم کھلا مخالفت کرنے لگ جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے وہ بعد اور دوری بڑھتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ حکمران اور اس کے لواحقین اپنے حقیقی مخالفوں، خودغرضوں اور منافقوں کا آلہ کار بن کر رہ جاتے ہیں اور یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ اس حکمران کے دن اب ختم ہو رہے ہیں تو بہت پہلے سے آنے والے کے ساتھ ہمدردی اور موجود حکمران کے ساتھ مخالفت کرنے لگ جاتے ہیں۔

اسی طرح ہمارے ایک اچھے اور طاقتور حکمران کے لواحقین جب اس کی بدنامی کا باعث بن رہے تھے تو اس حکمران کے کچھ مخلص دوست پریشان تھے، آخر ایک نے جرأت کر کے اس حکمران سے بات کی تو اس نے کہا اسے بھی معلوم ہے، مگر علاج کیا ہے۔ اس نے اسی دوست سے کہا کہ تم میرے فلاں لڑکے سے بات کرو، چنانچہ یہ مخلص آدمی بڑے اطمینان اور خوشی سے جو ایک دوست کو ہوتی ہے اس صاحب زادے کے پاس گیا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بڑی نرمی سے کہا کہ اسے کہا گیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بات کرے۔ اس صاحب زادے نے جواب میں پوچھا کہ ''تم کب سے میرے والد صاحب ہو گئے ہو؟'' اس نے کہا ''نہیں میں تو آپ لوگوں کا خادم ہوں اور مخلص دوست ہوں۔ مجھے تو آپ کی بھلائی کے سوا کچھ نہیں چاہیئے'' تو اس صاحب زادے نے بگڑ کر کہا ''نہیں! اگر وہ میرا باپ ہوتا تو خود مجھ سے بات کرتا'' اس پر اس شخص نے مزید صفائی پیش کی تو اس نوجوان نے اور زیادہ طیش میں آ کر کہا ''چل چل جا تو اپنا کام کر''۔

اسی طرح ہمارے ایک اور حکمران کے صاحبزادوں سے کسی مخلص دوست نے کہا کہ تمہارا باپ بدنام ہو رہا ہے، کچھ خیال کرو، تو دورغ بر گردن راوی، یہ بات عام مشہور ہوئی کہ وہ کہتے ہیں ''ہمارے باپ کو اب اور کون سا موقع ملے گا۔ اس لیے ہمارے لیے بھی یہی موقع ہے''۔ ایسی کوئی ایک مثال نہیں ہے، ہر شخص کے بارے میں اس قسم کی باتیں زبان زد عام

ہیں۔ مجھے خود کئی ایسی باتوں سے دو چار ہونا پڑا، گھر کے بعض لوگوں کے ساتھ میری کئی بار تلخی بھی ہوئی۔ یہ تو میرا حال تھا کہ مجھے ان باتوں کا ویسے بھی بہت خیال رہتا تھا، مگر اس کے باوجود میں بھی بسا اوقات بے بس ہو جاتا تھا البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ خدا کے فضل و کرم سے میں کسی غیر اخلاقی اور غیر قانونی معاملہ میں دانستہ فریق نہیں بنا۔ تاہم ذمہ داری اور جواب دہی کے لیے اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے۔ حکمران کی ذمہ داری اور جواب دہی دنیا و آخرت میں اس سے بڑھ کر ہے اور اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔

مظفر آباد میں میرے دو بیٹے سرکاری جیپ پر کالج جاتے تھے۔ جگہ جگہ یہ بات زیر بحث آئی کہ صدر کے لڑکے سرکاری جیپ استعمال کرتے ہیں، تو میں نے ان کا کالج جانا ہی بند کرا دیا۔ اسی طرح بات معمولی سی ہے، مگر حکومت کے نقطہ نظر سے کتنی اہم ہے کہ میرے سرکاری ڈرائیور چوری سے میرے بیٹوں کو سرکاری گاڑیوں پر ڈرائیونگ سکھاتے رہے جس کا علم مجھے صدارت کے بعد ہوا، تو اور کیا نہیں ہوتا ہو گا۔ پھر جب کوئی شخص اسلامی نظام کی بات کرے تو میرا تجربہ یہ ہے کہ کئی لوگ نیک نیتی سے اور کئی لوگ پوری بد دیانتی سے اس حکمران کو قرون اولیٰ اور خاص کر خلافت کے معیار پر رکھنے پر زور دینے لگتے ہیں۔ خلافت کا معیار تو ہمارے لیے روشنی کا مینار ہے اور ایک ارفع و اعلیٰ مقصد ہے جسے آئیڈیل کہتے ہیں، اس کا حصول تو اگرچہ اصولاً ناممکن نہیں کہہ سکتے مگر عملاً ناممکن ہے۔ ایمان، کردار، علم و تقویٰ اور سب سے بڑھ کر رسول ﷺ کی رفاقت و تربیت اب اس دنیا میں کس کو میسر ہو گی۔ وہ لوگ جن کے بارے میں خداوند قدس کے پیغامات آتے ہوں اب کیسے پیدا ہو سکتے ہیں مگر عجیب چیز یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر شخص صرف دوسرے سے وہ معیار چاہتا ہے خود کو اہل رخصت سمجھتا ہے، اور یہی امر اصل فتنہ و فساد کا سبب ہے، بہر حال نیک نیت لوگ تو محض اپنی بے خبری اور لاعلمی کے باعث ایسا کرتے ہیں جب کہ دوسرے لوگ عوام کو گمراہ کرنے کی خاطر ناممکنات پر ہر بات کو قیاس کروانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

معیار تنقید:

میرے دور صدارت میں بچیوں کے ایک کالج کی تقریب کی کسی فوٹو گرافر نے ایک فوٹو شائع کروا دی، جس میں میرے دائیں بائیں دو بزرگ خواتین بیٹھی تھیں۔ ایک میرے سگے بھائی کی بیوی جو کالج کی پرنسپل تھی تو دوسری بھی ایک معزز خاتون، جو بڑی بہن کی طرح ہے۔لیکن مجھے کئی خطوط آئے اور پھر اخبار میں بھی لکھا گیا کہ دیکھو یہ ہے اسلامی نظام جو سردار قوم نافذ کر رہا ہے۔ سردار قیوم نے کب کہا تھا کہ وہ خلافت راشدہ قائم کر رہا ہے۔ ہم تو اپنی علمی وعملی بے سر و سامانی کے ساتھ ایک متوازن سی کوشش کر رہے تھے، اس میں ہماری حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے تھی، نہ کہ تنقید و تنقیص۔ یہ ہیں ہمارے وقت کی بعض مشکلات جن سے ہمارے ارباب اختیار و اقتدار کو واسطہ پڑتا ہے اور آئیندہ بھی پڑے گا۔ اسی لیے ضروری ہے کہ زندگی کے صرف کسی ایک شعبے میں ہی کام نہ کیا جائے بلکہ تمام شعبوں میں اس طرح کام کیا جائے کہ سب ہی ایک دوسرے کے موافق اور سازگار ہوں اور قدم ملا کر چلیں۔

سازگار ماحول کی تیاری:

اسلامی نظام ہو یا کوئی اور نظریہ ہر ایک کیلئے اس کے موافق اور سازگار ماحول کی تیاری کی ضرورت ہے۔ اسلام تو خاص طور پر ایک خاص قسم کے ماحول کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ ماحول اس نظام کیلئے غیر ہو گا، اور وہ نظریہ اس ماحول کیلئے غیر، ایسے میں تو ظاہر ہے کوئی بھی کوشش محض پانی میں پتھر پھینکنے کے مترادف ہو گی۔

ماحول کا سازگار بنانا گویا وہ اولین کام ہے جو کیا جانا چاہیئے، یہ کام جیسا کہ میں کہہ آیا ہوں دو طریقوں سے ہی ممکن ہے، ایک تو جیسا کہ موجودہ طریقہ ہے جو عرصہ دراز سے چلا آ رہا ہے کہ صرف علماء کرام اور مبلغین یہ کام کریں، یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ یہ تمام نیک خواہشات اور کاوشیں جو اپنی مثال آپ ہیں، ابھی تک وہ ماحول نہیں پیدا کر سکیں جو مطلوب تھا، اس کی بڑی وجہ سیاسی ماحول کی خرابی کے سوا کچھ نہیں۔ سیاست خود ایک بے حد طاقتور عنصر

ہے اور اگر یہ خراب اور ناموافق ہوتو جو کچھ بھی مبلغین کریں گے، وہ کسی صورت ایک خاص سطح سے اوپر نہیں جا سکتا جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں۔

دوسرا طریقہ حکومت کے ذریعہ ہے۔ دراصل صحیح ماحول تو تب ہی میسر آ سکتا ہے جب ان دونوں طریقوں میں تال میل اور ہم آہنگی ہو لیکن حکومت کے لیے ماحول کو تبدیل کرنا ایک خاص نہج پر لے جانا بوجوہ آسان ہے، اس میں نقص صرف یہ ہے کہ اگر یہ کام محض کسی ایک فرد یا حکومت تک ہی رہے گا تو وہ دیرپا نہ ہوگا اسی فرد یا حکومت کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔ اس کیلئے تو پورے ملک میں ایسا مربوط اور حکیمانہ عمل ہونا چاہیئے جس سے ایک طرف تو ماحول سازگار ہوتا چلا جائے گا، دوسری طرف وہ ناسازگاری جس کا خلاف طبع اور خارجی اثرات سے پیدا ہونا لازمی امر ہے، اس کو روکا جا سکے گا یا اس کا اثر کم کیا جا سکے گا۔ دراصل ہم اس وقت ایسے مقام پر ہیں کہ مخالف قوتوں کو ختم کرنے کا تصور نہیں ہوسکتا، نہ ان کے راستے میں کوئی سد سکندری کھڑی ہوسکتی ہے لہذا کرنا یہ ہے کہ ہم اپنی صلاحیت میں اضافہ کریں اور مخالف قوتوں سے ایک قدم آگے ہو جائیں تاکہ بجائے اس کے کہ وہ ہم پر اثر انداز ہوں، ہم ان پر اثر انداز ہوں، اس طرح ان کی مخالفت کے زہر کا اثر کم ہوتا رہے گا اور ہم بقاء اصلح اور بقاء انفع کے اصول پر کامیابی سے چلتے رہیں گے۔

ماحول کو سازگار بنانے کیلئے بے حد ضروری بلکہ ناگزیر ہے کہ حکومت کے تمام شعبوں کا ماحول درست کیا جائے۔ اس کیلئے دو کام کرنا ہوں گے، ایک یہ کہ انتظامیہ کی سپلائی لائن کو درست کرنا ہوگا۔ یعنی جو لوگ انتظامیہ یا دوسرے سرکاری اداروں کی کمی پورا کرتے ہیں، وہ پہلے سے ہی موافق ہوں۔ دوسرے یہ کہ موجود اداروں کو درست کرنے اور پھر ایک معیار پر قائم رکھنے کیلئے علیحدہ پروگرام ترتیب دینا ہوگا۔ یہ جو میں نے سرکاری اداروں میں ہفتہ وار درس قرآن کا پروگرام شروع کرایا تھا تو اس میں ایک حکمت یہی تھی۔ ذرا غور کیجئے کہ اگر ملک بھر کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں جن کے اندر اس کام کیلئے کسی قانون یا ضابطہ کی

ضرورت نہیں، بلکہ ایک انتظامی حکم سے ایسا پروگرام نافذ کیا جا سکتا ہے، روزانہ ایک آدھ گھنٹہ یا دوسرے دن یا پھر کم از کم ہفتہ میں ایک بار درس قرآن ہو یا یہ کہ یہ تمام لوگ صبح کے وقت باقاعدگی سے قرآن کریم کی محض تلاوت ہی کرتے رہیں تو صرف اسی سے وہ ماحول پیدا کرنے میں کتنی مدد ملے گی۔ اس کو یوں دیکھیئے کہ فوج، پولیس، دوسری نیم فوجی تنظیمیں اور تعلیمی اداروں میں اگر یہ لوگ صبح کے وقت محض آدھ گھنٹہ کیلئے باقاعدگی سے صرف تلاوت ہی کیا کریں تو گویا دو کروڑ کے قریب افراد خدائے تعالیٰ کا کلام پڑھ رہے ہوں گے۔ پھر یہ کام جب اپنا اثر کرے گا تو ان لوگوں کے سب گھر والوں پر بیوی، بچوں پر بھی اس کا اثر مرتب ہو گا۔ الا ماشاء اللہ۔ تو اندزاہ کیجئیے کہ صرف اسی ایک کام سے جس پر محض آدھ گھنٹہ صرف ہوا ہو گا، کتنا عظیم کارنامہ سرانجام پا رہا ہو گا۔ کلام خداوندی کی اپنی برکات اور اثر انگیز معجزات جو صرف تلاوت ہی سے حاصل ہوتی ہیں وہ الگ۔

محض قانون کے نفاذ پر زور دینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کی ابھی اشد ضرورت ہے کہ جسم کے علاوہ دلوں کو تیار کیا جائے کہ وہ اس قانون کی بالا دستی کو قبول کر لیں۔ اسلام نے محض قوانین ہی نہیں دیئے بلکہ قانون خداوندی کو قبول کرنے کیلئے دلوں کی بیماری کا علاج بھی ساتھ ہی ساتھ عطا فرمایا اور یہ قرآن و حدیث ہے۔ ان کا مجرد پڑھنا بھی اس مقصد کیلئے بہت کافی ہے چہ جائیکہ اس کو سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ جہاں سے شروع کریں اسی مقصد کی جانب راہنمائی ہوتی ہے۔

جنگ اور جہاد میں فرق:

ہم نے 1947ء میں جہاد جہاد کہنا شروع کیا تو اس وقت بھی میرے خیال میں یہی بات تھی کہ بات تو ہم جہاد کی کریں لیکن نہ کوئی مجاہد نماز پڑھے نہ وضو کرے نہ دوسرے ضابطوں کا خیال رکھے تو یہ جنگ تو ہوسکتی ہے مگر جہاد نہیں ہوسکتا، چنانچہ اس پر بھی ہم نے توجہ دی اور اپنے ماتحت جو فوج تھی، جس کی تعداد تقریباً چھ ہزار کے قریب تھی، ان کیلئے پابندی

لگا دی تھی کہ نمازیں نہ صرف باقاعدہ وقت پر پڑھیں اور باجماعت پڑھیں، امامت کیلئے کسی مولوی کو تلاش نہ کریں بلکہ جو شخص بھی اس وقت موجود فوجیوں میں زیادہ ذمہ دار ہو وہی امامت کے فرائض سرانجام دے۔ اس پر اگرچہ پوری طرح عمل نہ ہوا لیکن اس کا اپنا ایک اثر ضرور ہوا۔ اچھی طرح عمل نہ ہو سکنے کی بھی جائز وجوہات تھیں۔ جن میں سے ایک یہ کہ یہ بالکل ایک انوکھی اور ان سنی بات تھی۔ بہرحال خدا کا کرم ہے کہ اس وقت جو کچھ اس ضمن میں مجھ سے ہو سکا اس کا نتیجہ بھی اس قدر عالی شان تھا کہ ہم اسی کا شکریہ نہیں ادا کر سکتے۔ خدا تعالیٰ کی غیبی امداد کے جو مظاہرے ہم نے دیکھے، جس طرح پروردگار نے ہم نہتے اور حقیقی معنوں میں بے سروسامان اور غیر تربیت یافتہ لوگوں کا رعب ہمارے دشمن کے دلوں میں بٹھایا، اس کا آج کوئی ادنیٰ سا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔

اقتدار اور نفاذ اسلام:

مختصر یہ کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے نقطہ نظر سے ماحول میں کیا خرابی اور ناسازگاری ہے، تب تک ذرہ برابر اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا خواہ کوئی کتنا ہی صاحب علم وفضل کیوں نہ ہو، جب تک کسی نے عملاً یہ کوشش نہ کی ہو اور یہ موقع اس ملک میں کس کو ملا ہے کہ اسے کچھ تجربہ حاصل ہوا ہو۔ ہماری سیاست میں کتنے لوگ ہیں کہ اگر ان کو حکومت ملے تو وہ اس کام کا ارادہ ہی رکھتے ہوں گے، ان کو حکومت ملے گی یا نہیں یہ امر محل نظر ہے اور اگر مل گئی تو قومی اتحاد کی حکومت کا حشر ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہ بات میں مایوسی کیلئے نہیں بلکہ خبرداری کیلئے کہہ رہا ہوں تا کہ جس کو اس کا شوق ہو وہ غلط فہمی یا اپنے بارے میں خوش فہمی میں نہ مارا جائے۔

اگر س وقت مارشل لاء کے تحت اسلام کا نام نہ لیا جا رہا ہوتا بلکہ ایک سیاسی نظام ہوتا تو ہمارے نکتہ آفریں اور نکتہ چیں لوگ صدر صاحب کی داڑھی سے بات شروع کرتے پھر اگر وہ رکھ لیتے تو یہ لوگ انچ ٹیپ لے کر اس کے طول وعرض پر بحث کرتے، لیکن مارشل لاء کی وجہ سے عام لوگ تو درکنار بعض خواص نے داڑھی کے بغیر ہی صدر صاحب کو امیر المومنین کا

لقب نہ صرف دے دیا بلکہ ان پر زور دیا کہ وہ اسے سرکاری طور پر اختیار کریں۔ خدا صدر صاحب کا بھلا کرے کہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور انھوں نے قیمتی مشورہ قبول نہ کیا۔

اسی سے مجھے یاد آیا کہ شاہ سعود جب پاکستان آئے اور سرکاری عمارت کے وسیع ہال سے گزر رہے تھے کہ ان کے ایک ساتھی نے جو شاید اسی کام پر مامور ہو گا۔ ظہر کی اذان دے دی، صفیں بن گئیں اور سب نے باجماعت نماز ادا کی۔ شاہ سعود نے معلومات کیلئے یا تعجب کی وجہ سے یا حقیقت سے واقفیت کی بناء پر ہمارے بڑے صاحب سے پوچھا کہ وہ یعنی سعود تو مسافر تھے، انھوں نے دو رکعت نماز پڑھی، مگر ان صاحب نے کیوں دو رکعتیں پڑھیں، تو اس وقت ہمارے ایک بڑے دیندار اور نیک شخص جو سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے، آڑے آئے اور شاہ سعود کو بتایا جو حقیقتاً غلط تھا کہ یہ صاحب نماز تو پڑھ چکے تھے محض رفاقت کے لیے نفل کے طور پر انہوں نے دو رکعت نماز پڑھ لی ہے۔ یہ بات بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ حکومت کے ایوانوں کی اپنی کس قدر اصلاح کی ضرورت ہے۔ ورنہ محض عوام پر زور دینا کہ وہ اسلام پر عمل کریں، اسلام کے ساتھ انصاف نہیں ہے، نہ یہ کہ بات آگے بڑھ سکتی ہے۔ حکمران کیلئے جہاں ماحول کو درست کرنا آسان ہے وہاں اس کی بھی کچھ مشکلات ہیں جو پیشِ نظر رہنا چاہئیں، تاکہ ان کا حل بھی ساتھ ہی دریافت کیا جائے۔

احساس جواب دہی:

اسلامی نظام میں جواب دہی کا اصول بھی دوسرے نظاموں سے مختلف ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہی جواب دہی کا احساس اور شعور ایک اسلامی حکمران کا طرہ امتیاز ہے، اس نظام میں ایک حاکم نہ صرف عوام الناس کے سامنے براہِ راست حقیقی طور پر جواب دہ ہے بلکہ وہ پروردگار کے سامنے بھی بلاواسطہ جواب دہ ہے۔ ایک طرح سے تو یہ علیحدہ علیحدہ معاملات ہیں، مگر درحقیقت ایک ہی ہیں، دوسرے نظاموں میں تو اگر کوئی خود کو عوام کے سامنے بالواسطہ یا بلا واسطہ جواب دہ سمجھے بھی تو وہ اس لیے ہے کہ عوام نے اسے منتخب کیا ہے یا زیادہ سے

زیادہ یہ کہ اس طرح اس کی حکومت کا کاروبار ٹھیک چلے گا اور وہ نیک نام ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر اسلام میں یہ جواب دہی ایک دوسری قسم سے ہے۔ اسلامی حکمران خود کو اگر پروردگار کے سامنے جواب دہ نہ سمجھے تو وہ ویسے بھی اسلامی حکمران کہلانے کا مستحق نہیں رہتا۔اور پروردگار کے سامنے جوابدہی کا خیال،شعور یا احساس بجائے خود ایک ایسا معاملہ ہے جو انسان کے اندر بے شمار تبدیلیوں کا سبب ہوتا ہے۔ جب عوام الناس کے سامنے جواب دہی کی بات ہو تو اسلامی حکمران اپنے آپ کو ہر فرد کے سامنے ہر قدم اور فروگذاشت کیلئے جوابدہ سمجھتا ہے اس لیے کہ دراصل یہ جواب دہی بھی خداوند عالم کے سامنے ہی جواب دہی ہے کیونکہ اس بارے میں بھی حکمران سے حساب لیا جائے گا، اس کو اسے لیے معاف نہیں کیا جائے گا کہ عوام نے اس سے اپنا حق وصول نہیں کیا یا یہ کہ وہ کسی اپنے بنائے ہوئے قانون کے زور سے بری الذمہ ہو گیا۔ وہاں تو اندر کی پوشیدہ نیت کا بھی حساب لیا جائے گا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ،ہمارے معاشرے میں کتنے ایسے لوگ ہوں گے جو حکومت کے بھی اہل ہوں اور جواب دہی کے اصول پر بھی یقین رکھتے ہوں، اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ ان میں سے اس اصول پر یقین اور اس کا شعور اس احساس اور پھر اس پر عمل پیرا ہونے کی صلاحیت کتنے لوگوں میں ہو گی۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں ہے کہ یہ اصول جس قدر سنگین ہے اسی قدر ہمارے حالات میں اس کو پوری طرح اپنانا اگر قطعاً ناممکن نہیں تو اس کے قریب ضرور ہے۔ اپنے ذاتی اور روزمرہ کے حالات میں اپنی ذات پر ہی اصول کا اطلاق کرنا کتنا دشوار ہے اور اس زندگی کی مادی لذتوں سے لطف اندوز ہونے والوں کیلئے تو یہ محض افسانہ ہے، جو بھی ہو مگر ایک اسلامی حکمران کیلئے اس سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے ورنہ اسلامی نظام کی روح فنا ہو جائے گی۔ اور ہم ایک بے جان لاشے کو گھسیٹ رہے ہوں گے۔ جیسا کہ میں نے کہا جتنا یہ معاملہ اہم، شدید اور سنگین ہے بلکہ دراصل اس دور کے انسان کے بس سے ہی باہر ہے، اسی قدر اگر نیت درست ہو اور واجبی حد تک ہاتھ پاؤں مارے جائیں تو اللہ تعالیٰ کی

نصرت، امداد اور راہنمائی کی توقع کرنی چاہیئے، اس کے بغیر ویسے بھی کام ممکن نہیں ہے۔ اس کیلئے بھی ضروری ہے کہ ایسا شخص دن میں کئی بار اللہ تعالیٰ کے بلند کلام اور اسماء پاک کے توسط سے امداد اور رہنمائی کی درخواست کرے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ کارحکمرانی بڑے سے بڑے متقی و پرہیز گار شخص کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جس سے خدا سے دوری کا رنگ چڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر پھر اسی خالق کون و مکان کا کرم نہ ہوتو اس شخص کا واپس لوٹنا مشکل ہوتا ہے۔

تزکیہ نفس، اوراد، وظائف:

صدارت سے قبل میں کچھ اوراد کا ذکر کیا کرتا تھا جس پر ایک عرصہ سے مداومت حاصل تھی، انتخابی مہم کی بے پناہ اور روز و شب کی مصروفیت کے باوجود ناغہ نہ ہوا تھا، صدارت کے دوران بھی اس کے خیال سے غافل نہ رہا۔ یہاں تک کہ جب کبھی دورے پر باہر جانا ہوتا تو واپس آ کر روزہ رکھتا تا کہ وہ رشتہ قائم رہے۔ بزعم خود مجھے اس بات پر اعتماد تھا کہ میرے ان معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا لیکن دیکھیئے کیا ہوا، اس کا کچھ اندازہ تو مجھے ان ہی دنوں ہونے لگا تھا باقی رفتہ رفتہ وقت گزرنے کے ساتھ ہوا۔ صدارت کے آخری سال نماز اور اوراد مجھ پر بوجھل ہو رہے تھے، تعداد روز بروز کم ہو رہی تھی، اس پر دلچسپ یہ کہ میرا نفس مجھے مطمئن کرنے کیلئے کبھی کچھ بہانہ بنا لیتا، کبھی کچھ۔ کبھی خیال آتا کہ یہ کارحکومت بہت اجر و ثواب کا باعث ہے، کبھی خیال آتا کہ اس دور میں اوراد وظائف کی تعداد زیادہ معتبر نہیں ہے، حتیٰ کہ پھر اس کا اثر نمازوں تک جا پہنچا، زائد نفل ترک ہو گئے پھر فرض و سنت میں بھی رخصت کی تلاش ہونے لگی اور آخری چند مہینوں میں میرے جسم میں جو بظاہر پہلے سے زیادہ تر و تازہ تھا کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی بھی سکت نہ رہی۔ رات کی نماز اکثر بیٹھ کر پڑھتا تھا، میں نے اس دور میں کئی ساتھیوں کو بتایا تھا کہ میں روزے اس لیے بھی رکھتا ہوں کہ مجھے اپنے جسم سے کراہت محسوس ہونے لگتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی غیر چیز ہے جس کو میں اٹھائے

پھرتا ہوں۔ شروع میں تو ایک دو یا زیادہ سے زیادہ تین روزوں سے وہ کیفیت درست ہو جاتی مگر بعد میں تو درجن بھر لگاتار روزوں سے بھی نہایت خفیف اثر ہوتا۔ خدا کا کرم یہ ہے کہ مجھے نہ صرف دوسری کیفیت کا علم تھا بلکہ پہلی کیفیت کا علم اور احساس سرے سے ختم نہ ہوا ورنہ اگر کم بختی ہی مقدر ہو تو وہ احساس ہی مٹ جاتا ہے اور آدمی اس دوسری خبیث کیفیت ہی کو صحیح سمجھنے لگتا ہے۔

چنانچہ جب میں صدر نہ رہا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی یاوری سے مجھے پھر تزکیہ نفس کا خیال پیدا ہوا، اس وقت میں نے محسوس کیا کہ بعض وہ وظائف جو میں صدارت سے قبل پڑھا کرتا تھا وہ نہ صرف مجھ سے چھوٹ چکے تھے بلکہ وہ میرے حافظہ سے ہی محو ہو گئے تھے، چنانچہ کئی سال تگ و دو اور سر توڑ کوشش کے بعد میں اب خدا کے فضل و کرم سے تعجب کرتا ہوں کہ میں نمازیں کیوں بیٹھ کر پڑھتا تھا۔ یہ طویل بحث ہے مگر اس سے مجھے کئی الجھی ہوئی باتوں کا تجربہ اور علم بھی حاصل ہوا، سب سے بڑھ کر یہ کہ کار حکومت کے ساتھ حکمران کے تقویٰ و پرہیز گاری کا تعلق کیا ہے اور وہ کیسے اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی طرح انسانی حافظہ کا معاملہ بھی سمجھنے میں بہت حد تک مدد ملی۔ یہ بھی اچھی طرح معلوم ہوا کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اتنی حدیثیں کیسے کسی کو یاد رہ سکتی ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے وغیرہ۔

جسم انسانی کو عبادت کے لائق بنانے کیلئے محض کھانا پینا ہی کافی نہیں بلکہ یہ کھانا پینا ایک حد سے گزر کر خود ایک مانع بن جاتا ہے۔ اعمال کا تعلق محض آخرت میں جزا و سزا سے ہی نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں بھی اعمال کا اثر جسم پر مرتب ہوتا ہے، لیکن اس کا علم آسان نہیں ہے کیونکہ سیاہ چادر پر اگر سیاہ دھبہ پڑ جائے تو کسی کو کیا دکھائی دے گا۔ اس کا بھی احساس ہوا کہ مولانا رومؒ نے جو اقتدار کو خدا سے دوری کا سب سے بڑا سبب بتایا ہے، اس کے کیا معنی ہیں، اس سے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو علاج کروانے سے انکار کیا تاکہ واپس حکومت میں نہ جانا پڑے تو اس کی حکمت کیا تھی۔ اس طرح ایک حکمران کیلئے اللہ

تعالیٰ کی وہ امداد جو محض اس کی مدت حکومت کو طول دینے کے لیے نہیں، بلکہ اس کو جواب دہی سے عہدہ برآ ہونے کیلئے ہو وہ کتنی ضروری ہے۔

خواہش حکومت:

یہ جو میں کئی بار کہتا ہوں کہ مجھے حکومت کا شوق نہیں ہے اور سیاست میں میری اپنی کوئی ذاتی غرض نہیں ہے، تو بعض لوگ اس کو میری کسر نفسی، سمجھتے ہیں، بعض شاید فریب نفس اور بعض محض فریب خیال کرتے ہوں گے۔ یہ کوئی دعویٰ ہے نہ تعلیٰ بلکہ اس معاملے میں مجھے خدا کے فضل و کرم سے جتنا تھوڑا سا تنکا بھر یا اس سے کم علم حاصل ہوا اتنا بھی کسی کو ہو تو وہ حکومت کی کبھی خواہش نہ کرے۔ لیکن یہ بے خبری بھی ایک لازمی امر ہے، بعض نے اسے سعادت قرار دیا ہے، تاہم اگر سب کو خبر ہو جائے تو دنیا کے یہ تمام کاروبار معطل ہو جائیں، اس لیے مشیت الٰہی کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر بے خبر ہی رہے ورنہ خبر، خبر ہے۔ یہ بھی سوچتا ہوں کہ بے خبری والوں کو شاید چھوٹ بھی مل جائے، بشرطیکہ ان کی نیت درست ہو، اس سے ایمان بالغیب اور ایمان بالمشاہدہ کی بھی ایک بحث چل پڑتی ہے اس کا بہر حال یہ محل نہیں ہے۔

اس موضوع یعنی ہمارے ہاں اسلامی نظام کے نفاذ و قیام کا اگر تفصیلی جائزہ لیا جائے تو یہ بڑی لمبی بحث ہو گی جس کیلئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں محض جستہ جستہ باتوں کا ذکر کرنا ہی مقصود تھا، جس سے پوری بات نہ سہی مگر اس کے کچھ نہ کچھ خدوخال تو ضرور واضح ہوں۔

میرے خیال میں جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ آیا ہوں۔ اسلامی نظام کسی جبر و مجبوری سے نافذ نہیں ہو سکتا۔ اس کیلئے آزادی اور ایسا ماحول درکار ہے جس میں صرف وہی نظام چل سکتا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضورﷺ نے بھی اسلامی نظام کے نفاذ کیلئے باقاعدہ حکومت قائم کی، تب وہ مقصد پورا ہوا۔ اس سلسلہ میں بڑی بحث درکار ہے۔ لیکن اس کا یہ پہلو

بھی کچھ کم اہم تاریخی حقیقت کا حامل نہیں ہے کہ حکومت کے قیام سے قبل اس قدر تیاری ہو چکی تھی اور ماحول ایسا ہو گیا تھا کہ دو میں سے ایک صورت ضرور تھی، ایک یہ کہ ماحول ایسا سازگار تھا کہ اسلامی نظام نافذ کیا جاتا تو وہ ماحول نہ صرف اس کو برداشت کر لیتا بلکہ اسے بخوشی قبول کر لیتا۔ دوسری یہ کہ وہ ماحول ایسا مکمل ہو چکا تھا کہ اس کا اپنا منطقی اور ناگزیر تقاضا ہی یہی تھا کہ وہاں اسلامی نظام نافذ ہو۔ لیکن یہ کہنا کہ صرف حکومت بننے کے بعد ہی سب کچھ ہوا، یہ تاریخی طور پر درست نہیں ہو گا بلکہ ایسا کہنا ہی مقصد کی تبدیلی کے مترادف ہے۔

اس کے باوجود میرے نزدیک مارشل لاء کی حکومت کسی بھی صورت میں اسلامی نظام کیلئے مفید نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس خرابی میں بھی شاید کوئی بھلائی کی ایک صورت ہے، وہ یہ کہ اسلامی نظام کو نافذ کرنے کا ابتدائی کام کتنا مشکل اور ہمارے حالات اور ماحول اس قدر ناسازگار کہ اس کا آغاز کرنے کا دوسرا کوئی راستہ عقلی طور پر موجود نہیں، مثلاً یہ کہ جو سیاسی جماعتیں مذہبی نہیں ہیں، ان کے پاس نہ اس کی کوئی فکر ہے نہ پروگرام، بلکہ اس نظام پر ان کا عقیدہ و اعتماد کتنا ہے یہ بھی محل نظر ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ہمارے ملک کی سیاسی جماعتوں کا انداز فکر زیادہ تر سیکولر نظام کی طرف مائل ہے۔ سیکولر کا صحیح ترجمہ تو لادینی ہوتا ہے مگر ہمارے حالات میں اس کا ترجمہ دنیوی ہو گا۔ رہ گئیں مذہبی جماعتیں تو ان میں بھی اس قدر اختلاف رائے ہے کہ گویا وہ بھی اپنے اپنے فرقے کی حکومت قائم کرنے کی خواہاں ہیں، جو ناممکن ہے۔ جماعت اسلامی کی ابتدائی فکر قدرے متوازن تھی مگر اب وہ ان ہی دوسری جماعتوں کی طرز پر اپنی ایک خاص فکر اور طرز کی سیاست اور حکومت کی خواہش مند دکھائی دیتی ہے، بلکہ شاید نیا طبقہ ہونے کی وجہ سے ان میں یہ گروہی تعصب دوسروں سے کہیں زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ یعنی اگر کسی ایک فرقے یا گروہ کی حکومت بن بھی جائے تو کیا اس امر کی گنجائش رہے گی کہ دوسروں کو برداشت کیا جائے اور انھیں اس ملک کا معزز شہری سمجھا جائے۔ یہ حضرات برسر اقتدار آ جائیں تو جو کچھ بھی اس وقت تک دکھائی دیتا ہے، اس کے مطابق تو تمام

شہری بلکہ خود اسلام کا معیار بھی جماعت ہی کے عقائد اور طرز فکر کے معیار پر پرکھا جائے گا۔

اسلام اور مذہبی فرقہ بندیاں:

مذہبی فرقوں کے ذکر کے سلسلہ میں مجھے ایک طوالت کا ڈر ہے دوسرے یہ بھی احساس ہے کہ خدانخواستہ یہ نہ سمجھا جائے کہ میں کسی بے ادبی کا مرتکب ہو رہا ہوں، مجھے تو جو صاف دکھائی دیتا ہے وہی گزارش کر رہا ہوں۔ فرقوں کی اس کشمکش سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ گویا اسلام ان ہی فرقوں کے ماتحت ہے۔ چاہیئے تو یہ کہ فرقے اگر ہوں تو اسلام کے ماتحت ہوں نہ کہ اسلام ان کے ماتحت ہو۔ اس کشمکش کی شدت اب سیاست میں بھی داخل ہو گئی ہے اور کوشش یہ ہو رہی ہے کہ حکومت پر قبضہ کسی ایک فرقے کا ہو، تب ہی اس حکومت کو اسلامی کہا جائے گا۔ اس تصور سے ہی وحشت پیدا ہوتی ہے، جہاں ایک دوسرے کیساتھ نماز نہ پڑھی جائے، کھانا نہ کھایا جائے۔ حتیٰ کہ بدقسمتی سے سلام نہ کیا جائے، بتایئے وہاں اگر ایسا کوئی شخص اس تعصب سمیت برسر حکومت آ جائے تو وہ کیا قیامت برپا نہیں کرے گا اور اس کو کون برداشت کرے گا۔ اس لیے ایسے تمام حضرات کو پورے خلوص سے یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ حکومت اور نظام کو اس کشمکش سے بچایا جائے، ورنہ اولاً تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی ایک فرقے کی حکومت قائم ہو لیکن اگر کسی حادثے سے ایسا ہو جائے تو پھر دوسرے فرقے والے مل کر اس حکومت کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیں گے اور ضرورت پڑے تو پڑوسی دشمن ملک سے امداد بھی حاصل کریں گے جو ایسی امداد کیلئے پہلے سے تیار بیٹھا ہو گا۔ بتایئے پھر ہم کہاں پہنچیں گے۔

دینی مدارس کی کیفیت:

غور کا مقام ہے کہ دینی مدارس پہلے بھی کم نہیں تھے مگر پاکستان بننے کے بعد ان میں کتنا اضافہ ہوا ہے، ان کی تعداد سینکڑوں نہیں ہزاروں ہو گی۔ اگر فی مدرسہ اوسطاً دس

نوجوان بھی سالانہ تیار کرے تو ایک سال میں کتنے دیندار لوگ ملک میں موجود ہونے چاہئیں۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں ہم کیسے ابھی تک عملاً اسلام سے دور ہیں بلکہ ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی الزام نہ آ جائے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف وہی ہے۔ جو میں نے کہی ہے کہ وہ طاقت ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہے، اس لیے اس کا کوئی مجموعی اثر ہو ہی نہیں سکتا۔ آج یہ لوگ اکٹھے ہو جائیں تو اسمبلیوں میں، وزارتوں میں، حکومت میں، ملازمتوں میں غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں، اور پھر اس ملک میں اسلامی نظام کون روک سکتا ہے۔لیکن اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوا تو ہمیں کسی غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیئے۔ سارا معاملہ ہی چوپٹ ہو جائے گا اور سب مل کر غیر اسلامی نظام کو ہی ترجیح دیں گے یا کسی کے آلہ کار یا ایجنٹ بن کر ہی زندہ رہیں گے۔

اس شدید کشمکش کی سنگینی سے حقیقت یہ ہے کہ خوف آنے لگتا ہے اور میرے جیسے کمزور ایمان مسلمان سوچنے لگتے ہیں کہ اس قیامت سے کون گزرے۔ لہذا ہم جس حال میں ہیں اسی میں ٹھیک ہیں۔ بلکہ اگر کوئی اور شخص یہ جرأت نہیں کرتا کہ دل کی بات زبان پر لائے تو میں کہتا ہوں کہ اس ملک میں بے شمار لوگ ایسے ہیں اور وہ مؤثر بھی ہیں جو ان ہی وجوہات کی بناء پر یہ چاہتے ہیں کہ ایسی مذہبی حکومت سے تو غیر مذہبی، بلکہ سوشلسٹ حکومت بہتر ہے۔ اس حقیقت سے چشم پوشی کرنا اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنے سے کم نہیں ہے۔ پھر یہ کہ اسلامی نظام حکومت سے تھیوکریسی کا جو تصور ابھر رہا ہے، جس سے ہمارے علماء حضرات بے خبر ہیں، بجائے خود ایسی قباحت ہے کہ جس کا ایک شدید ردعمل ناممکن نہیں ہے۔ علماء حضرات بھی بدقسمتی سے اپنے علم وفضل کی بناء پر بات نہیں کرتے بلکہ جس کسی کے پاس کسی مدرسے کی سند ہے چاہتا ہے کہ افضل و برتر عالم دین اسی کو تسلیم کیا جائے اور حکومت کا حق بھی اسی کا تسلیم کر لیا جائے۔ دینی مدرسے بھی اب تو تعداد پر زیادہ زور دے رہے ہیں، صلاحیت اور معیار پر نہیں۔

مارشل لاء کی افادیت:

یہی وجہ ہے کہ میرے خیال میں مارشل لاء اس مخمصے سے چھٹکارے کا ایک درمیانی راستہ ثابت ہو گا اور چند بنیادی کام جو اس دور میں ہو جائیں گے خواہ وہ کتنے ہی نیم پختہ کیوں نہ ہوں، ان پر شاید آگے چل کر کام کرنا آسان ہو گا۔ مارشل لاء اگرچہ ناپسندیدہ ہے تاہم ایک افادیت سے خالی نہیں ہے، بشرطیکہ مقصد بھی وہی ہو جس کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ انسانی فطرت میں اصلاح کے جس قدر طریقے ہیں ان میں ایک خوف ہے، خصوصیت کے ساتھ برائی کو ترک کرنے میں خوف و ڈر بھی بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ اس دور میں کچھ کام تو فی لواقع ہوئے ہیں اور کچھ مزید بھی ہو سکتے تھے اگر توجہ دی جاتی، ورنہ جو طوفان مارشل لاء سے پہلے اٹھا تھا اس کو روکنے کی کوئی دوسری صورت موجود نہیں تھی۔ یعنی دوسری صورت ایک مضبوط، مستحکم اور متبادل طاقتور قیادت ہی ہو سکتی تھی جو ظاہر ہے کہ دور دور تک دکھائی نہیں دیتی جب کہ یہ خطرہ تو بہر حال موجود ہے کہ مارشل لاء میں کئے گئے کاموں میں باقی رہنے کی صلاحیت ہے اور یہ کہ آنے والے سول نظام میں ان کاموں کو قبول کرنے اور ان کو ترقی دینے کی کسی قدر استعداد و صلاحیت ہے۔ یہ امر بے حد تشنہ ہے اور اس کا اس وقت کوئی قابل قبول جواب نہیں ہے، یہ تشنگی اور بھی بڑھ جاتی ہے جب پیشِ نظر یہ ہو کہ سب کوششیں جیسی بھی ہیں محض ایک شخص کی ذات اور اس کی پشت پر فوج کی منظّم قوت کی وجہ سے ہیں یعنی ان کے پیچھے کوئی سول اور منظّم ادارہ نہیں ہے۔ اس نظام میں کیے گئے کاموں کیساتھ کسی دوسرے شخص کی کوئی ذمہ داری ہے نہ اس طرح کی وابستگی، جس طرح اپنے کیے ہوئے کام کے ساتھ ہوتی ہے تاہم مارشل لاء کی وجہ سے بظاہر ایک نہ ہونے والی بات یا نہ کھلنے والی گرہ تو کھل گئی ہے۔ مستقبل کی ذمہ داری بہر حال آنے والے لوگوں پر ہے وہ خود کو اس کام کے اہل ثابت کرتے ہیں یا دنیا و آخرت میں رسوا اور ذلیل ہوتے ہیں۔

خدشات وخطرات:

اس مشق کے بارے میں ایک بات جو مجھے اکثر کھٹکتی رہتی ہے وہ یہ کہ بحیثیت مسلمان ہماری اکثریت کی یہ خواہش اور آرزو بالکل بجا کہ ہمارا نظام اسلامی ہو، لیکن ایک سوال کا جواب نہیں ملتا کہ ایک طرف ہم وہ لوگ ہیں جو اپنے بنائے ہوئے نظام کو چلانے میں بری طرح ناکام ہو گئے ہیں بلکہ دنیا میں اس نااہلی کی اپنی مثال آپ ہیں اور منہ دکھانے کے قابل نہیں ہیں۔ دوسری طرف ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس نااہلیت کے باوجود ہم خداوند عالم کا دیا ہوا، نظام جو انسانیت کی تمام بیماریوں کا علاج ہے، وہ نظام نافذ کرنے لگے ہیں۔ اس پر سوائے حیرت کے اور کیا کیا جا سکتا ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ایک شخص جو ایک سیر وزن نہیں اٹھا سکتا ہے وہ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میں ایک سو من وزن اُٹھا سکتا ہوں، اس بات پر یقین کرنا آسان نہیں ہے۔

اسلامی نظام کے مقابلے میں دوسرے نظام کی حیثیت ابجد کی ہے۔ اگر ہم اس ابتدائی مرحلہ میں بھی تتلا رہے ہیں تو اعلیٰ مراحل کی کتابیں اُٹھائے پھرنے پر ہمیں کوئی کیا کہے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ جب ان تمام امور کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو میاں حیات بخش صاحب کی بات سچی معلوم ہوتی ہے کہ ''ہم بنجر زمین میں اعلیٰ بیج ڈال رہے ہیں''۔ ترجیحات درست نہ ہونے اور منصوبہ بندی کی کمی یا غلطی کی وجہ سے کیا صورت ہوتی ہے اسکی ایک مثال یہ ہے کہ اس وقت میٹرک کے طلباء کو اپنے فارم پر ایک مذہبی امور کا حلف نامہ دینا پڑتا ہے۔ لیکن جن بچوں کو قرآن پڑھایا ہی نہیں گیا اور جن کا ماحول ان معنوں میں اسلامی نہیں، ان سے اگر حلف لیا جائے تو وہ محض جھوٹ ہوگا تو اس مشق سے گویا ہم اسلامی نظام کے ضمن میں منافقت پھیلا رہے ہوں گے۔ یہ بات بظاہر چھوٹی سی ہے مگر اس کا نقصان کتنا اہم ہے۔

اسلام آباد میں اسلامی یونیورسٹی:

اسی طرح اسلام آباد کی اسلامی یونیورسٹی کا بھی عجیب حال ہے، جس مقصد کیلئے وہ

بنائی گئی ہے ابھی اس کا ماحول ہی اس مقصد کے خلاف ہے، اس وقت تو وہ یونیورسٹی بجائے کسی اور کی اصلاح کرنے کے خود اپنی اصلاح کی محتاج ہے۔ یہ بھی ناقابل فہم ہے کہ اس یونیورسٹی کی نگرانی کیلئے مصر سے کسی صاحب کو لایا گیا ہے، احساس کمتری ہے یا غلامی کے اثرات، بہر حال اس کا کوئی معقول جواز نہیں ہے۔ اس میں سرمو شک نہیں ہے کہ وہ صاحب کتنے ہی صاحب علم وفضل، تقوی و پرہیزگاری میں بدر جہا افضل بلکہ ان کے استاد ہونے کے اہل ہوں، مصر کے حضرات ویسے بھی جدیدیت کے اس قدر شکار ہیں کہ خدا نہ کرے ان کی اسلامی فکر بھی ہمارے ہاں رائج ہو۔ اس یونیورسٹی کو حقیقی معنوں میں اسلام کی خدمت کے قابل بنانے کیلئے ایک نگران بورڈ قائم کرنا چاہیئے جو تمام مذہبی طبقوں سے تعلق رکھتا ہو، ورنہ اس وقت یونیورسٹی بددلی، مایوسی اور نفرت و انتقام کے سوا بہت کم نتیجہ پیدا کر رہی ہے۔ یہ تعلیمی ادرہ تو علم وعرفان، محبت و رواداری اور قرآن وسنت کی زندہ تصویر ہونا چاہیئے نہ کہ اس کی وہ حالت جو اس وقت اس کی ہے۔

قرآنی ترجیحات:

حکومت کے بارے میں قرآن حکیم میں جو احکام الٰہیہ ہیں ان سب پر اس وقت بات نہیں ہوسکتی، مگر ایک حکم خداوندی پر ان تمام حضرات کو ضرور غور کرنا چاہیئے جو اسلامی نظام کے آرزومند ہیں، خواہ وہ برسر اقتدار ہیں یا نہیں، یا کبھی آسکتے ہیں۔

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلاۃ و اتوا الزکوٰۃ و امر و بالمعروف و نھو عن المنکر۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اسلامی حکومت کی ترجیحات کی ایک ترتیب خود ہی قائم فرما دی ہے اور یہی وہ قطعی راستہ ہے جس پر چل کر وہ ماحول میسر آئے گا جو اس نظام خداوندی کا متحمل ہو سکے گا، اس کو قبول کرے گا اور اس وقت تک اس کا ساتھ دے گا جب تک لازمی ترجیحات اور ترتیب کو حکمران قائم رکھیں گے اور اس کا اہتمام کرتے رہیں گے۔ اس

کی تشریح کا یہ مقالہ متحمل نہیں ہو سکتا۔

صدر پاکستان نے علماء کرام کی ذمہ داریوں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ بالکل حقیقت ہے، اس پر تمام طبقات کو مل کو غور کرنا چاہیئے۔ سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ ماحول کو ایک رُخ پر ڈالا جائے۔ اس کیلئے ایک تو اختلاف کی شدت ختم کرنا ہو گی۔ دوسرے مشترکہ نکات پر اتفاق کرنا ہو گا۔ تاکہ عوام و خواص کے ذہنوں میں جو خلجان اور الجھن ہے وہ بھی دور ہو اور لا دین عناصر اس انتشار کا فائدہ نہ اُٹھائیں۔ پھر یہ کہ علماء کرام اپنے قول وفعل سے عوام الناس میں اسلام کا علم وعمل پھیلا کر ان کے کردار کی اصلاح کریں۔ کردار کے لحاظ سے ہم اس وقت اسفل السافلین سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ جھوٹ، فریب، دغا، نفرت، قاتلانہ گفتگو، خودغرضی و ہوس، غرضیکہ کوئی ایسا عیب نہیں جو ہم میں نہیں ہے۔ یہ کوئی انفرادی مرض نہیں ہے، بلکہ پوری قوم اس میں مبتلا ہے، اگر کوئی بچا ہوا ہے تو محض حادثہ نما نالائقی یا امداد خداوندی کے باعث، ورنہ اس حمام میں پوری قوم ایک مذاق بنی ہوئی ہے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ اگر خدانخواستہ یہ عمل ناکام ہو گیا تو اس کا شدید ردعمل ہو گا اور اس ردعمل کا سب سے اولین نشانہ علماء و مشائخ اور وہ لوگ جو اسلامی نظام کی بات کرتے ہیں، ہوں گے ان میں سے کوئی نہیں بچے گا، کسی کی توبہ یا لجاجت قبول نہ ہو گی۔ خدا وہ وقت نہ لائے مگر اس کے آثار اور عناصر ہمارے معاشرے میں جو زیرِ زمین ہیں وہ تو ہیں، مگر جو ظاہر ہیں وہ بھی کچھ معمولی نہیں ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے اکثر حضرات کی توجہ اس طرف نہیں ہے اور ہم ان سے قطعاً غافل ہیں۔ گویا ہماری یہ غفلت ان کی قوت کا باعث ہے۔

مقصود ملت:

ہمارے لیے آزادیء کشمیر سے مقصود ملت پاکستانیہ کے ساتھ الحاق ہے اور ظاہر ہے کہ الحاق کا مقصود اسلام ہے۔ اس سے بعض نکتہ چیں لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر کسی وجہ سے پاکستان میں اسلامی نظام نہ آئے تو کیا پھر بھی کشمیریوں کو اسی پاکستان کے ساتھ الحاق کر

لینا چاہیئے؟ تو میں اس کے جواب میں یہ کہتا ہوں کہ اولاً تو یہ مفروضہ ہی غلط ہے اور اگر خدانخواستہ یہ درست بھی مان لیا جائے تو کشمیر میں ایسی کون سی صلاحیت موجود ہے جس کے ذریعے وہاں بہرصورت اسلامی نظام لایا جا سکے گا۔ جو عناصر پاکستان میں اسلامی نظام کا راستہ روک سکتے ہیں وہ کشمیر میں بدر جہا زیادہ اس کام کے اہل ہیں۔ دوسرا یہ کہ اگر فی الواقع کشمیریوں میں ایسی صلاحیت ہو کہ وہ ان تمام حالات کے علی الرغم اسلامی نظام لا سکتے ہیں تو پھر اس صلاحیت کو پورے ملک میں کیوں نہ بروئے کار لایا جائے جیسا کہ حکیم الامت نے بھی فرمایا:

ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے

اور تیسرے یہ کہ اگر ہم خدانخواستہ مایوسی کا شکار ہو جائیں اور خود کو بھیڑ بکریاں بنا لیں تو پھر بھی اکیلے رہنے سے سواد اعظم کیساتھ رہنا ہی بہر حال بہتر ہے۔

حصہ سوم

مسلم کانفرنس کی حکومتی خدمات

مثبت تحریکیں:

کل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے 1970ء سے 1975ء تک کے دور حکومت میں کچھ ایسے کام انجام پائے ہیں کہ اگر ان کو ہماری قومی زندگی سے نکال دیا جائے یا وہ نہ ہوئے ہوتے تو آج نہ صرف ہماری پوری قومی تاریخ ہی مختلف ہوتی بلکہ مستقبل بھی تاریک اور بے مقصد ہو گیا ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ ان کاموں کی عدم موجودگی سے جو منفی اور تخریبی رجحانات پیدا ہوتے ان کو اسلام اور پاکستان دشمن قوتیں ہمارے وجود کے خلاف ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کرتیں۔ ان کاموں کا مختصر سا جائزہ لیتے ہیں۔

قرارداد الحاق پاکستان:

سب سے اول قرارداد الحاق پاکستان ہے۔ یہ قرارداد 19/جولائی 1947ء کو سرینگر کے مقام پر پاس کی گئی۔ جن حالات اور مشکلات میں یہ قرار داد پاس ہوئی، ان کا تفصیلی ذکر اس مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ کچھ ذکر پہلے کر چکا ہوں، کوئی بھی محبّ وطن اگر ماضی کے حوالے سے تاریخ پر نگاہ دوڑائے گا تو وہ ان فرزندان ریاست کو خراج عقیدت وتحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکے گا، ان کے جذبہ ایمانی اور سیاسی فہم وفراست کو ایک تاریخ سلام کرتی رہے گی مگر اس کا تعلق صرف ان ہی لوگوں سے ہے جو پاکستان کی تخلیق، سلامتی، بقاء اور استحکام پر یقین رکھتے ہیں، دوسرے کو نہ صرف اس قرارداد سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ اس کو ایک حادثہ یا ایک غلط سیاسی قدم قرار دیں گے۔

جب یہ قرارداد پاس ہوئی، اس وقت ایک طرف شیخ محمد عبداللہ تھے جو بدقسمتی سے دو قومی نظریئے کے خلاف اور وطنیت یا ایک قومی نظریئے کے حامی تھے اور اس وجہ سے ریاست کا الحاق بھارت کے ساتھ کرنا چاہتے تھے، دوسری طرف مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کیلئے ایک

خوش کن اور دلفریب نعرہ لگایا جا رہا تھا کہ ریاست جموں وکشمیر کو ایک خودمختار مملکت کے طور پر علیحدہ رکھا جائے۔ بلکہ ستم ظریفی یہ ہے جیسا کہ میں ذکر کر آیا ہوں، ریاستی مسلمانوں کی اس قومی پارلیمانی کل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے قائدین کو یہ غلط اطلاع بھی دی گئی کہ خود قائداعظم بھی چاہتے ہیں کہ ریاست کو خودمختار رکھا جائے۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ وہ وقت تھا کہ مسلمانوں کے مسلم راہنما چوہدری غلام عباس بھی جیل میں تھے اور پیچیدہ مرحلہ میں جماعت کی مرکزی ہائی کمان نے ان تمام سازشوں کے علی الرغم الحاق پاکستان کی قرارداد پاس کی، جس سے ایک طرف ریاست کو بھارت کا ترنوالہ بنانے کی شازش ناکام ہوگئی تو دوسری طرف خود پاکستان کی بقاء وسلامتی کا اہتمام ہوگیا۔ بصورت دیگر نہ آزاد کشمیر ہوتا نہ کشمیر کی آزادی کا کوئی سوال ہوتا۔ بھارتی سرحد سیالکوٹ سے لے کر ایبٹ آباد تک پھیلی ہوتی اور پاکستان روز اول سے ہی بھارت کے رحم وکرم پر ہوتا۔

اس نظریہ کے بارے میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ محض کسی وقت سیاسی مصلحت پر موقوف نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد خالصتاً اسلامی تھی۔ پاکستان کے ساتھ الحاق تو غالباً بعض کشمیری پنڈت بھی چاہتے تھے لیکن مسلمان تو بہر حال اسلام کے لازوال رشتے کی وجہ سے بھی الحاق چاہتے تھے۔ یہی وہ بنیادی امر ہے جو کشمیریوں کی اس تحریک کو دوسری سیاسی تحریکوں کے مقابلے میں زیادہ تقدس عطا کرتا ہے۔ مسلم کانفرنس نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ ایک قرارداد پاس کر دی اور بس، بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کیلئے کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ صرف یہی نہیں اس مقصد کو برقرار رکھنے میں آج تک جس استقامت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا ہے وہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے، جو مسلم کانفرنس کو دوسری سیاسی تنظیموں سے ممتاز کرتا ہے۔ ہماری مرکزی حکومتوں کی سطح پر اس بات کی پوری کوشش کی گئی کہ الحاق پاکستان کی اس تحریک کو اسلامی کردار سے محروم کر دیا جائے تاکہ یہ محض ایک سیاسی تحریک بن کر رہ جائے، لیکن مسلم کانفرنس نے بہر حال ہزار مشکلات کے باوجود اس تحریک کے تقدس کو برقرار رکھا۔ اسلامی

کردار سے اس تحریک کو محروم کرنے کی سازش کی لمبی داستان ہے۔ لیکن یہی وہ کیفیت ہے جو بھارت کیلئے ایک نعمت ثابت ہوسکتی ہے، کشمیر کی آزادی کی اس تحریک کو اگر اس کے اسلامی کردار سے محروم کر دیا جائے تو قصہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ کشمیر کی آزادی کی تحریک دوسری تحریکوں سے اسی لیے منفرد ہے کہ اس کی بنیاد اسلامی تشخص پر ہے، بھارت کو اگر مزید اقدام کرنے میں کوئی امر مانع ہے تو وہ بھی یہی اندرونی کیفیت ہے جسے صرف مسلم کانفرنس نے برقرار رکھا ہوا ہے۔

الحاق پاکستان کے علاوہ جس قدر دوسری تحریکیں ہیں وہ سب کی سب کشمیر کی آزادی کی تحریک کو لادینی اور خالصتاً سیاسی بنانے پر لگی ہوئی ہیں۔ ان تحریکوں کو جیسا میں کئی جگہ ذکر کر آیا ہوں ہماری بدقسمتی سے حکومتی سطح پر، کسی نہ کسی درجے میں کھلی پذیرائی بھی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ بعض اوقات تو مرکزی حکومتیں اور ان کے کارندے ان لادینی تحریکوں کی حمایت محض اس لیے بھی کرتے ہیں اور ان کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں کہ کہیں مسلم کانفرنس طاقتور نہ ہو جائے، صرف الحاق کی تحریک ہی ایسی ہے جس کو سرکاری سطح پر زبانی جمع خرچ میں پسندیدگی کی نظر سے شاید دیکھا جاتا ہے لیکن اس کی حمایت کرنے کے عزم سے بہر حال اصولاً پرہیز کیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ مرکزی حکومتیں الحاق کی تحریک سے ہندو پتنی کی طرح کیوں شرماتی ہیں؟

کشمیر بنے گا پاکستان کا قومی نعرہ:

دوسرا اہم تاریخی کارنامہ ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کا نعرہ۔ یہ محض تاریخی اتفاق ہے کہ یہ نعرہ عین اس وقت شروع کیا گیا جس وقت ہم 1970ء کے انتخابات کی مہم کا آغاز کر رہے تھے۔ یہ وقت بھی ریاست کے مسلمانوں کیلئے انتہائی آزمائش کا ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ آج جب ہم ماضی پر نظر دوڑاتے ہیں اور ان خوفناک سازشوں پر غور کرتے ہیں تو سوائے اللہ کے کرم کے اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہم بچ کیسے گئے، یہ راستہ کس نے ہمیں سمجھایا؟ اس وقت اندرونی سیاسی کیفیت یہ تھی کہ ایک طرف مرکزی حکومت کا پورا اثر و رسوخ اس بات پر

مرکوز تھا کہ آزاد کشمیر کو علیحدہ خودمختار مملکت کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ علاوہ اس کے یہ نعرے ویسے بھی فیشن کی طرح ہی جاذب خیال اور پر کشش ہوتے ہیں، خاص کر ہماری جواں نسل میں حکومت اور اس کے کارندوں کی حمایت کی وجہ سے اس کو ملک کیلئے مفید سمجھا جا رہا تھا۔ پھر جلتی پر تیل کے طور پر مرکزی حکومت جو سلوک آزاد کشمیر کیساتھ کر رہی تھی اس پر محبّ وطن کشمیری کا جگر خون ہو رہا تھا، اس حالت کی تصویر کشی نہ صرف دلخراش ہے اور گڑے مردے کھودنے کے مترادف ہے بلکہ اس موضوع کے احاطے سے باہر ہے۔ اس کا کچھ اندازہ صرف ان دو باتوں سے ہوسکتا ہے کہ وزارت امور کشمیر کے ڈپٹی سیکرٹری صاحبان کا کوہالہ کے مقام پر استقبال کیا جاتا تھا اور بعض دفعہ ان کو گارڈ آف آنر بھی پیش کیا جاتا تھا۔ دوسرا یہ کہ خان عبدالحمید خان کو جب صدر بنایا گیا تو مظفر آباد میں اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے وزارت امور کشمیر کے اس وقت کے سیکرٹری اور حکومت کے آئرن مین (فولادی شخصیت) اے۔بی اعوان صاحب نے بلا حجاب و رعایت یہ فرمایا تھا کہ آزاد کشمیر کی حکومت تو محض لوکل اتھارٹی ہے۔ ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے آج دوران خون تیز ہو جاتا ہے بلکہ خون کھولنے لگتا ہے۔

اس کربناک اور ذلت آمیز صورت حال سے نہ صرف نوجوان نسل خاص کر طلبہ بری طرح مگر جائز طور پر متاثر تھے اور علیحدگی پسند عناصر کا پسندیدہ شکار گاہ بنے ہوئے تھے، بلکہ سرکاری ملازمین تو گویا شب و روز اسی مایوسی، بد دلی اور بدگمانی کے باعث ملک اور نظریئے سب ہی سے متنفر تھے۔ یہ تھی اجمالاً وہ صورت حال، جس میں وہ انتخابات منعقد ہوئے تھے۔

جب یہ الفاظ لکھتے ہوئے جذبات کا بھی اظہار کر رہا ہوں تو مجھے ساتھ ہی اس امر کا بھی احساس ہو رہا ہے کہ ہمارے بعض لوگ اس عبارت کو پڑھ کر خوش ہوں گے، بلکہ یہ پراپیگنڈہ کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے کہ ''دیکھو کس طرح سردار عبدالقیوم کی کشمیری رگ پھڑک اٹھی''۔ اس قسم کا پراپیگنڈہ میری کئی تقریروں اور تحریروں کی وجہ سے پہلے بھی کیا جاتا رہا

ہے، بلکہ جیسا کہ میں ذکر کر آیا ہوں مجھے بھی ان حلقوں میں پاکستان سے متنفر اور علیحدگی پسند سمجھا جاتا رہا۔ حقیقت یہ نہیں کہ میری کشمیریت کی رگ پھڑک اٹھتی ہے بلکہ یہ رگ حمیت ہے، آزادی و انسانیت کی رگ ہے جو صرف کشمیریوں کیلئے ہی نہیں بلکہ ملک بھر کے لوگوں کیلئے خواہ وہ بلوچی ہوں، سندھی ہوں یا پٹھان یا پنجابی سب ہی کیلئے یکساں پھڑک اٹھتی ہے۔ میں جہاں کہیں بے انصافی یا زیادتی دیکھتا ہوں، مجھے اس بے انصافی کی گود میں پرورش پانے والا فتنہ بھی دکھائی دیتا ہے اور ملک عزیز کی سلامتی کیلئے خطرہ دکھائی دینے لگتا ہے تو میری رگ حمیت اسی طرح پھڑک اٹھتی ہے۔ ایسی حالت میں وہ انتخاب سر پر آ گیا۔ بعینہ جس طرح حالیہ انتخاب ہے۔ اگر خدانخواستہ مسلم کانفرنس وہ انتخابات ہار جاتی اور لبریشن لیگ جیت جاتی جو عین ممکن تھا کیونکہ وہ دوسرے نمبر پر آئی تھی تو پھر نظریہ الحاق پاکستان کا کیا حشر ہوتا، اس کا آج کوئی تصور نہیں کر سکتا لبریشن لیگ کی حیثیت اس وقت یعنی انتخاب سے قبل بظاہر ایسی تھی کہ وہی کامیاب دکھائی دیتی تھی۔ پھر تو دو ہی صورتیں تھیں یا بھارت آزاد کشمیر پر فوج کشی کرتا یا حکومت پاکستان اس پر فوجی قبضہ کر لیتی۔

اب ذرا غور کیجئیے کہ ایک طرف مرکزی حکومت کا یہ حال ہو اور آزاد کشمیر کی اندرونی حالت زار بھی ایسی ہو دوسری طرف ایک جاذب خیال اور پر فریب نعرہ لگ رہا ہو یعنی آزاد کشمیر کو ایک خودمختار مملکت تسلیم کیا جائے، جس کے معنی پوشیدہ نہیں ہیں، تو دیکھئیے کہ اگر عین اس وقت نعرہ ''کشمیر بنے گا پاکستان'' نہ لگتا تو یہ قوم آج ایک بے کس یتیم کی طرح کس کس کا منہ نہ تک رہی ہوتی۔

چنانچہ اس وقت خدا کی مہربانی اور حسن اتفاق سے کسی بہت سنجیدہ اور طویل مشق سے گزرے بغیر ہی نعرہ شروع کیا گیا جو آگے چل کر روز بروز مفید ثابت ہو رہا ہے بلکہ ہماری تحریک کے تسلسل کو حال اور مستقبل کے ساتھ مربوط کر رہا ہے۔ اگر اس وقت یعنی 1970ء میں یہ نعرہ شروع نہ کیا گیا ہوتا تو آج ہماری قوم کے نوجوان بچے کیا کرتے؟ وہ کیسے تمیز

کرتے کہ خودمختاری تسلیم نہ کرو اور دارالسلام کے منفی نعروں میں سے کون سا نعرہ ان کے ماضی، حال اور مستقبل کی ضمانت ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے، کہ ان تخریبی نعروں کے پیچھے ضرور کوئی مؤثر طاقت ہے جو سوچ سمجھ کر ایک منصوبہ بندی کے تحت ہماری یک جہتی کو پارہ پارہ کر کے کشمیر اور پاکستان کی سلامتی و بقاء کو مستقل طور پر خطرے میں ڈالنا چاہتی ہے۔ ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کے اس نعرے کو شروع کرنے کا مشورہ کہاں ہوا اور کس سے ہوا؟ وہ بھی ایک دلچسپ امر ہے۔ یہ بھی ان عظیم تاریخی واقعات میں سے ہے جن کی ابتداء گمنام اور بظاہر معمولی درجے کے لوگوں نے کی۔

چنانچہ مسلم کانفرنس کی حکومت کو خدائے تعالیٰ نے یہ توفیق دی کہ اس نعرے کو نہ صرف جماعت اور عوام کی سطح پر عام کیا اور جزو ایمان بنایا بلکہ اس کو تعلیمی اداروں اور سرکاری تنظیموں میں بھی نافذ کیا تاکہ پوری قوم کا رُخ ایک طرف ہو جائے اگر بعد میں آنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ قومی بصیرت عطا کرتے اور ان کی نیتیں بھی ٹھیک ہوتیں تو آج ہم کسی ایک جگہ سے بھی منفی نعرہ نہ سنتے۔ مسلم کانفرنس کی یہ بھی ایسی انفرادیت ہے جو ہماے پورے ملی وجود کی ضمانت ہے۔ پھر بھی اکیلے ہی سہی، مگر مسلم کانفرنس نے اس نعرے کے ذریعے دوسرے تمام منفی اور تخریبی نعروں کو بے اثر کر دیا ہے۔ رفتہ رفتہ اس پوری قوم کا رُخ ایک طرف ہو رہا ہے۔ بھارت کو اگر کسی بات سے کشمیر میں کوئی خوف یا پریشانی ہوسکتی ہے تو وہ ہماری ملی یکجہتی ہے جس کا نعرہ ہے: ''کشمیر بنے گا پاکستان''

یہ ہماری یک جہتی کی ضمانت ہے، یہی وہ فکر ہے جس پر پوری کشمیر قوم متفق و متحد ہے۔ اس میں جو کچھ بھی خلا پیدا ہوا وہ ہماری غفلت، لاپرواہی اور مقصد کے احساس وشعور کی کمی کی وجہ سے ہوا ہے لیکن وہ دور یقیناً گزر گیا ہے۔ آج یہ ملت پھر اپنے قومی جھنڈے تلے اپنے قومی موقف پر یک جا ہو رہی ہے اور اگر ہماری حکومتوں، عوام، سیاسی کارکنوں اور جواں سال نسل نے اس نعرے سے انحراف نہ کیا اور اس کو مضبوطی سے تھامے رکھا تو ہماری سیاست

میں یہی وہ نعرہ ہے جو اللہ کی رسی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ سے تحریک آزادی کشمیر کی کامیابی ممکن ہو گی، اسی کے باعث آزاد کشمیر کی اپنی آزادی جو پروردگار کی بے بہا نعمت ہے، وہ بھی برقرار رہے گی، اسی کے ذریعے خدا اور اس کے رسول ﷺ اور اسلام کے نام پر قائم ہونے والے ملک پاکستان کی سلامتی بھی ممکن ہو گی اور یہی وہ طریقہ ہے جس میں ہماری موجودہ اور آنے والی نسلوں کے حال اور مستقبل کی مکمل ضمانت ہے۔ مگر بات وہی ہے کہ اس کو کسی سیاسی مصلحت پر قیاس نہ کیا جائے، بلکہ جزو ایمان بنایا جائے اور جیسا کہ اللہ کے حبیب ﷺ نے فرمایا ''داڑھوں سے پکڑا جائے'' تب یہ مقاصد حل ہو سکتے ہیں۔

میرے دور صدارت میں آزاد کشمیر کے گوشے گوشے اور کونے کونے میں معصوم بچے دن بھر ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کے نعرے لگاتے رہتے تھے، جنگل، پہاڑ اور وادیاں ان معصوم آوازوں سے گونج رہی تھیں۔ لیکن جب مجھے صدارت کی کرسی سے ایف ایس ایف کے ذریعے برطرف کیا گیا تو اس حادثہ کا اثر ایک طویل عرصہ تک اتنا گہرا تھا کہ جلسوں، جلوسوں میں کارکنوں کو یاد دلانا پڑتا تھا کہ ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کا نعرہ بھی لگایا جائے۔ جیسے وہ دل دماغ سے بالکل نسیاً منسیاً ہو گیا تھا۔

لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ایک بار پھر وہی کیفیت بلکہ اس سے بہتر کیفیت پیدا ہو رہی ہے، اپنے ان دوروں کے دوران میں نے دیکھا ہے کہ گرمی میں، سردی میں برف باری اور بارش میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر، جنگلوں اور وادیوں میں ہزار دو ہزار لوگ مسلم کانفرنس کا سبز ہلالی پرچم اُٹھائے ہوئے جوش وخروش کیساتھ ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ ہمارا دل و جان اور بال بال پروردگار کے حضور شکر کے جذبے سے سرشار ہو جاتا ہے جس نے ہمیں ایسے گئے گزرے دور میں اس مقدس جذبے کو برقرار رکھنے کی توفیق دی۔ میں جب اپنے کارکنوں اور خاص کر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نوجوانوں اور معصوم بچوں کو یہ نعرہ لگاتے ہوئے سنتا ہوں تو مجھے جو مسرت ہوتی ہے اس کا اندازہ خدا تعالیٰ ہی کر سکتا ہے،

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میری چالیس سالہ کاوشوں کا ثمر اللہ تعالیٰ نے عطا کر دیا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اس نعرے نے تمام منفی وتخریبی نعروں کی جاذبیت اور کشش کو بے معنی کر دیا ہے، دوسرا اس لیے کہ مخالفین اسلام اور پاکستان کے دشمن جو ہماری جواں نسل سے امیدیں باندھے ہوئے تھے کہ یہ نسل ان کے کام آئے گی ان کو خدا نے نامراد کر دیا۔

فتنہ قادیانیت کا سد باب:

تیسری بات جو ایک تاریخی سنگ میل ہے اور جس کی توفیق اللہ تعالیٰ نے مسلم کانفرنس کو دی وہ قادیانیوں کے فتنے کے بارے میں وہ تاریخی فیصلہ تھا جو اس وقت کی آزاد کشمیر اسمبلی نے کیا تھا۔ اس کی بھی اپنی ایک تفصیل ہے۔ لیکن یہ موقع اس تفصیل میں جانے کا نہیں ہے اس وقت صرف یہ کہنا تھا کہ، وہ ایک فتنا خود ایسا تھا، جس کے بارے میں قومی موقف کو سرکاری سطح پر تسلیم کیا جانا ضروری تھا، ورنہ محض تقریروں میں ہی رہتا اور یہ قوم خوش ہوتی رہتی کہ ہم نے حق ادا کر دیا ہے جب کہ قادیانی امت دوسری طرف پوری اطمینان کے ساتھ پاکستان کے اندر اور باہر کام کر رہی تھی بلکہ روز افزوں ترقی پر تھی۔

آزاد کشمیر کی اسمبلی کے اس فیصلہ سے پہلی بار سرکاری سطح پر یہ معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ اسلام کا ہی ایک فرقہ نہیں بلکہ بالکل علیحدہ امت ہیں، جن کے نزدیک ہم باقی سب لوگ غیر مسلم اور کافر ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک ہے نہ مانع کہ آج جس کا جو جی چاہے کہے، لیکن قادیانی حضرات کا اثر و رسوخ ملک کے اندر اور باہر ایسا تھا کہ ان کے بارے میں سرکاری سطح پر ان کے غیر مسلم ہونے کی بات کرنا ہلاکت کو دعوت دینا تھا۔ بلکہ وقت ایسا آ رہا تھا کہ اگر ہمارے علماء حضرات، خدا ان کو جزائے خیر دے، درمیان میں نہ ہوتے تو ہمارے تعلیم یافتہ اور، سربرآوردہ اور کارحکومت میں شریک حضرات بھی اس امت کی بالادستی کو ایک طرح تسلیم کر رہے تھے۔ خاموشی نیم رضا مندی کے مصداق ان کے اثر و رسوخ کا انداز ان الفاظ سے کیجیے جو ظفر اللہ خان نے قائداعظم کے جنازے کے موقع پر کہے، وہ ایک طرف بیٹھے رہے اور

جنازہ نہ پڑھا، اور اس جواز میں مشہور جملہ کہا ''مجھے کافر حکومت کا مسلمان وزیر خارجہ سمجھیں یا مسلمان حکومت کا کافر وزیر خارجہ'' یہ جملہ اس ملک میں کہنا معمولی کام نہ تھا یہ اس شخص کی شخصی یا ذاتی جرأت نہ تھی کہ اس نے ایسا کہا بلکہ یہ سب اسی طاقت اور اثر و رسوخ کا نتیجہ تھا جو اس وقت بھی اس امت کو حاصل تھا۔

دوسرا واقعہ لاہور میں پہلے مارشل لاء کے نفاذ کا ہے جس میں وہ قادیانی حضرات جو فوجی افسر تھے، فوجی گاڑیوں میں بیٹھ کر مسلمانوں کو مشین گنوں کا نشانہ بنا رہے تھے اور ہماری حکومت اور فوج امن و امان کے نام پر ان کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ یہ بھی اسی طاقت اور اثر ونفوذ کی دلیل ہے جس نے ان حضرات کو اس درجہ دلیر کر دیا تھا۔

اس پر طرہ یہ کہ اس بات کو اصول کے طور پر تسلیم کیا جا رہا تھا کہ یہ صورت حال درست ہے۔ یہ لوگ جو جدید تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں اور بڑے عہدے پر فائز رہے ہیں اور بعض ابھی تک ایسے ہوں گے، وہ یہ خیال کرتے تھے کہ قادیانیوں کے بارے میں جو اختلاف ہے وہ محض مولویوں کی اختراع ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ مولوی حضرات ایک دوسرے کے خلاف فتوے تو دیتے ہی رہتے ہیں۔ خود مرزا ناصر محمود نے پارلیمنٹ میں جو بیان دیا اس میں بھی اس کا زیادہ تر زور اسی امر پر تھا کہ علماء کی کیا بات ہے یہ لوگ تو ہر زمانے میں ایک دوسرے کو کافر قرار دینے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اگر وہ بات اسی پر ختم کر دیتا تو معاملہ بہت خطرناک ہوتا، کیونکہ بھٹو صاحب ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ وہ بھی قادیانیوں کے مسئلے کو مولویوں کا معاملہ ہی سمجھتے تھے، لیکن اگر مرزا ناصر نے خود یہ نہ کہا ہوتا کہ باقی سب لوگ غیر مسلم ہیں یا محض فنی قسم کے مسلمان ہیں اور اصلی مسلمان قادیانی ہیں، تو انہوں نے کہا کہ ''ان کو بھی یقین نہ آتا کہ اصل صورت حال کیا ہے''۔

جس وقت آزاد کشمیر میں وہ قرارداد پاس ہوئی اس وقت امت قادیانیہ کا اثر ونفوذ اپنے کمال پر تھا۔ اس قرارداد کے بعد مجھے کئی مسلمان ملکوں کے سفیروں نے مل کر بتایا کہ ان

کے ملک میں عوام اور حکومت کو پہلی مرتبہ اس قرارداد کے باعث یہ پتہ چلا ہے کہ وہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ نہیں ہے، بلکہ ایک علیحدہ امت ہیں۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ جب بھٹو صاحب نے ہماری اس قرار داد کے بعد مجھے بلوایا اور اس موضوع پر بات چیت کی تو میں نے ان سے کہا کہ مجھے تو کوئی خطرہ نہیں ہے اگر خطرہ ہے تو وہ خود بھٹو صاحب کو ہے۔ انھوں نے پوچھا وہ کیسے؟ تو میں نے کہا ''دیکھیئے ان حضرات نے نیچے سے لیکر اوپر تک یعنی حکومت کی سطح تک ایک پیرامڈ (PYRAMID) بنا دیا ہے۔ اب صرف ایک قدم اُٹھانے سے وہ حکومت پر فائز ہو سکتے ہیں''۔ ان کو شاید حیرت ہوئی ہو، پوچھنے لگے وہ کیسے؟ میں نے بتایا کہ ''ہماری دفاعی قوت یعنی بری، بحری اور ہوائی تینوں افواج میں ان کے لوگ اب پوری طرح قابض ہیں اور جو ان کے ماتحت ہیں، کچھ بے حمیت ہیں تو کچھ اپنی اصل سے غافل، اور کچھ اس سے بدظن یا بدگمان۔ یہی حال سول سروس کا ہے۔ چنانچہ ان کیلئے اب صرف آپ کو ایک طرف کرنا باقی ہے''۔ وہ سنتے رہے اور سوچتے رہے، جواب کچھ نہ دیا، ان ہی دنوں بیگم بھٹو کیساتھ بھی اس ضمن میں میری بات ہوئی۔ انھوں نے بھی کچھ فرمایا تھا جو پھر کبھی عرض کروں گا۔ چنانچہ لوگوں نے دیکھا کہ ہماری فوج کے کمانڈر ان چیف نے اپنے اس وقت کے خلیفہ کو ایک تقریب کے موقع پر کھلم کھلا ہوائی سلامی دی۔ یہ بات کوئی راز نہیں ہے۔ مجھے تو اس امر کا بھی کچھ علم ہے کہ اس دور میں ایک ایسا وقت بھی آ گیا تھا کہ بعض لوگ یہ تجویز کر رہے تھے کہ مرزا ناصر محمود کو پاکستان کا صدر بنا دیا جائے۔

یہ تھے وہ حالات جن کا راستہ اگر کسی چیز نے اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی کے بعد روکا ہے تو وہ وہی قرارداد تھی جو آزاد کشمیر اسمبلی نے پاس کی تھی، ورنہ خدا جانے کیا صورت ہوتی۔

مراکش میں قادیانی حضرات سر ظفراللہ خان کے اثر و رسوخ کے ذریعے ایک بین الاقوامی ریڈیو سٹیشن قائم کرنا چاہتے تھے، اس کو بھی ہماری اس قرارداد کی وجہ سے روک دیا گیا۔ اس کا ذکر بھی کسی جگہ کر آیا ہوں۔

چوتھا تاریخی کارنامہ جو مسلم کانفرنس کی اس حکومت کے ہاتھوں انجام پایا وہ آزاد کشمیر میں اسلامی قوانین کا نفاذ تھا، اس کے بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔ وہ کام اگرچہ بذاتہ کوئی معمولی نوعیت کا نہیں تھا لیکن اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جبکہ اس کا موازنہ اس وقت کیساتھ کیا جائے جس وقت اللہ تعالیٰ نے ہم سے وہ کام لیا، یہ وہ وقت تھا جب کہ ایک طرف پاکستان بنے عرصہ دراز گزر گیا تھا، لیکن ابھی کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے کہ پاکستان کو جو مقصد بتایا گیا تھا وہ کب پورا ہو گا یا اس کی جانب کب کوئی مثبت اور مؤثر قدم اُٹھائے گا۔ یعنی اس ملک میں خدا اور اس کے رسول ﷺ کا بتایا ہوا نظام زندگی کب اپنایا جائے گا۔ اسی وجہ سے مایوسی کا عجیب عالم تھا۔ خواص تو ویسے ہی دنیاوی سیاست (سیکولرزم) کی رو میں بہہ رہے تھے اور کم ہی ایسے ہوں گے جن کو اپنی ذاتی زندگیوں میں اسلام نافذ کرنے کی توفیق ملی ہو۔ دوسری طرف ہمارا تمام نظام زندگی، سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تھا۔ ان لوگوں کو کمیونزم میں تو اپنی گنجائش نظر آتی ہے، مگر اسلامی نظریہ میں زیادہ تر مشکلات دکھائی دیتی ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف اسلامی نظام کے مخالف ہیں بلکہ اس ملک کے اکثریتی طبقہ یعنی متوسط طبقے کے بھی مخالف ہوتے ہیں۔

اسلامی نظام زندگی کی بنیاد:

عوام میں یہ احساس بھی پختہ ہو رہا تھا کہ اس بارے میں جس قدر وعدے وعید کیے جا رہے ہیں وہ سب ہی جھوٹے تھے۔ اسلامی نظام بس ایک نیک آرزو ضرور ہے یا قصہ پارینہ، عوام الناس ایک تو عقیدے اور ایمان کے جذبے کی بناء پر اسلامی نظام کے خواہش مند تھے، دوسرے وہ اپنے مسائل کا حل بھی اسی نظام میں سمجھتے تھے کیونکہ برسہا برس سے ان کو یہی تبلیغ کی جاتی رہی تھی کہ صرف اسلامی نظام ہی میں تمام انسانی مسائل کا حل ہے، لیکن جب اس نظام کے آنے کی کوئی صورت دکھائی نہ دی تو لامحالہ اس کا نتیجہ مایوسی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا، چنانچہ عین اس مایوسی کی کیفیت میں سوشلزم، روٹی، کپڑے اور مکان کا نعرہ بلند ہونا شروع

ہو گیا، جس نے ہر شخص کی توجہ فطری طور پر اپنی جانب مبذول کروا دی۔ میں نے اپریل 1968ء میں لاہور موچی دروازہ میں جمعیت علماء اسلام کے ایک عام جلسے میں تقریر کرتے ہوئے علماء حضرات کی توجہ اس طرف دلائی تھی کہ عنقریب ایک طوفان اُٹھنے والا ہے اس کی طرف توجہ کی جائے مگر اس وقت کسی نے نوٹس نہ لیا۔ وقت کے تیزی سے بدلتے ہوئے تقاضے اس کیفیت پر جلتی پر تیل کا کام کر رہے تھے۔ ہمارا معاشرہ ہی اندر سے بری طرح زہر آلود ہو رہا تھا۔ جب طبقاتی تفریق کے خلاف چھوٹا ہی سہی مگر پہلا کلمہ کسی کے منہ سے نکلا تو دبی چنگاریاں پٹرول کے شعلے کی طرح یکا یک بھڑک اٹھیں۔ ابھی چند ہفتے ہی گزرے ہوں گے کہ وہ طوفان فی الواقع اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر علماء حضرات نے فتوؤں کے ذریعے اس کی راہ روکنا چاہی تو وہ کوششیں اس طوفان کے آگے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔

یہ تھا وہ وقت جب آزاد کشمیر میں اسلامی نظام زندگی کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ یہ محض حسن اتفاق ہے کہ سوشلزم کا نعرہ لگانے والے بوجوہ غیر مؤثر ثابت ہوئے جبکہ آزاد کشمیر میں ہم لوگوں نے نہایت اخلاص مندی اور ایمان ومحبت کیساتھ اسلام کے کام کو شروع کر دیا اگرچہ بظاہر اس سے کوئی بڑا انقلاب تو رونما نہ ہوا لیکن یہ دینی نظریات کے لیے ایک فوری چیلنج ضرور ثابت ہوا۔ بجائے اس کے کہ وہ لوگ بلا شرکت غیرے اور کسی روک ٹوک کے بغیر ہر چیز کو روندتے ہوئے چلے جاتے، ان کیلئے لاینحل الجھن ضرور پیدا ہوگئی، بلکہ وہ لوگ جو دل سے کسی مثبت بات کے آرزو مند تو تھے مگر یہ نہ جانتے تھے کہ وہ ہے کیا اور گھنٹی کون باندھے، ان کے لیے ایک واضح راستہ بھی نکل آیا۔

چنانچہ یہ اسی کارروائی کی برکت تھی کہ جب پاکستان میں قومی اتحاد کی تحریک چلی تو اس تحریک کا رُخ متعین کرنا مشکل نہ رہا تھا، ورنہ اگر وہ رُخ متعین نہ کیا جاتا تو محض جمہورت کی بحالی کیلئے اتنی جانیں قربان کرنا شاید ممکن نہ ہوتا، جیسا کہ ہم بعد میں کافی تجربہ کر چکے ہیں، تو گویا اس طرح وہ تحریک جو آزاد کشمیر سے چلی تھی وہی بعد میں آنے والے واقعات کا

پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ پھر جو کچھ اس بارے میں مارشل لاء کی حکومت میں ہوا یا ہو رہا ہے اس کو بھی ممکن بنانے میں یقیناً آزاد کشمیر میں کی جانے والی کارروائی ایک سنگِ بنیاد ثابت ہوئی۔

ذلك فضل الله يوتيه من يشاء

جہاد کشمیر:

پانچویں تاریخی کام کے طور پر اس جہاد کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جو 1947ء اور 1948ء میں مسلم کانفرنس کے جھنڈے تلے کیا گیا۔ اس کو بھی اک خاص تاریخی نوعیت اور حیثیت حاصل ہے، لیکن چونکہ وہ جہاد اسی قرارداد الحاق کا نتیجہ تھا جو مسلم کانفرنس نے 19/جولائی 1947ء کو پاس کی تھی اس لیے اس کا ذکر علیحدہ طور پر نہیں کیا گیا، ورنہ وہ بھی ایسا عظیم تاریخی بلکہ تاریخ ساز کارنامہ ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اگر اس وقت ایسا نہ ہوا ہوتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ آج اس مملکت خداداد کی کیا صورت ہوتی۔ نہ وہ تاریخی واقعات ہوتے جو ہر صورت میں مسلم کانفرنس کے کھاتے میں ہمیشہ شمار ہوتے رہیں گے، نیز یہ اس سیاسی کردار کے علاوہ ہیں جو اس جماعت کا معمول رہا ہے اور وہ بھی ایسا امتیاز ہے جسے بے شک اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس جہاد کی تفصیل کیلئے بجائے خود ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے، یہ مضمون تو اس حد تک تشنہ رہے گا اور محض یہ کہہ لینے سے کہ کشمیر میں جہاد ہوا ہے پوری بات تو درکنار اس کا معمولی سا حصہ بھی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ اس ایک طرح کے منفرد تاریخی کارنامے کے بارے میں کوئی ایک بھی مستند کتاب موجود نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ زیادہ تر سنی سنائی خبروں یا اخباری اطلاعات پر مشتمل ہے اور اس کا مقصد بھی تاریخی انصاف نہیں ہے۔

میں جب اپنے لوگوں سے دنیا کی دوسری تحریکوں کی تعریفیں سنتا ہوں کہ فلاں تحریک چلائی جائے اور فلاں کی طرح تو مجھے اپنے لوگوں کی بے خبری پر حیرت ہوتی ہے۔ انھیں یہ نہیں معلوم کہ ہم ہی لوگوں نے 1947ء، 1948ء میں ایسا تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

جس کی مثال پیش کرنا مشکل ہے، لیکن بد قسمتی سے اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے اہل قلم حضرات کو شرم آتی ہے۔ اگر یہی کارنامہ کسی اور ملک یا قوم نے انجام دیا ہوتا تو خدا جانے تاریخ دان اس پر کیا کیا نہ لکھتے، اس قوم کی کئی نسلیں اس پر فخر کرتیں اور ایک دنیا ان کی مثال دینے پر مجبور ہوتی۔

اس جہاد کے بارے میں کئی پہلو تشنہ ہیں۔ اس تحریک کا صحیح پس منظر کیا تھا۔ اس نے مسلح بغاوت کا رنگ کب اور کیسے اختیار کیا؟ وہ تحریک جہاد کیوں کہلائی؟ اس کے جہاد ہونے میں شک کیا تھا؟ وہ جہاد کن نامساعد حالات میں کیا گیا؟ کیا اس بے سر و سامانی میں کسی اور قوم نے بھی اسی طرح بتیس ہزار مربع میل تو درکنار محض بتیس میل بھی کہیں آزاد کروائے ہیں؟ محاذ جنگ پر لوگوں نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے، دشمن کی فوج کی حالت کیا تھی؟ اس میں ریاست کے لوگوں کا کیا کیا کردار تھا۔ اہل پاکستان نے کیا امداد دی، حکومت پاکستان کا کردار کیا تھا، کیا اس جہاد کیلئے وہ وقت درست تھا یا نہیں؟ اور اگر وہ جہاد نہ کیا گیا ہوتا تو پھر کیا صورت ہوتی؟ غرضیکہ درجنوں پہلو ایسے ہیں جن کے صحیح علم کے بغیر اس تحریک کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اگر خدا تعالیٰ نے ہمت دی تو ان شا اللہ اپنی قوم کا یہ قرض بھی ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ میں نے جن دنوں مسلم کانفرنس کے بارے میں یہ عبارت لکھی، ہم لوگ میرپور ضلع کے دورے پر تھے۔ ان ہی دنوں طالبات کے ساتھ ایک نشست میں کسی طالبہ نے مجھ سے یہی دریافت کیا کہ مسلم کانفرنس کیا ہے؟ اس کا کردار کیا ہے؟ تو میں نے جواباً یہی تین چار واقعات بیان کیے تھے۔ ایک دوسری کمی جو اس کتاب میں مجھے خود محسوس ہوتی ہے وہ ہماری سیاست کے اہم پہلو ہیں، ہماری سیاست اور سیاست دانوں کو ان پہلوؤں سے کسی نہ کسی مرحلے میں واسطہ ضرور پڑتا ہے لیکن کسی نے اس پر لکھا نہیں اس کی بھی ضرورت ہے تاکہ اس سائنس کے بارے میں دوسرے لوگوں کو بھی کچھ معلوم ہو سکے اور بوقت ضرورت اس سے راہنمائی بھی حاصل کی جا سکے۔ اپنے

تجربات کی روشنی میں اس پر بھی ان شاء اللہ کچھ لکھوں گا۔

نظریاتی سرحدوں کا تحفظ:

اس ضمن میں مجھے آخر میں یہ بھی کہنا ہے کہ دنیا بھر میں جو ملک بھی نظریاتی ملک ہے یا جس ملک میں کوئی بنیادی نظریہ ہے جسے قائم رکھنا ضروری ہے، اس نظریئے کی حفاظت کو بہر حال ہر معاملہ میں اولیت حاصل ہے اور ہونا بھی چاہیئے۔ اس لیے خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نظریئے اور عقیدے کا تحفظ کیسے کیا جائے؟ کیوں کہ محض یہ فرض کر لینا کہ وہ نظریہ خودبخود اپنے وزن کے اعتبار سے قائم رہے گا، انسانی تاریخ میں کئی بار غلط ثابت ہو چکا ہے حتیٰ کہ الہامی مذاہب بھی زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکے ہیں۔

نظریات کو محفوظ رکھنے اور ان کو تا دیر قائم رکھنے کیلئے حجم اور صلاحیت دونوں کو بہر صورت مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

یہ حجم اور صلاحیت کے فلسفہ کی تشریح بھی طوالت طلب ہے، مگر اتنا جاننا کافی ہے کہ اس سے کوئی مفر نہیں۔ اب دونوں کو قائم رکھنے کیلئے کیا کرنا پڑتا ہے، جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ بذاتہ ایک طویل موضوع ہے، جس پر ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ مگر اس وقت ہم جس صورت حال سے دو چار ہیں اس کے پیشِ نظر اس ضمن میں دو طرح سے یہ کام ہونا چاہیئے، ایک تو یہ کہ سرکاری سطح پر پوری دیانت اور سنجیدگی سے اس نظریئے کا تحفظ کیا جائے جس پر ملک یا معاشرہ قائم ہے، دوسرے یہ کہ عوامی سطح پر اس کو فعال متحرک اور مؤثر رکھا جائے۔

اگر یہ کارروائی محض حکومت کی سطح تک محدود رہے گی تو ایک وقت لازماً ایسا آئے گا جب محض قوت کے استعمال سے ہی اس نظریئے کا تحفظ کیا جا سکے گا، جیسا کہ کمیونسٹ ممالک میں ہو رہا ہے۔ اگر آج وہاں عوام الناس کو اجازت ہو اور طاقت کے استعمال کا وہ خوف نہ ہو، جو ہے تو ناممکن ہے کہ کوئی بھی ملک کمیونزم کو برقرار رکھ سکے۔ اگر یہی طریقہ جمہوری ممالک

میں استعمال کیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہاں جمہوریت باقی نہیں رہے گی۔ اگر جمہوریت نہیں رہے گی تو پھر وہی بادشاہت، آمریت اور جبر و تشدد کی حکمرانی ہو گی۔ اس وقت جب کہ دنیا بہت سکڑ گئی ہے اور لوگ ایک دوسرے سے فوراً متاثر ہو سکتے ہیں، یہ معاملہ اور بھی مشکل ہو گیا ہے۔ اس لیے محض وزن پر نہیں بلکہ صلاحیت پر یہ سب کچھ موقوف ہے۔

اس صلاحیت کو برقرار رکھنے کا طریقہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ کوئی ایسی تحریک قائم ہو جو عوام الناس کو اس نظریئے کے ساتھ وابستہ رکھ سکے، اس کے بغیر ناممکن ہے کہ وہ نظریہ اور عقیدہ دیر تک مؤثر ثابت ہو، چنانچہ اپنے ملک کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اس خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ پاکستان کا دولخت ہونا، اندرونی انتشار، اور یکجہتی کا فقدان اور پھر اس وقت کسی سمت کا متعین نہ ہونا، یہ سب کچھ شاخسانہ ہے اسی ایک کمی کا یعنی نظریات کو برقرار رکھنے کی کسی عوامی تحریک کا نہ ہونا، اس ملک میں تو ہماری حکومتوں نے بھی اس میں مجرمانہ غفلت برتی اور محض چل چلاؤ کی حد تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھا جو دن گزر گیا اسی کو غنیمت سمجھا گیا اور حال یہ کہ نہ کوئی نظریہ، نہ عقیدہ، نہ پروگرام۔

اس پس منظر میں اگر مسلم کانفرنس کے کردار کو دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ کتنا عظیم الشان کردار ہے جو اللہ کے فضل سے جماعت ادا کر رہی ہے اور اگر اس کردار کو ایک محدود وقفے کیلئے منہا کر دیا جائے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے؟ ایک ایسا نقار خانہ جس میں کوئی کسی کی آواز نہ سن سکتا ہو، اللہ تعالیٰ ہمارے عوام و خواص کو بوڑھوں اور جوانوں، حکمرانوں اور سیاست کاروں، سب ہی کو یہ حقیقت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

و آخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین۔

حکومت آزاد کشمیر کی آئینی حیثیت اور مرکزی

حکومت کے ساتھ تعلقات کی نوعیت

آزاد کشمیر کی آئینی حیثیت کیا ہے اور مرکزی حکومت کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے، کیوں ہے اور کیا ہونی چاہیئے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو آئے دن کیے جاتے ہیں، خاص طور پر وہ لوگ جو نہ تو کشمیر کی آزادی کی تحریک سے آشنا ہیں نہ اس میں اپنی کوئی ذمہ داری سمجھتے ہیں بلکہ وہ اس کو اب ممکنات میں سے ہی نہیں سمجھتے اکثر اس بارے میں دریافت کرتے رہتے ہیں۔

موجودہ آئینی حیثیت:

موجودہ حیثیت میں آزاد کشمیر نہ تو ایک علیحدہ خودمختار مملکت ہے نہ آئینی طور پر پاکستان کا حصہ ہے نہ اس کا الحاق ہوا ہے جیسا کہ معلوم ہے۔ آزاد کشمیر کی ایک علیحدہ حکومت ہے، ایک عبوری آئین ہے جس کے تحت صرف صدر ہوتا تھا مگر اب ایک صدر اور ایک وزیراعظم ہے اور ایک علیحدہ سپریم کورٹ ہے بلکہ نظریاتی کونسل بھی علیحدہ ہے۔ البتہ آزاد کشمیر کی جو دو ڈویژن فوج تھی اس کو سیز فائر کے بعد پاکستان کی فوج کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ موجودہ آئین کے تحت ایک کشمیر کونسل بھی ہے، جو حکومت آزاد کشمیر اور پاکستان کے مابین آئینی تعلق قائم کیے ہوئے ہے۔ یہ کونسل بھٹو صاحب کے دور میں قائم کی گئی تھی۔ اس وقت اس کے اختیارات صرف ان معاملات تک محدود تھے جو ویسے بھی مرکز کے پاس ہونے چاہئیں مگر جلد ہی تجاوز کر کے ان اختیارات کو وسعت دے دی گئی اور آج آزاد کشمیر کی حکومت نصف سے زائد اختیارات سے محروم ہے۔

پاکستان کی ذمہ داری اور کشمیریوں کی مجبوری:

حکومت پاکستان کا تعلق اس بین الاقوامی ذمہ داری سے شروع ہوتا ہے جو سلامتی کونسل میں کیے گئے معاہدے کی رو سے آزاد کشمیر کے علاقہ میں امن و امان قائم رکھنے اور سیزفائر کی پابندی کرنے کے ضمن میں حکومت پاکستان کے ساتھ طے پایا تھا۔ اس معاہدے کے علاوہ بھی چونکہ حکومت پاکستان محض امن و امان اور سیز فائر ہی کی نگرانی نہیں کرتی بلکہ آزاد کشمیر کے معاشی، اقتصادی اور انتظامی معاملات میں بھی ہر قسم کی امداد مہیا کرتی ہے، اس لیے اس کا دخل بھی اسی نسبت سے ضروری ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ آزاد کشمیر کا خطہ زمین چونکہ مملکت خداداد پاکستان کا اہم ترین دفاعی علاقہ ہے اس لیے بھی حکومت پاکستان کی ذمہ داری محض سیزفائر لائن کی دیکھ بھال تک محدود نہیں رہ سکتی۔ یہ ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے جب پاکستان کی یہ حیثیت مدنظر ہو۔ بدقسمتی سے ہماری حکومتوں نے اپنی سیاسی بے سر و سامانی کے باعث یا اپنی لاپرواہی کی وجہ سے یا اپنی سادگی پر بھارتی لیڈروں کو قیاس کرنے کے باعث اپنے آپ کو بھارت کے ہاتھ میں یرغمال بنا دیا ہے۔ کہیں بھی کشمیر کی آزادی کی کوئی بات ہو تو بھارت کی طرف سے پاکستان پر حملہ کی دھمکی دی جاتی ہے اور پاکستان ابھی اس قابل نہیں ہے کہ کشمیر کے سوال پر ایک بھرپور جنگ کا خطرہ مول لے۔ اگر یہ بات کسی کتاب میں درج نہیں ہے۔ مگر امر معلوم اور نافذ العمل ہے اس لیے حکومت پاکستان کی جانب سے ہر قسم کی پیش بندی اور احتیاط کی جاتی ہے۔ بات محض احتیاط تک ہی نہیں رہتی بلکہ ایسے واضح اقدامات کیے جاتے ہیں، جن سے بھارت کو بھی اطمینان ہو۔ کبھی کبھی تو بھارت کے اطمینان کے علاوہ کچھ بڑی طاقتوں کو بھی اطمینان دلانا پڑتا ہے۔ ایک دو بڑی مثالیں دیکھیے۔

1958ء میں جب مقبوضہ کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ صاحب کی گرفتاری اور اس سے پیدا ہونے والے سنگین حالات کے ردعمل میں رئیس الاحرار چوہدری غلام عباس نے سیزفائر لائن

عبور کرنے کی تحریک چلائی تو حکومت پاکستان نے پہلے تو ہر قسم کی گفت وشنید کے ذریعے اس تحریک کو روکنے کی کوشش کی، لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر سرحدات پر فوج کے ذریعے اس کو روکا گیا۔ قائد ملت اور ان کے تمام رفقاء کو جیل خانوں میں بند کر دیا گیا۔ جب مارشل لاء لگا تو سب کو رہائی ملی۔ یہ تحریک پر امن تھی اور کسی قسم کے فوجی تصادم کا اندیشہ نہیں تھا، پھر بھی اس کو جبراً روک دیا گیا۔ اسی طرح مسلم کانفرنس نے تحریک المجاہد کو منظّم کیا تو ابھی وہ وقت آیا ہی نہ تھا کہ یہ تحریک کوئی اقدام کرتی، حکومت پاکستان نے دہلی کو تحریری طور پر یقین دلایا کہ اس قسم کی کوئی تحریک چلنے نہیں دی جائے گی، بلکہ حکومت نے اس امر کا ہر طرح سے اہتمام کیا کہ یہ تحریک نہ چل سکے۔ میری معلومات کی حد تک تو صرف بھارت کو ہی نہیں بلکہ ہمارے کچھ اور دوستوں کو بھی اس امر کا یقین دلانا پڑا تھا۔ غرضیکہ حکومت پاکستان کی یہ ایسی بلاتحریر ذمہ داری ہے کہ اگر اس کی خلاف ورزی کی جائے تو بھارت کے خلاف تحریک چلانے کے بجائے پہلے یہیں گھر میں ہی تصادم شروع ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے تصادم کی موجودگی میں کون تحریک چلا سکتا ہے اور وہ کیسی تحریک ہو گی۔

اس یرغمال کی صورت حال کا حکومت پاکستان پر اتنا گہرا اثر اور دباؤ ہے کہ بعض ذمہ دار حضرات سیزفائر لائن کو پاکستان کی سرحدات سے بھی زیادہ مقدس سمجھتے ہیں۔ 1953ء میں میری گرفتاری کی وجہ بھی محض یہی تھی۔ یہ کیفیت اگرچہ کچھ تو ظاہری مادی اسباب یعنی طاقت کے تناسب کی وجہ سے ہے اور کچھ محض بے جرأتی، یقین کی کمی، بصیرت کے فقدان، سہل پسندی اور شکست خوردہ ذہنیت کا شاخسانہ ہے، ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم اپنی ضروریات کے ہم پلہ قیادت سے بھی محروم ہیں۔ چنانچہ اس پسپائی کا اثر یہاں تک ہے کہ بعض ذمہ دار حضرات یہ کہنے کی تو جرأت نہیں کرتے کہ ''بھائی اب بس کرو بہت ہو گیا آزادی کشمیر کا قصہ'' مگر اس پر زور دیتے ہیں کہ آزادی کی تحریک خالصتاً مقبوضہ کشمیر کے اندر چلے تو ان کو کوئی اعتراض نہ ہو گا، مگر اس طرف اس کا نام لینا بھی جرم سمجھا جانا چاہیے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ کشمیر کی کوئی تحریک تنہا مقبوضہ کشمیر میں نہیں چل سکتی، اس تحریک کا اصل بیس کیمپ آزاد کشمیر ہے، یہی وجہ ہے کہ بھارت اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ آزاد کشمیر سے کوئی تحریک چلے، اور ہمارے بعض ارباب اقتدار بھی اسی پر مطمئن ہیں۔ اس کے باوجود آزاد کشمیر میں بقیہ کشمیر کی آزادی کیلئے جو لگن اور جذبہ اور صلاحیت ہے، اس وجہ سے بھارت کو کبھی اطمینان نہیں ہوا کہ اس کو کامیابی کے ساتھ ہمیشہ کیلئے ختم کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بھارت کے نزدیک اس کا اب واحد حل یہ رہ گیا ہے کہ وہ آزاد کشمیر پر بھی فوجی قبضہ کر لے۔

یہ جو ماضی میں ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی تقسیم کی بات ہوئی کبھی کنفیڈریشن کی، کبھی ثالثی کی اور کبھی کچھ، تو یہ سب اسی ایک صورت حال سے نمٹنے کیلئے تھا۔ کبھی آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کا خیال کبھی سیز فائر لائن کو کنٹرول لائن بنانا اور کبھی اس کنٹرول لائن کو مستقل سرحد بنانے کیلئے اس کو ایسی راہ گزر بنانا جس پر ویزے اور پاسپورٹ کی ضرورت ہو، یہ سب کچھ اگر غور سے دیکھا جائے تو محض آزاد کشمیر کی اصل صلاحیت کو ختم کرنے کے اقدامات ہیں، مختصراً یہ ہے اصل صورت حال۔ یعنی یہ علاقہ کوئی محض کئی مربع میل کی ایک جغرافیائی اکائی یا ملبہ نہیں ہے بلکہ اس کی کچھ دوسری کیفیات ہیں جو اس کی حیثیت کا تعین کرتی ہیں۔

دوسری طرف ہماری سیاسی مجبوری یہ ہے کہ ہمارے نزدیک چونکہ مقبوضہ کشمیر متنازعہ ہے اس لیے باوجود یہ کہ آزاد کشمیر کو بھی متنازعہ صورت میں ہی رکھا ہوا ہے۔ اس کو متنازعہ نہ رکھیں تو بقیہ کشمیر کا تنازعہ اگر ختم نہ ہو تب بھی اس کی نوعیت تو بہر صورت بنیادی طور پر بدل جاتی ہے، اس لیے آزاد کشمیر کو بھی متنازعہ ہی رکھنا پڑتا ہے۔

بعض دوست کہتے ہیں کہ اس کو صوبہ بنا دو، بعض کہتے ہیں سر دست اس کا ہی الحاق کر دو، بعض اس کو ایک علیحدہ مملکت بنانے کی بات کرتے ہیں۔ اور اگر ان سب باتوں کو جو اگرچہ مایوسی، ذمہ داری سے فرار اور کسی سیاسی غرض کی غمازی کرتی ہیں بالکل معصومیت پر ہی محمول کیا جائے، تب بھی بات وہی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا مطلب کسی نہ کسی درجے میں

بالکل ایک ہی ہے یعنی پھر یہ معاملہ متنازعہ نہیں رہتا کیونکہ آزاد کشمیر کی موجودہ حالت میں کوئی تبدیلی پوری تحریک پر اور اس مسئلہ کی پوری حیثیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ نتیجہ میں یہ بات محض اس لیے بھی ہمارے خلاف جائے گی کہ ہم کمزور فریق ہیں، اور تھوڑے حصے والے ہیں۔ ہمارا فیصلہ ہمارے لیے ہی ہو گا دوسرے فریق پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔ تو گویا ہم اس طرح دوسرے فریق کے قبضہ میں جو ہمارا حق ہے اس سے عملاً دستبردار ہو جائیں گے اور یہی دوسرے فریق کی دلی آرزو بھی ہے۔

اس مختصر تجزیئے سے کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جائے گا کہ آزاد کشمیر کی موجودہ حیثیت جس طرح ہے وہ کیوں ہے۔ اس کے ایک جملے میں مطلب یہ ہے کہ آزاد کشمیر کی حیثیت کشمیر کے تصفیہ تک وہی رہنا چاہیئے جو تقسیم ہند کے وقت تھی۔ یعنی کشمیر کا الحاق پاکستان و بھارت میں سے کسی کے ساتھ ابھی نہ ہوا تھا اور یہ کہ اصولاً جب انگریز کی عملداری اس سیاست پر سے ختم ہوگئی تو پھر یہ ریاست کے لوگوں پر منحصر ہے کہ وہ کس کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ دراصل یہ فکر بھی انگریز کی پیدا کردہ ہے اور اس سازش کا نتیجہ ہے جو پاکستان کو ختم کرنے کیلئے ہندو قیادت اور انگریز کے مابین تیار کی گئی تھی، ورنہ انگریز کے جانے کے بعد ریاست جموں و کشمیر خود بخود ان جغرافیائی حدود کا حصہ بن جاتی ہے جس کا حصہ وہ ہمیشہ سے رہی ہے۔ کوئی تنازعہ باقی نہیں رہنا چاہیئے تھا۔

اگرچہ کشمیر جغرافیائی، مذہبی، تمدنی، اقتصادی اور دفاعی لحاظ سے پاکستان کا حصہ ہے لیکن اگر دعویٰ اس طرح سے کیا جائے کہ چونکہ ریاست جموں وکشمیر طبعی طور پر پاکستان کا حصہ ہے تو پھر اس پورے قضیئے کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے، پھر جس طرح بھارت کہتا ہے وہی بات ہو جاتی ہے کہ یہ معاملہ دو ملکوں کے درمیان ایک سرحدی تنازعہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے سرحدی تنازعوں کے بارے میں دوسرے ممالک کوئی دخل نہیں دیتے۔ اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ ہماری حیثیت 1947ء والے مقام پر ہی رہے یا یہ کہ دسمبر 1948ء والے

مقام پر رہے، جہاں ریاست کے لوگ پاکستانی حکومت کی خواہش کے علی الرغم آزادی اور الحاق کے لیے مسلح جدوجہد کر رہے تھے، اسی تحریک کو ہم نے مکمل کرنا ہے، کوئی نئ تحریک چل سکتی ہے نہ اس کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اس میں کوئی تبدیلی کریں تو پھر ہم واپس اس مقام پر نہیں جا سکتے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اس مقام تک جانے میں بھی بعض رکاوٹیں ایسی ہیں جو بآسانی دور کی جا سکتی ہیں لیکن اگر کوئی نئ صورت ہم پیدا کریں تو یہ بالکل اندھے کنویں کی تاریکی میں آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگانے والی بات ہو گی۔ شاید ہمارا دشمن بھی یہی کچھ چاہتا ہو۔

صوبہ بنانے کا منصوبہ:

ضمناً ایک دلچسپ بات یاد آ گئی۔ بھٹو صاحب نے جب اپنے دور کے دوران آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کی طرف اشارہ کیا تو ہمارے لیے بے حد پریشانی ہوگئی۔ اس ضمن میں ان کے اور ہمارے مابین کیا گزری اس کا ذکر بھی کسی دوسری فرصت پر اُٹھا رکھتے ہیں۔ صرف ایک بات یہاں برمحل ہو گی، میرپور میں گاڑی میں بیٹھے ہوئے میں نے ان کے بیان کے بارے میں بھارتی ریڈیو کے تبصرے کا ذکر کیا۔ انھوں نے پوچھا ''وہ کیا کہتے ہیں''۔ میں نے کہا ''وہ کہہ رہے ہیں کہ بھٹو کون ہوتا ہے جو ہمارے علاقہ کو پاکستان کا صوبہ بنا دے''۔ بھٹو صاحب نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میری بات کا مطلوبہ اثر ہو گیا ہے۔ میں نے جلدی سے کہا ''آپ جانتے ہیں کہ وہ کیوں ایسا کہہ رہے ہیں'' انھوں نے پوچھا ''کیوں کہہ رہے ہیں'' میں نے کہا ''وہ آپ کی طبیعت کو جانتے ہیں، ایک طرف یہ مسئلہ ہمیشہ کیلئے ان کے حق میں طے ہو جائے گا دوسری طرف وہ آپ کے سر پر ہمیشہ کیلئے تلوار لٹکائے رکھیں گے''۔ کہنے لگے ''اچھا! وہ یہ چاہتے ہیں؟'' اس موضوع پر پھر لاڑکانہ میں ان کے ساتھ پوری شرح و بسط کے ساتھ گفتگو ہوئی اور پھر جو ہوا سو ہوا۔

بات چونکہ بے حد پیچیدہ ہے۔ اس لیے میں پھر ایک بار اس کو دہراتا ہوں۔ موجودہ

حالت میں جو بھی تبدیلی ہو گی خواہ وہ کیسی ہی بظاہر عمدہ کیوں نہ ہو، اس سے پاکستان کی ذمہ داری میں جس قدر اضافہ ہو گا بھارت کے ہاتھ بھی اتنے ہی مضبوط ہوں گے کیونکہ کشمیری جو قضیئے کے اصل فریق ہیں ان کی حیثیت کمزور ہو گئی تو پھر یہ قصہ کشمیریوں کی آزادی اور حق خودارادیت کا نہیں رہے گا بلکہ دوملکوں کے درمیان ایک سرحدی تنازعہ بنتا جائے گا اور یہی ہے وہ امر مطلوب جو بھارت کی دلی خواہش ہے۔ چنانچہ دیکھئیے کہ کس طرح تاشقند اور شملہ میں بالکل یہی راستہ اختیار کیا گیا۔

اس موقع پر بعض دوست یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ آزاد کشمیر کو ایک علیحدہ خودمختار ملک تسلیم کروایا جائے۔محض خیالی پلاؤ کی اور بات ہے لیکن اگر اس تبدیلی کے عملی پہلوؤں پر غور کیا جائے تو ادنیٰ سا بھی شک نہیں رہتا کہ اس مشق میں بھی پاکستان پر انحصار بڑھ جاتا ہے اور ہم اپنی پہلی پوزیشن سے بہت دور پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اس موضوع پر بھی تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت ہے اور ان شاء اللہ کسی دوسرے موقع پر کوشش کریں گے۔

اس تفصیل کا ایک مطلب یہ بنتا ہے کہ آزاد کشمیر کی موجودہ حالت میں کوئی تبدیلی بھی تحریک آزادی کیلئے مفید تو کیا بلکہ ہر لحاظ سے مضر ثابت ہو گی۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہو گا کہ یہ تعلقات کچھ تو قاعدہ اور ضابطہ کے مطابق ہوں گے اور کچھ محض باہمی افہام وتفہیم اور قیاس وتجربہ کی بناء پر وقتاً فوقتاً طے ہوتے رہیں گے۔

باہمی مشورے کی ضرورت:

چاہیئے تو یہ تھا کہ حکومت پاکستان اور کشمیر کے سیاسی زعماء کے مابین ضرورت پڑنے پر باہمی مشاورت ہوتی رہتی تاکہ یک طرفہ کارروائیوں کے نتیجے میں جو غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا ہو گئی ہیں اور جن سے بالآخر قومی مفادات متاثر ہوتے ہیں، ان کا بروقت ازالہ کیا جاتا رہتا۔ اس تمام قضیئے میں ایک خرابی ان تعلقات کی یہ طے شدہ اور غیر طے شدہ حالت ہے تو

دوسری خرابی یہ ہے کہ حکومت پاکستان چونکہ طاقتور فریق ہے اور اس کی بعض اصل اور مصنوعی ذمہ داریاں ہیں، اس کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ کبھی بھی کشمیری زعماء سے رو برو بات نہ کرے، حالانکہ سب کشمیری زعماء ایسے نہیں ہیں جو پاکستان کے مفادات کی قیمت پر کچھ حاصل کرنا چاہیں۔ اس بات سے ہی نہ صرف بعض شکوک وشبہات اور بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں اور بڑھتے بڑھتے سنگین صورت اختیار کر لیتی ہیں، بلکہ وہ خلیج بڑھتی چلی جاتی ہے اور بعض بدنیت لوگ اس سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ اس کے دوسرے برے نتائج کے علاوہ ایک تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ حکومت پاکستان نے کشمیر کے بارے میں جو چند بار کوششیں کیں اور ناکامی اور پھر ناکامی کے ردعمل میں جو کچھ ہوا اس کا ایک بڑا سبب حکومت اور سیاست دانوں کے مابین وہی بدگمانیاں اور شکوک ہی تھے۔ ان ناکامیوں سے جو مایوسی پیدا ہوئی اس کا اثر اپنی جگہ ایک المیہ سے کم نہیں ہے۔

میں پورے اعتماد کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر حکومت اور سیاستدانوں کے مابین اعتماد ہوتا تو کشمیر کی آزادی کے لئے نتیجہ خیز اقدام سے قطع نظر بھی دوسرے بے شمار قومی مفادات ہیں جن کا تحفظ ہوسکتا تھا، اور وہ ہونا بھی ضروری تھا۔ یہ جو غیر طے شدہ رشتہ داری ہے یہ تو کسی بھی قاعدہ کے مطابق باہمی میل ملاپ اور افہام وتفہیم کے بغیر اچھی حالت پر نہیں رہ سکتی۔ جب یہ بھی معلوم ہوا کہ اس تعلق کو اس غیر طے شدہ حالت میں رکھنا ہی ضروری ہے تو پھر اس کو درست رکھنے کے لئے بعض معمولی سے اقدامات نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ جو غیر ضروری مداخلت ہوتی رہی ہے اس کا بڑا سبب بھی ایک دوسرے سے دوری اور شکوک ہیں ورنہ آج ایسی یک جہتی اور ہمدردی کی فضاء ہوتی کہ حکومت کو کسی معاملہ میں بھی غیر ضروری مداخلت کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

بہر حال آزاد کشمیر کے اس غیر طے شدہ کردار کو قائم رکھنا ہوگا تاوقتیکہ مسئلہ کشمیر طے نہیں ہو جاتا۔ اس حیثیت کی اپنی کچھ دوسری مشکلات بھی ہیں، اس لیے کہ جب طے شدہ

علاقوں میں منفی تحریکیں چل پڑی ہیں تو غیر طے شدہ علاقوں کی بات ہی کیا ہے۔ ایسے میں تو صرف ایک ہی علاج ہے کہ آزاد کشمیر کے عوام کے اندر خود وہ تحریک طاقتور ہو جو کشمیر کی آزادی اور الحاق کی صلاحیت رکھتی ہو۔ یہی نہیں بلکہ حکومت پاکستان کی ہر قسم کی وابستگی بھی اس تحریک کے ساتھ ہونی چاہیئے، مگر یہ وابستگی ایسی نوعیت کی ہو کہ مقصد بھی پورا ہو جائے اور اس پر بھارت کی گرفت بھی نہ ہو سکے۔ اس کیلئے ایک سوچے سمجھے سائنٹیفک اور بامقصد منصوبے پر مرحلہ وار عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلے تو اس گرفت سے آزاد ہونے کے اقدامات کرنا ہوں گے جو بھارت کی طرف سے بلا جواز پاکستان پر عائد کر دی گئی اور اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا اصل سبب تو ہماری طرف سے فکری پسپائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ نصف صدی پر پھیلی ہوئی اس مشق کا بغور مطالعہ کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھارت کے پھیلائے ہوئے جال میں مسلسل پھنستے چلے گئے ہیں۔حتیٰ کہ اس کے نزدیک ہمیں اب اپنا دفاع کرنے کا بھی حق نہیں ہے اور تو اور اب بھارتی حکومت اس حد تک حقائق کا مذاق اُڑا رہی ہے کہ انھوں نے غیر ملکی سیاحوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ شمالی علاقوں کی چوٹیوں پر جانے کیلئے بھارت سے اجازت نامہ حاصل کریں۔

بھارت کی خواہش اب یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ ہمارے خلاف جو کچھ بھی کرے اسے درست مان لیا جائے اور جوابی کارروائی کو جرم قرار دیا جائے۔معلوم نہیں کہ یہ کیا منطق ہے۔

حکومت سازی اور اس کے تقاضے:

اس کے ساتھ پھر دوسرا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزاد کشمیر میں حکومت سازی کس طرح ہو اور طرز حکومت کیا ہونا چاہیئے۔ یہ موضوع بھی اس قابل ہے کہ اس کو پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جائے لیکن اختصار کیساتھ مگر ضروری حد تک بعض باتوں کا ذکر کرتا ہوں۔ اس میں دو بنیادی امور ہیں، ایک تو یہ کہ تحریک جاری رہے اور آزاد علاقہ کا نظام و انصرام درست رہے۔ دوسرا یہ کہ محض یہی علاقہ ہے جس پر اکتفا کر لیا گیا ہے اور اسی کا انتظام

کرنا مقصود ہے۔ یہ امور اگر سامنے ہوں تو حکومت سازی کی مشق اور طرز حکومت کا تعین کرنے میں دقت نہیں ہو گی۔ ان دونوں حالتوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اگر تحریک کو جاری سمجھا جائے تو حکومت تحریک کے ماتحت ہو گی۔ یہ کچھ زیادہ وضاحت طلب نہیں ہے کہ جب حکومت تحریک کے ماتحت ہوتی ہے تو کیا صورت ہوتی ہے، اور جب تحریک حکومت کے ماتحت ہو جائے تو کیا معنی ہوں گے۔

ہمارے ہاں حکومت سازی جب شروع ہوئی تو وہ ایک ضرورت تھی لیکن تحریک کے ماتحت تھی، چنانچہ پہلی حکومت کے بارے میں یہ طے پایا تھا کہ وہ مسلم کانفرنس کی عاملہ کے سامنے جوابدہ ہو گی۔ اس فیصلہ کے محرکات کیا تھے اور اس فیصلہ کا حشر کیا ہوا، وہ اپنی جگہ، لیکن اگر تحریک کو جاری رکھا جانا مقصود تھا تو صحیح صورت وہی تھی۔ پھر اس میں تبدیلی پیدا کی گئی اور حکومت پاکستان کو بھی ایک فریق بنا لیا گیا، یہ اقدام بھی گویا بھارت کی خواہش کے عین مطابق تھا، مطلب یہ کہ بھارت کیلئے ممکن نہیں تھا کہ وہ مجاہدین کے نمائندوں کے ساتھ بات کرے۔ اس کی خواہش تو یہ ثابت کرنے کی تھی کہ مجاہدین درحقیقت تھے ہی نہیں وہ سب حکومت پاکستان نے کروایا تھا اور وہی اس کی اصل ذمہ دار ہے۔ اس ایک تیر سے کئی شکار کرنے مقصود تھے، جن کا بندوبست بہر حال ہم نے خود ہی کر دیا۔

اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوا، اور بی ڈی نظام کے ذریعہ حکومت سازی کی گئی۔ پھر تیسرے دور میں براہِ راست صدارتی انتخاب ہوا اور چوتھے دور میں پارلیمانی طرز حکومت کو نافذ کیا گیا، جو اب تک اصولاً قائم ہے۔

دیکھیئے کہ اس حکومت سازی کی مشق کا تحریک پر کیا اثر پڑا اور کوئی تحریک اس طرح بننے والی حکومتوں کے ماتحت آ جائے اس بے چاری کا کیا حشر ہوتا ہے۔ اس کا اصل سبب معلوم کرنا قدرے مشکل ہے۔ کوئی ایک سبب بھی تو نہیں ہے کہ اس کو دریافت کیا جائے، اس میں غیروں کے علاوہ اپنوں کی نااہلی اور ریشہ دانیوں کی لمبی داستان ہو گی اور نہ معلوم کن کن

پردہ نشینوں کے نام آئیں گے۔ اس کو اب کریدنے کا فائدہ بھی کیا ہے خدا کرے کہ اب بھی ارباب اختیار اور دوسرے متعلقہ حضرات کی سمجھ میں بات آ جائے۔

بعض لوگ چاہتے بھی ہوں گے کہ اپنے خیال کے برعکس کشمیر کی آزادی کی بات بہر صورت کریں۔ اس لیے آزاد کشمیر کا نظام حکومت بھی بلاشبہ تحریک آزادی کشمیر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے اس کے لیے اگرچہ اب ہم پیچھے تو نہیں جا سکتے کیونکہ پانی بہت بہہ گیا ہے، مگر اب بھی اپنے رُخ کو سیدھا کر لیں تو معاملہ درست ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک تو کشمیر کی آزادی و الحاق کی تحریک صرف مسلم کانفرنس ہے۔ مگر اب اس کو اسی میدان میں یعنی حکومت سازی کے مروجہ طریقہ کار میں اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔ تاہم آزاد کشمیر کے اپنے مزاج، تحریک کے مزاج اور خود اسلام کے مزاج کے زیادہ قریب صدارتی طرز حکومت ہے، پارلیمانی نہیں ہے بلکہ تحریک آزادی میں پاکستان بھر میں پھیلے ہوئے مہاجرین کی قلبی اور عملی شرکت بھی صدارتی نظام کے ذریعہ زیادہ ہی قرین امکان ہے اور یہ دونوں اجزاء ایسے ہیں جن کو اس تحریک میں اکٹھا ہونا چاہیئے۔ پارلیمانی نظام میں ان کا تعلق بالواسطہ ہو جاتا ہے جب کہ ضرورت بالواسطہ تعلق کی ہے، میرا تو خیال ہے کہ مہاجرین مقیم پاکستان کی آباد کاری میں بھی حکومت آزاد کشمیر کی ذمہ داری بوجوہ برابر کی ہونی چاہیئے تھی۔ تحریک کو زندہ اور متحرک رکھنے میں بھی صدارتی نظام ہی بے حد مفید ثابت ہو گا، براہِ راست انتخابات کے ذریعہ منتخب ہونے والا صدر، تحریک آزادی کشمیر کے مسلمہ قائدین اور ترجمان کی حیثیت سے اپنا کردار بہتر طریقے سے ادا کر سکتا ہے۔

اسی طرح شمالی علاقہ جات ہیں۔ اگرچہ بعض دور رس سیاسی اور دفاعی ضروریات کے پیشِ نظر مرکزی حکومت براہِ راست اس علاقہ کا نظام سنبھالے ہوئے ہے، لیکن تحریک کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو بھی آزاد کشمیر کے نظام میں شامل کیا جائے۔ ویسے بھی وہ علاقہ اپنی خصوصیت کے اعتبار سے ایسا ہے جہاں بہت بنیادی اصلاحات کی اشد ضرورت ہے۔

آزاد حکومت اور تحریک آزادی کو یکجا کرنے کا اب صرف یہی طریقہ رہ جاتا ہے کہ آزاد علاقے میں مسلم کانفرنس کی حکومت ہو، کیونکہ بلاشبہ اکثریتی جماعت بھی وہی ہے اور اصل تحریک بھی وہی۔ اس کو اس کے تاریخی کردار سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور اگر مرکزی حکومتیں کسی نہ کسی وجہ سے مسلم کانفرنس کو کمزور کرنے پر نہ لگی رہتیں تو خدا کے فضل وکرم سے آج کسی انتخاب وغیرہ کی خاص ضرورت ہی نہ ہوتی۔ فلسطینیوں کو اگر آج کوئی خطہ زمین مل جائے تو کیا وہ بھی انتخابات اور صدارتی پارلیمانی نظام کے بکھیڑوں میں پڑیں گے یا اس حکومت کو تحریک کے ماتحت ایک ادارے کی حیثیت سے ہی قائم رکھیں گے۔ اس کا جواب مشکل نہیں ہے۔

یہ جو میں کہتا ہوں کہ اصل میں مسلم کانفرنس ہی تحریک آزادی ہے تو اس میں نہ تو مبالغہ ہے نہ یہ محض اپنے مطلب کی بات ہے۔ بلکہ ایک وقت ایسا تھا کہ مسلم کانفرنس کے مرکزی نظام کی تبدیلی پر بھی بھارت کو سنجیدگی سے غور کرنا پڑتا تھا کہ اس کا کیا مقصد ہے اور اس کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جب پہلی بار مجھے مسلم کانفرنس کا صدر بنایا گیا تو بھارت کے ایک مشہور انگریزی اخبار نے جو سرکار کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ ایڈیٹوریل لکھا، جس کا عنوان تھا SINISTER MOVE (خطرناک تحریک) اس میں اس نے میرے صدر ہونے کو خطرے کا الارم قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ شخص اس لیے مسلم کانفرنس کا صدر بنایا گیا ہے کہ پاکستان کی نیت کشمیر کے بارے میں خراب ہو رہی ہے اور وہ کچھ کارروائیاں کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے میری صدارت کو بھی حکومت کی طرف منسوب کیا تھا۔ اسی طرح جب 1956ء میں صدر حکومت بنا تو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم نے جو اس وقت کمانڈر انچیف تھے، مجھے بتایا تھا کہ صرف میرے صدر ہونے سے ہی کشمیر میں بھارت کے اخراجات میں کروڑوں روپے کا اضافہ ہوا ہے۔ بھارت کی حکومت بھی اگر کسی کو تحریک آزادی سمجھتی ہے اور اس سے چوکس ہے تو وہ صرف مسلم کانفرنس ہے۔ 1958ء کی ہماری ''کے۔ایل۔ایم'' کے بارے میں بھارت کے وزیرِاعظم جواہر لال نہرو نے ہمارے ڈپٹی اسپیکر مسٹر گینز کو دہلی میں بتایا تھا کہ اس کو کشمیر

پر جتنی پریشانی اس تحریک سے ہوئی تھی وہ اتنے سالوں میں کسی دوسری بات سے نہیں ہوئی۔ پھر اس نے کہا مگر بھلا ہو سکندر مرزا کا انھوں نے اس تحریک کو ختم کر دیا۔

اسی طرح یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ 1970ء کے صدارتی انتخابات کے دوران لبریشن لیگ کی طرف سے بعض مقامات پر ایک اشتہار لگایا گیا تھا جس میں لکھا تھا کہ ''لبریشن لیگ کا ساتھ دو''۔ لیکن جلد ہی اس کے دوسرے مضمرات کے احساس کی وجہ سے اس پوسٹر کو اتار دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ جو ووٹ لبریشن لیگ کو ملے تھے سرینگر ریڈیو کئی ہفتوں بعد تک کہتا رہا کہ یہ ووٹ پاکستان کے خلاف پڑے ہیں۔ یہی بات انتخابی مہم کے دوران میں نے بھی کئی جگہ کہی تھی، مگر اس وقت لوگوں کا خیال یہ ہوگا کہ شاید میں محض کسی مخالفت کی وجہ سے ایسا کہہ رہا ہوں۔ بات یہ نہیں تھی کہ لبریشن لیگ میں پاکستان کے مخالف لوگ تھے بلکہ اس جماعت کا نظریہ ایسا ہے کہ اگر اس بارے میں کوئی ایسی تاویل کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اس جماعت میں بہت کم ایسے ہوں گے جن کو سرے سے اس نظریئے کا کوئی بھی علم ہے اور اس پر یقین رکھتے ہیں، مگر اس جماعت کیساتھ وابستگی کو بہر حال ان معنوں میں استعمال تو کیا گیا۔ لیکن یہ کیفیت مسلم کانفرنس کے بارے میں کسی صورت نہیں ہو سکتی۔ مرکزی حکومت کیساتھ ہمارے اختلافات کی شدت کتنی سنگین رہی ہے مگر دشمن کو یہ احساس کبھی نہیں ہوا نہ اسے کہنے کا موقع ملا کہ یہ لوگ خدانخواستہ پاکستان کے مخالف ہو گئے ہیں۔ ایسی پوزیشن ہی کیوں اختیار کی جائے جس میں شک و شبہ ہو، شرعاً بھی اس سے اعتراز کرنا ہی مناسب سمجھا گیا ہے۔ یہ بات جہاں مسلم کانفرنسیوں کیلئے باعثِ فخر اور ان کا طرہِ امتیاز ہے وہاں مصیبتوں کا باعث بھی یہی ہے۔ یہ وہ حسن دلفریب ہے جو پسندیدگی کی دعوت تو بہر حال دیتا ہے مگر دشمنی بھی ساتھ ہی لاتا ہے۔ مسلم کانفرنس کی اس خوبی کو کمزور کرنے کیلئے کیا کچھ نہیں ہوا، اپنے اور بیگانے سب ہی اس حمام میں ننگے ہیں، لیکن یہ بھی یاد رہے کہ یہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی۔ باقی سب مشکوک ہے، سراب ہے اور فریب نظر ہے۔

ایک اور وضاحت طلب امر باقی رہتا ہے جس پر اکثر و بیشتر لوگ الجھتے رہتے ہیں کہ مسلم کانفرنس بحیثیت جماعت، کشمیر کی آزادی کیلئے عملاً کیا کر رہی ہے۔ کئی باتیں تو اگرچہ اس مقالے سے سمجھ میں آ سکتی ہیں لیکن اس پر بھی جب تک تفصیلی گفتگو نہ ہو یہ بات کماحقہ سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ جس طرح کشمیر کی آزادی کی تحریک کا دائرہ کار اب 1947ء کے مقابلے میں بدر جہا زیادہ وسیع ہو گیا ہے اور ایک کے بجائے اس کے کئی محاذ کھل گئے ہیں، اسی طرح مسلم کانفرنس کی کارروائیوں کا دائرہ کار بھی اسی نسبت سے وسیع ہوا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس پر علیحدہ مقالے کی صورت میں بحث کروں تا کہ جماعت کے کارکنوں، ہمدردوں اور مخالفوں سب ہی کو صحیح بات کا علم ہو جائے۔ سردست اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔